متاعِ فکر و نظر

(معاصر علمی و ادبی کتب میزانِ انتقاد میں)

سیّد منصور عاقل

پروفیسر سحر انصاری

سید منصور عاقل ایک شاعر، نقاد، محقق، مترجم اور مدیر کی حیثیت سے پوری اردو دنیا میں معروف ہیں۔ اپنے ادبی سفر کے دوران اُنہیں اپنے ملک اور بیرون ملک جو پذیرائی حاصل ہوئی ہے وہ قابلِ رشک ہے۔
سید منصور عاقل جس موضوع پر بھی لکھتے ہیں اس کے تمام اہم گوشوں کو نگاہ میں رکھتے ہیں۔ ان کے موقف اور دلائل دلنواز ہوتے ہیں۔ اسلوب تحریر میں سنجیدگی اور وسیع مطالعہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ فلسفہ، ادب، مذہب اور تاریخ پر اُن کی خصوصی نظر ہے۔ اس لیے ان کی تحریروں میں اِن تمام علوم کا عکس بھی نظر آتا ہے۔ سید منصور عاقل کی نثر پُر وقار اور دانش آموز ہوتی ہے۔ وہ ہر موضوع پر سیر حاصل بحث کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں ادق یا گنجلک نہیں ہوتیں۔ الفاظ وتراکیب کا برمحل استعمال اُن کی تحریروں کو لائق مطالعہ بنا دیتا ہے۔ اور اچھی نثر کی خوبی

متاعِ فکر و نظر

(معاصر علمی و ادبی کتب میزانِ انتقاد میں)

سیّد منصور عاقل

نام کتاب	متاعِ فکر ونظر
موضوع	ادبی تنقید
مصنف	سید منصور عاقل
سالِ اشاعت	۲۰۱۴ء
مطبع	فیض الاسلام پرنٹنگ پریس۔ راولپنڈی
ناشر	مکتبہ الاقرباء فاؤنڈیشن۔ اسلام آباد
کمپوزنگ	محمد انور چوہدری
سرِ ورق	ظفر محمود
قیمت	۶۰۰ روپے

رابطہ

مکتبہ الاقرباء فاؤنڈیشن

۱۰۲۔ سٹریٹ ۱۱۰ سیکٹر جی۔۳/۱۱ اسلام آباد

ٹیلی فون ۲۲۲۱۶۷۰ (۰۵۱)

سیل ۰۳۰۰۔۵۱۔۱۴۵

انتساب

متاعِ فکر و نظر ہی تو ہے مری میراث
ترا کرم کہ کیا تو نے سرفراز مجھے



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مندرجات

حصہ اوّل ۔۔۔ نقد و نظر

حصّہ دوم ۔۔۔ تقاریظ

پروفیسر سحر انصاری

گزارشِ احوالِ واقعی

سیّد منصور عاقل ایک شاعر، نقاد، محقق، مترجم اور مدیر کی حیثیت سے پوری اردو دنیا میں معروف ہیں اپنے ادبی سفر کے دوران انہیں اپنے ملک اور بیرون ملک جو پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ وہ قابل رشک ہے۔ اس پس منظر کے ساتھ انہیں اس کی چنداں ضرورت نہیں کہ ان کے ادبی کارناموں اور علمی و تہذیبی کاوشوں کو از سرِ نو سراہا جائے۔ یہ ان کی محبت اور دوست نوازی ہے کہ اپنے تبصروں کی کتاب پر مجھ سے کچھ لکھوانا چاہتے ہیں۔

سیّد منصور عاقل سے میری شناسائی خاصی پرانی ہے جب وہ اپنے سرکاری عہدے کے سلسلے میں کراچی میں مقیم تھے تو ادبی محفلوں میں بالخصوص ماہنامہ ''افکار'' کے مدیر صہبا لکھنوی کے دفتر میں ملاقاتیں ہو جاتی تھیں پھر ان کی کتابوں سے گاہے گاہے استفادے کا موقع ملتا رہا۔ سہ ماہی ''الاقربا'' کے بعد تو قربت قریبہ کا احساس اور فزوں ہو گیا۔ سیّد منصور عاقل بڑی توجہ، محنت اور معیار کے ساتھ ''الاقربا'' کے ذریعے ادب، زبان اور تہذیب کی خدمت کر رہے ہیں۔

سیّد منصور عاقل کا آبائی تعلق بلند شہر کے قصبے گلاوٹھی سے ہے۔ یہ خطہ مردم خیز واقع ہوا ہے۔ اس کے ایک بزرگ امیر حسن گلاوٹھوی سے میری نیاز مندی رہی ہے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہاں کی تہذیب کس قدر منفرد رہی ہوگی۔ امیر حسن کے بارے میں مشہور تھا کہ ان کا سلسلہ تلمّذ داغ دہلوی سے ملتا تھا۔ انہوں نے ایک ''بزم خیال'' بنائی تھی جس کے تحت عمرہ مشاعرے ہوتے تھے۔ سالانہ مشاعرے میں جگر مراد آبادی کا روش صدیقی، ماہر القادری، تابش دہلوی، سحاب، قزلباش، زہرا نگا اور اس زمانے کے ممتاز شعرا اور شاعرات شریک ہوتے تھے۔ ان بزرگ کے بعد گلاوٹھی کی دوسری اہم شخصیت جن سے میں متعارف ہوا سیّد منصور عاقل ہیں۔ اپنے اخلاق، علمیت اور تخلیقی و تنقیدی تحریروں کے ذریعے انہوں نے ایک ایسا مقام حاصل کر لیا ہے جو کہ کم افراد کے حصے میں آتا ہے۔

وہ اردو اور انگریزی زبان میں مسلسل لکھ رہے ہیں۔ ان کی کتابوں کی تعداد دو درجن، کے قریب ہے۔

مجھے ذاتی طور پر سیّد منصور عاقل کی شاعری کے علاوہ ان کی نثر سے خاص دلچسپی رہی ہے۔ میں ''الاقربا'' میں ان کے اداریے اور تنقید تبصرے بہت توجہ سے پڑھتا ہوں۔ ان کے دیگر قارئین کی طرح میری بھی خواہش تھی کہ سیّد منصور عاقل کی نثری تحریریں کتابی صحت میں شائع ہوں۔ مقام مسرت ہے کہ ان کے اداریوں کی ایک کتاب ''حرفِ معتبر'' ۲۰۱۳ء میں شائع ہو چکی ہے۔ حرفِ معتبر ۲۰۰۱ء تا ۲۰۱۳ء سہ ماہی الاقربا میں مطبوا اداریوں کا مجموعہ ہے۔ ایک ایسے دور میں جب بیشتر رسائل و جرائد میں اداریئے سرے سے ہوتے ہی نہیں اور اگر ہوتے ہیں تو مختصر اور ان میں بھی زیادہ تر ان کی مالی پریشانی اور ادبی کساد بازاری کا تذکرہ ہوتا ہے۔ سیّد منصور عاقل نے اداریہ نویسی کا ایک نیا انداز وضع کیا ہے۔ جس کی جتنی بھی ستائش کی جائے کم ہے۔

سید منصور عاقل جس موضوع پر بھی لکھتے ہیں اس کے تمام اہم گوشوں کو نگاہ میں رکھتے ہین۔ ان کے موقف اور دلائل دل نشیں ہوتے ہیں۔ اسلوبِ تحریر میں سنجیدگی اور وسیع مطالعے کی جھلک نظر آتی ہے۔ فلسفہ، ادب، مذہب اور تاریخ پر اُن کی کوصی نظر ہے اس لیے ان کی تحریروں میں ان تمام علوم کا عکس بھی نظر آتا ہے۔ سید منصور عاقل کی نثر پُر وقار اور دانش آموز ہوتی ہے وہ ہر موضوع پر سیر حاسل بحث کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں اوقِ یا گنجلک نہیں ہوتیں۔ الفاظ و تراکیب کا برمحل استعمال ان کی تحریروں کو لائق مطالعہ Readable بنا دیتا ہے۔ اوا چھی نثر کی کوبی یہی ہے کہ سب سے پہلے اس کا اسلوب ایسا ہو کہ قاری کا ذہن مصنف کے ذہن و فکر کا اہم سفر بنتا جائے اور اس میں کوئی الجھن پیدا نہ ہو۔ سید منصور عاقل کی نثر میں یہ وصف بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔

اب اُن کی تنقید و تبصرے کی کتاب ''نقد و نظر'' کے عنوان سے منصۂ شہود پر آ رہی ہے۔ اچھی خاصی ضخیم کتاب ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ ایک میں کتابوں پر تنقید اور تبصرہ ہے اور دوسرا تقاریظ پر مشتمل ہے۔

ہمارے یہاں عام طور پر تقریظ، تعارف، تبصرہ، تاثرات سب کو تنقید ہی کے ذیل میں شمار کر لیا جتا ہے۔ حال آں کہ ان میں خاصا فرق ہے۔ تنقید ان کے مقابلے میں مفصّل اور ایک خاص تنقیدی شعور کی حامل ہوتی ہے۔ جب کہ دیگر آراء مختصر اور صاحب کتاب اور کتاب کے تعارف و تبصرے پر مبنی ہوتی ہیں۔ تبصرہ نگاری کے لیے وسیع مطالعے اور خاص تنقیدی شعور کی ضرورت ہوتی ہے۔ وجہ اُس کی یہ ہے کہ مدیر کے پاس کسی ایک موضوع پر کتابیں تبصرے کے لیے نہیں آتیں۔ ان میں ادب، شاعری، تنقید، سیاست، مذہب، مقامی اور عالمی مسائل غرض متنوع موضوعات پر تصانیف شامل ہوتی ہیں۔ بعض مدیران کرام موضوع کی مناسبت سے تبصرے کی کتابیں دیگر اہل قلم کے سپرد بھی کر دیتے ہیں۔ اور ان کی تحریروں کو مجلّے کی زینت بنا دیتے ہیں۔ سیّد منصور عاقل کے مطالعے کی وسعت نے انہیں اس قسم کی تن آسانی سے باز رکھا ہے۔ ان کے تبصروں اور تنقید میں ہر موضوع میں ہر موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اور ایسے نتائج کا استباط کیا گیا ہے جو مثال اور دلیل کے طور پر یاد رکھے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر کلیم الدین احمد جیسے سخت گیر نقاد نے بابائے اردو مولوی عبدالحق کے لئے لکھا ہے کہ جب تک موضوع کے تمام گوشے اور زاویے ان کے سامنے نہ آجائیں وہ اس موضوع پر قلم نہیں اٹھائے۔ یہی انداز مجھے سیّد منصور عاقل کی تنقیدوں میں نظر آتا ہے۔ کچھ تبصرے طویل ہیں اور کچھ مختصر ظاہر ہے کہ کتاب کے موضوع اور اس کی اہمیت کا تقاضا ہوتا ہے کہ اس کے مطابق اس پر روشنی ڈالی جائے۔

عاقل صاحب کے تبصروں کی ایک خوبی یہ ہے کہ ان میں صرف ستائش اور تعریف ہی نہیں ہوئیل۔ اسی طرح ان کا انداز سر بری گزر جانے کا بھی نہیں ہوتا۔ ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تمام کتابوں کا بالاستیاب مطالعہ کرتے اور ان کے حسن وضع پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہیں۔ خیال چہ اپنے لئے بھی انہیں یہی انداز پسند ہے۔ خود مجھ سے انہوں نے کہا تھا کہ میں صرف تعریف نہیں چاہتا اگر کوئی کمی کوئی کوتاہی ہو تو اس کی طرف بھی اشارہ ہونا چاہیئے۔ یہ ان کی مصروفیت اور شکادہ دلی کی دلیل ہے۔

اس ضمن میں عرض کروں گا کہ ''خوگر'' ''مدح'' سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے۔ اور یہ گلہ محض ایک تجویز ہے۔ کتابوں پر تبصرہ اور تنقید کرتے ہوئے کسی کتاب کے ناشر کا پتا اس کی قیمت اور صفحات وغیرہ کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ سیّد منصور عاقل اس طرف بھی توجہ دیتے تو قارئین کو مزید فائدہ پہنچتا۔ تعارف و تبصرے کا مقصد عبادت ہوتا ہے کہ قاری کسی تصنیف کے محاسن و مسابک کے پیش نظر اس کا مطالعہ کرنا چاہے تو کتاب کے حصول کی نشاندہی بھی ضروری بنے۔

سیّد منصور عاقل کی اس کتاب میں ۹۷ تصانیف پر نقد و تبصرہ شامل ہے یہ کوئی کم اہم کام نہیں ان تبصروں کو جب مجموعی صورت میں زیر مطالعہ لایا جاتا ہے تو منصور عاقل صاحب کی تحریر اور ان کے ذوق علم و ادب کی کئی مبہمات اجاگر ہوتی ہیں۔ ان کتابوں میں تقریباً تمام علمی ادبی اور تاریخی موضوعات شامل ہیں اور منصور عاقل نے ہر موضوع کے ساتھ بھرپور انصاف کیا ہے۔ چوں کہ خود ان کی زندگی اپنے عہد کے ممتاز ادیبوں، ادبی تحریکوں اور ادبی نظریوں کے ماحول میں بسر ہوئی ہے اس لئے بعض تبصروں میں ذاتی حوالوں سے بھی دل چسپ حقائق بیان ہوئے ہیں۔ جن سے تحریر میں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ البتہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک عمدہ شاعر ہونے کی بنا پر شایعد منصور عاقل کو شاعری کی کتابوں سے زیادہ دلچسپی رہی ہے۔ میں نے شمار تو نہیں کیا لیکن شاید ان تبصروں میں شاعری کی کتابوں کی تعداد نسبتاً زیادہ نظر آتی ہے۔ یہ بھی ایک عمدہ اضافہ ہے۔ اس لیے کہ آج کل زبان و بیان، صرف و نحو اور املا و تلفظ کا جو حلیہ بگاڑا جا رہا ہے، ایسے ماحول میں کوئی جان یکار مبصّر کتابوں کے حُسن و قبح پر ذمے داری کے ساتھ تبصرہ کرے تو اسے ایک نیک فال ہی سمجھنا چاہیے۔

سیّد منصور عاقل کی ''نقد و نظر'' ہر لحاظ سے ایک مفید اور لائق مطالعہ کتاب ہے یہ ایک پورے عہد کا احاطہ کرتی ہے اور تنوع اور نگارنگی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ میں اس ضمن میں سیّد منصور عاقل کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

سید منصور عاقل

حرفِ تحدیث

میں اپنے پروردگار کے اس احسانِ کریمانہ کے لیے سراپا سپاس ہوں کہ مجھے طویل عہد ملازمت کے بعد ہر نوع کی خواہشاتِ منصب و جاہ اور ہوس زر سے مامون و محفوظ فرماتے ہوئے تحصیل و ترسیل علم کی توفیق ارزانی فرمائی۔ چنانچہ رواں صدی کے آغاز ہی سے میں نے خود کو ایک ایسے علمی و تحقیقی مجلّہ کی تدوین و اشاعت کی خدمت کارضاکارانہ فریضہ انجام دینے کے لئے وقف کردیا جو اردو زبان و ادب کے طلباء و اساتذہ اور محققین کو علمی معاونت فراہم کرسکے۔ سہ ماہی 'الاقرباء' نے چنانچہ گزشتہ تیرہ چودہ برسوں میں اس اختصاص کو قائم رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے کہ قارئین کو غیر مطبوعہ نگارشات کے ذریعہ تحقیقی مواد اور مستند مآخذ تک رسائی مہیا کی جائے۔ الحمدللہ کہ اندرون و بیرون ملک اہل علم و خبر اور معارف پرور ہستیوں کی جانب سے مسلسل تعاون نیز پاکستانی و عالمی جامعات میں روز افزوں پذیرائی کے سبب اس ہیچمداں کی مزید حوصلہ افزائی ہوئی۔ بالخصوص امریکہ۔ کینڈا۔ برطانیہ۔ جرمنی۔ فرانس۔ ترکی۔ بھارت۔ جاپان اور ماریشش وغیرہ سے گزشتہ برسوں میں جو ردِعمل ملتا رہا ہے اُس نے آتش شوق کو مزید مہمیز کیا۔ ہارورڈ یونیورسٹی (امریکہ) نے تو گزشتہ ایک دہائی سے بھی زیادہ مدت سے ریسرچ کی سطح کے طلباء و طالبات کے لیے الاقرباء کی نگارشات کو نصابی مشقوں میں شامل کیا ہوا ہے۔ واشنگٹن اسٹیٹ یونیورسٹی نے بھی 'الاقرباء' کے اداریوں پر مشتمل حالیہ مطبوعہ کتاب ''حرفِ معتبر'' کو زبردست پذیرائی سے نوازا ہے جس کا خود مجھے اُس وقت اندازہ ہوا جب امریکہ کے حالیہ قیام کے دوران اساتذہ و طلباء سے تبادلۂ خیال کا موقع ملا۔ میں سربراہ شعبۂ اردو پروفیسر ڈاکٹر جمیل احمد اور سینئر فیکلٹی رکن محترمہ پروفیسر ڈاکٹر مسز جینیفر کا ممنون ہوں کہ انھوں نے بے حد قدر افزائی فرمائی۔

زیرِنظر کتاب ''متاعِ فکر ونظر'' بھی ''حرفِ معتبر'' ہی کا معنوی تسلسل ہے جو مختلف علمی وادبی کتب نیز شعری مجموعوں پر ''نقد ونظر'' کے زیرِ عنوان سہ ماہی 'الاقرباءٗ' میں تنقیدی جائزوں کی شکل میں ۲۰۰۵ء سے ۲۰۱۳ء کی مدت کے دوران شائع ہوئے۔ میں چونکہ اظہارِ رائے کے سلسلہ میں معروضیت کا قائل ہوں اس لئے جب تک زیرِ تبصرہ تصنیف یا تالیف کا پوری طرح مطالعہ نہ کرلوں قلم اُٹھانے سے گریز کرتا ہوں اور بے جا تنقیص وتوصیف سے بھی پرہیز برتتا ہوں بلکہ میری کوشش ہوتی ہے کہ ہر دو صورتوں میں دلیل کے بغیر اظہارِ خیال نہ کیا جائے۔ معائب ومحاسنِ سخن کی نشاں دہی اس طرح کی جائے کہ جو نہ دل آزاری کا سبب بنے اور نہ مبالغہ وغلو کا مظہر۔

میں اپنے اِس منشورِ علمی پر کس حد تک کاربند رہا ہوں اس کا فیصلہ صرف صاحبِ بصیرت قارئین ہی فرما سکتے ہیں۔

برداشت (شعری مجموعہ)

سید مشکور حسین یاد

زیر نظر کتاب مشکور حسین یاد کی غزلیات کا تازہ مجموعہ ہے جو سال ۲۰۰۴ء کے دوران منصۂ شہود پر طلوع ہوا۔ تین سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہونے کے سبب ضخیم ہی نہیں وقیع بھی ہے کہ مصنف کا نصف صدی سے زیادہ مدت پر محیط تجربہ ومشاہدہ اور مطالعہ ومکاشفہ بین السطور ہی سے جلوہ بار ہے۔ دروں بینی و بیروں نگاہی کا یہ شاہکاران کے مخصوص جذبہ وشعور میں ڈھل کر قاری کو ان کی نت نئی فنکارانہ جہتوں سے متعارف کراتا ہے جیسا کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے کتاب کے فلیپ میں تحریر کیا ہے:

''اگر خیال تازہ کی لفظ تازہ میں ادائیگی مقصود ہے تو پھر غزل صحیح معنوں میں تنگنائے ثابت ہوتی ہے مگر مشکور حسین یاد نے تیشہ لفظ سے اس تنگنائے میں جادہ تراشی کی اور اپنی غزلوں کی صورت میں ضیافتِ قلب ونظر کا سامان بہم پہنچایا''

''تیشۂ لفظ سے جادہ تراشی'' کے ہنر میں یاد اپنے اس مجموعے میں نقطۂ عروج پر نظر آتے ہیں وہ دانش وشعور کے بغیر جذبہ واحساس کے عمل تربیت کا تصور بھی نہیں کرسکتے انہیں احساس ہے کہ انہوں نے جن ردیف وقوافی کو اپنے فن کی کسوٹی پر پرکھا ہے وہ بعض صورتوں میں نامانوس بھی ہیں اور مشکل بھی لیکن کسی بھی سنجیدہ قاری کے لیے ان کی دقّتِ نظر اور فکر بلیغ کے نازک ولطیف پہلوؤں تک پہنچنا اس لیے دشوار نہیں کہ وہ اپنی مہارت فن کے ذریعہ ایک ایسا پیرایۂ اظہار تراشتے ہیں کہ دقیق سے دقیق موضوع بھی حسن ولطافت کے پیکر میں ڈھل جاتا ہے مثلاً

گُل سے حدِ گلفام سے باہر تو نکلیۓ
اس پیرہنِ شام سے باہر تو نکلیۓ

لایعنی میں بھی یعنی کے انبار لگے ہیں
معنی کے دروبام سے باہر تو نکلیۓ

خوشبو تھی یاد آگ ہی کے پاس کیا بتائیں
کتنے دہکتے، کتنے مہکتے چلے گئے

یونہی فریب نظر کی طناب ٹوٹتی ہے — قدم بڑھایئے موج سراب ٹوٹتی ہے
جہاں چٹکتا ہے غنچہ زمین عالم پر — وہیں پہ تشنگئی آفتاب ٹوٹتی ہے
مکاشفات کے ٹکڑے ہیں ذہن کے اوراق — کتاب اُترتی نہیں ہے کتاب ٹوٹتی ہے

مشکور حسین یاد اپنی طبیعت کے والہانہ پن کے ساتھ ساتھ مزاجاً انکسار پسند اور طبعاً شوخ واقع ہوئے ہیں جس کا غماز اُن کا اداریہ ''بزم خویش'' نظر آتا ہے فرماتے ہیں کہ ''احمد ندیم قاسمی صاحب میری شاعری سے مشفقانہ انداز میں اس لیے نالاں ہیں کہ میں نئی نئی زمینوں میں غزلیں کہتا ہوں'' لگتا ہے کہ انہوں نے قاسمی صاحب کو اپنی بعض ردیفوں کی فہرست دکھائی ہو گی کہ ''مشفقانہ انداز'' کے ساتھ ان کا یہ ردعمل سامنے آیا ورنہ ہمیں یقین ہے کہ وہ اگر انہیں چند شعر بھی سنا دیتے تو امتیاز و انفرادیت کی سند حاصل کرتے جیسے یہ شعر

مانندِ گُل شگفتِ ارادہ کرو قبول — ہر آ گہی بہ قلب کشادہ کرو قبول
ہے دیدنی قدموں کی تب وتاب سر راہ — چلتا ہوا راہی ہے کہ مہتاب سرِ راہ
ہم جو رکھتے ہیں معانی کے اُفق رخشندہ — کرتے ہیں شوخ بیانی کے اُفق رخشندہ
نہیں نوکِ مژہ پر قطرۂ اشک — سمندر ہے گُہر کی انتہا پر
مثالِ گرد وہیں بیٹھ جاتی ہے دنیا — ہم اپنا دامنِ امید جب جھٹکتے ہیں
ہمارے سامنے آئے برائے نقد ونظر — قرینِ حال کو اوڑھے قرونِ گم گشتہ

یاد کے زیرِ تبصرہ مجموعہ میں جو کم وبیش ڈیڑھ سو غزلوں پر مشتمل ہے۔ ارفع فکر اور اعلیٰ فن کے جملہ لوازم برملا نظر آتے ہیں۔ یہ مجموعۂ غزلیات یاد کے بڑا شاعر ہونے کا معتبر گواہ ہے اور اس کی شعوری انفرادیت کا عکاس کہ ماضی وحال میں شائع ہونے والے دواوین میں اس ''طُرفہ قیامت'' سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔ چند نمونے:

گرتا ہوا آنسو ہے کہ تیشہ کی اَنی ہے — یہ اشک فشانی بھی عجب کوہ کنی ہے
پھر کیسے کرے بات کوئی روبرو اس کے — کلیوں کا چٹکنا بھی دریدہ دہنی ہے

رمز وصال و ہجر سے مہکایئے مجھے
یاد آنا ہے تو اس طرح یاد آیئے مجھے

آگے قدم بڑھا کے مرا ساتھ دیجئے
تاریخ کی طرح تو نہ دہرایئے مجھے

یارو چراغ جلوۂ جاں کو سنبھالنا
دشتِ طلب کی تیز ہوا ہے ہمارے ساتھ

شجر سے ٹوٹ کے پتہ گرا ہے یوں جیسے
فرشتہ لے کے زمیں پر کتاب اترا ہے

ہمارے خیال میں مصنف کو ظفر اقبال کا مشورہ مان لینا چاہیے تھا کہ ''برداشت'' سے کہیں بہتر اس مجموعہ کا نام ''یادداشت'' ہو سکتا تھا اس میں اُن کے تخلص کی نسبت واضح ہو جاتی۔ انہیں برداشت کے ذریعہ اپنے ذہنی تحفظات کے اظہار کی ضرورت نہ تھی کہ وہ ایک معروف و مقبول فنکار ہیں۔ انشائیہ میں ایک مخصوص رجحان کے موجد، نقاد، انشاء پرداز اور متعدد وقیع تصانیف کے ساتھ ساتھ میر غالب، اقبال اور انیس و دبیر پر گراں قدر تالیفات کا سہرا ان کے سر ہے:

مشکور کو دیکھا ہی کہاں ہے ابھی تم نے
مضموں ہیں بہت صاحب مضموں کے علاوہ

(جنوری۔ مارچ ۲۰۰۵ء)

آنکھ جھپکتا لمحہ

ڈاکٹر رشید نثار

زیر تبصرہ کتاب رشید نثار کی ۲۰۰۴ء میں منظر عام پر آنے والی تازہ تصنیف ہے۔ رشید نثار راولپنڈی کے قدیم باسی اور پوٹھوہاری شاعر کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے تجربات میں ادب کے ساتھ ساتھ صحافت بھی شامل ہے۔ تاہم زیر نظر کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ معاشی وسیاسی عوامل نے ان کے ذہن کو زیادہ متاثر کیا ہے۔ وہ فلسفیانہ فکر سے مزین خوبصورت عبارت لکھنے پر قادر ہیں البتہ تنقید کے میدان میں تند وتیز مزاج ہی نہیں تیر ونشتر کی کاٹ سے کام لیتے ہیں۔ ان کی تحریریں ان کے مخصوص سماجی وسیاسی ذہن کی عکاس ہیں۔

''آنکھ جھپکتا لمحہ'' اصل میں ایک عہد کی تاریخ ہے جس کی توضیح وتوجیہہ کو رشید نثار کا مخصوص زاویۂ نگاہ پس منظر مہیا کرتا ہے لیکن ان کی ہر تحریر کا حسین ترین وصف یہ ہے کہ انہوں نے جو واقعہ بھی بیان کیا ہے اُس کو اپنے بھرپور احساس صداقت اور ایقان وایمان سے بنیاد فراہم کی ہے۔ واقعات نگاری ایک ایسا عمل ہے کہ اس میں لکھنے والے کے ذاتی تحفظات معروضیت کی انتہائی کوشش کے باوجود راہ پا جاتے ہیں چنانچہ رشید نثار بھی اس عالمگیر صداقت سے مستثنیٰ نہیں۔ انہوں نے زیر نظر تصنیف میں جن موضوعات اور شخصیات کو ہدف تحریر بنایا ہے۔ انہوں نے قاری کے لے ذہنی وفکری کشش کے نت نئے عوامل پیدا کر دیئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اختلاف رائے کی گنجائش فراوانی سے نظر آتی ہے۔ بااین ہمہ مصنف بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں کہ وہ امتدادِ زمانہ کے فریم میں اپنی آنکھ سے دیکھے ہوئے مناظر کی رنگ برنگی تصاویر نصب کر دیں۔ یہ تصنیف خود صاحب تصنیف کی شخصیت اور اُن کے ذہنی وفکری ارتقاء کا آئینہ بھی ہے اور اسی لیے مستحق توجہ بھی۔

کتاب کے آخر میں راولپنڈی کی بعض شخصیات کے تاثراتی کلمات کو بھی شریک اشاعت

کیا گیا ہے۔ پاکستان ٹائمز کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر مرحوم مولوی محمد سعید ((۱۹۸۲ء) فرماتے ہیں کہ ''رشید کی صحافت'' تجزیہ نگاری اور خود کو پس منظر میں رکھ کر راز داری قائم کرنا سب کے سب اس کے اوصاف حمیدہ ہیں''۔ اسی طرح پاکستان ٹائمز ہی سے وابستہ ایک معروف صحافی سید شبیر حسین شاہ مرحوم کا کہنا ہے کہ ''پوٹھوہار کی سرزمین پر رشید نثار کا وجود اس لیے اہم ہے کہ وہ اپنی ڈگر پر چلنے والا ادیب بزرگوں اور دوستوں سے پیار کرنے والا شخص ہے''۔ لیکن جناب محمد ابن الحسن (سابق ایم اے جی) کا یہ جامع فقرہ کہ ''وہ ادب کا فقیر ہے لکیر کا نہیں'' اپنی معنویت کے اعتبار سے منفرد ہے۔

۱۶۰ صفحات پر مشتمل رشید نثار کی کتاب یقیناً ادب و سیاست کے حلقوں میں مباحث کا موضوع بھی بنے گی اور اپنی مخصوص تاریخی حیثیت کی ترجمان بھی۔

(جنوری۔ مارچ ۲۰۰۵ء)

نشاطِ ہجر (شعری مجموعہ)

شہناز نور

''نشاط ہجر'' معروف شاعرہ شہناز نور کا شعری مجموعہ ہے جو سال ۲۰۰۴ء میں دوبار شائع ہوا اور اس خصوصیت کے ساتھ کہ شاعرہ نے ''پرتوِ ذات'' کے عنوان سے دیباچہ خود سپردِ قلم کیا ہے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ بزرگ و مستند شعراء یا ناقدین کی آرا شریک اشاعت کی جاتی ہیں مگر شہناز نور کا نقطۂ نظر ہے کہ قاری و شاعر کے درمیان ابلاغ و ترسیل کا عمل براہِ راست ہونا چاہیے تا کہ وہ رائے جو قارئیں قائم کریں۔ کسی اور رجحانِ فکر سے متاثر نہ ہو۔ اس لیے انھوں نے اپنی تقریظ کو اپنے سوانحی خاکہ کے خدوخال تک محدود رکھا ہے۔ البتہ اس کا مطالعہ ان کے کلام کی تفہیم اور ان کے فکروفن کے زاویوں کے ادراک میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ ''نشاطِ ہجر'' کے عنوان کا پس منظر ان کی زندگی کی تلخیوں اور محرومیوں سے نبرد آزما رہنے کی جہد مسلسل سے عبارت ہے۔ حقوقِ نسواں کا گہرا شعور ان کی فکر کو اساس مہیا کرتا ہے اور اپنے خاندان کے بزرگوں کے اوصاف حمیدہ سے خوشہ چینی ان کا سرمایۂ افتخار ہے۔ پنجاب اور سندھ کی تہذیب و ثقافت کے امتزاج نے انہیں پروان چڑھایا جو ایک دلپذیر لہجہ بن کر ان کی شاعری میں سرایت کر گیا ہے۔ کراچی و سکھر کی ادبی شخصیات کی ہم نشینی سے انہوں نے اکتسابِ فیض کیا جس کا ذکر وہ نہایت تشکر آمیز انداز سے کرتی ہیں نیز اپنی شاعری کے آغاز سے ''نشاطِ ہجر'' کے لمحہ طلوع تک اُن تمام عوامل اور تجربات و مشاہدات کو نذر قارئین کرتی ہیں جو اذہان کو ان کی فکر کے پس منظر میں اترنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

یہ شعری مجموعہ جو دوسو صفحات پر مشتمل ہے۔ کم و بیش ستر پچھتر غزلوں اور حمد و نعت کے علاوہ قریبی رشتوں کے احترام پر مبنی چند مختصر منظومات کا احاطہ کیے ہوئے ہے جن میں اُن کا اُسلوب شگفتہ لیکن معنوی پس منظر زندگی کی تلخ و شیریں حقیقتوں سے مملو نظر آتا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ کیجئے۔

غم فراق غم جاں غمِ حیات مجھے
بہت عزیز ہے اپنی یہ کائنات مجھے

عجیب لوگ ہیں بہلا رہے ہیں جو مجھ کو
سنا رہے ہیں مرے دل کی واردات مجھے

بہا کے لے گئی برسات ریت کی دیوار
تباہ کر گئے طوفانِ حادثات مجھے

چراغ صبح کی تصویر میں ڈھلی ہوں میں
کبھی بجھائی گئی ہوں کبھی جلی ہوں میں

بلا سبب تو نہیں پیر ہن غبار آلود
ہوا کے ساتھ بہت دور تک چلی ہوں میں

کسی سے ہاتھ کسی سے نظر ملاتے ہوئے
میں بجھ رہی ہوں رواداریاں نبھاتے ہوئے

کسی کو میرے دکھوں کی خبر بھی ہو کیسے
کہ میں ہر ایک سے ملتی ہوں مسکراتے ہوئے

شہناز نور کے شعری مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اسلوب و آہنگ اور فکر و نظر کے ارتقائی مراحل سے ضرور گزر رہی ہیں لیکن ان کی غزل کا مزاج قدیم و جدید کے حسنِ امتزاج کے ساتھ ان کے شعور شعری کو اپنی گرفت میں لے چکا ہے۔ چند خوبصورت مثالیں ملاحظہ ہوں:

یوں اڑا لے گئی ہوا آنچل
جیسے میرا کبھی نہ تھا آنچل

رُت بسنتی ہوئی نہ مینہ برسا
اوڑھتی کیا زمیں ہرا آنچل

دھوپ ورنہ مجھے جلا دیتی
میں نے ہاتھوں کو کر لیا آنچل

میں اک ندائے پریشاں ہوا کی زد پہ ہوں
مری صدا پہ کہاں قافلہ ٹھہرتا ہے

میں شیشہ تن تھی کیسے ساتھ چلتی
کہ پتھر لوگ تھے جو ہم سفر تھے

اک تجھے بھولنے کی کوشش میں
تیری ایک ایک بات یاد آئی

متروک ہو نہ جائے کہیں رسمِ گفتگو
لب ہوں اسیر وقت تو آنکھوں سے بولیے

''نشاطِ ہجر'' کہ اپنے بہت سے مشمولہ کلام کے لیے شعر و ادب کی محفلوں میں داد و تحسین حاصل کر چکا ہے، شاعرہ کے ایک روشن تر مستقبل کا غماز بھی ہے۔

(جنوری۔ مارچ ۲۰۰۵ء)

دل ہے عشقی تاج کا (دوہے)

تاج قائم خانی

۱۶۰ اصفحات پر مشتمل تاج قائم خانی کی یہ تصنیف دوہوں پر مشتمل ہے۔ اندرونِ سندھ میر پور خاص سے شائع ہونے والی یہ کتاب اپنے اندر بڑی حد تک چونکا دینے کی صلاحیت رکھتی ہے، بالخصوص اس لیے بھی کہ ملک کے ایک دور دراز علاقے میں معیاری ادب تخلیق ہو رہا ہے اور دوہے جیسی کمیاب صنفِ سخن میں طبع آزمائی کرنے والے موجود ہیں۔ دوسرے مصنف کی اپنی زبان مارواڑی ہے جس کے بارے میں محسن بھوپالی کہتے ہیں۔

"تاج صاحب کی مادری زبان مارواڑی ہے لیکن انھوں نے اردو شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی اور بہت حد تک کامیاب نظر آتے ہیں، ان کی نعتیں، عام موضوعات پر نظمیں، قومی نظمیں اور بالخصوص دوہے اور گیت ان کے ذوق شاعری اور تخلیقی لگن کے آئینہ دار ہیں۔"

کتاب پر تقاریظ فرحت سپنا اور نوید سروش نے تحریر کی ہیں جو تصنیف کا ہر پہلو سے احاطہ کرتی ہیں۔ خاص طور پر نوید سروش نے کتاب اور مصنف کی ادبی حیثیت پر جامع اور پُر مغز تبصرہ کے علاوہ دوہے کی صنف اس کے ارتقاء اور خواص و امکانات پر سیر حاصل بحث کی ہے ایک حوالہ ان کی تحریر سے:

"تاج صاحب کے دوہوں کی ایک انفرادیت ایجاز و اختصار ہے ان کے دوہوں میں جذبہ، خیال اور واقعات اس روانی اور یکسوئی سے ملتے ہیں کہ نہ تو فنی نقص پیدا ہوتا ہے اور نہ مقصدیت نعرہ بنتی ہے۔ زبان و بیان اور موضوعات کے اعتبار سے تاج صاحب کے دوہوں کو قدیم و جدید دوہوں کے درمیان پل کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔"

زیر نظر تصنیف کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کہیں بھی دوہا نگار نے فنی تقاضوں سے

صرف نظر نہیں کیا بلکہ دوہے کی مخصوص، بحر کو از اوّل تا آخر استعمال کیا ہے خود کہتے ہیں۔

فعلن فعلن فاعلن ، فعلن فعلن فع	اردو میں دوہا نگر کی ہے یہی متاع

تاج قائم خانی نے کتاب کا انتساب ازرہِ عقیدت پروفیسر خواجہ دل محمد کے نام کیا ہے جن کا دوہا نگاری میں ایک مستند مقام ہے۔ ''پیت کی ریت'' ان کے دوہوں کا مجموعہ کافی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ دوسرے ڈاکٹر الیاس عشقی سے بھی جو حیدر آباد (سندھ) میں مستقلاً سکونت اختیار کر چکے ہیں، خصوصی تعلق خاطر کا اظہار کیا گیا ہے، الیاس عشقی صاحب کے دوہوں کا مجموعہ ۲۰۰۳ء میں ''دوہا ہزاری'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے ان دونوں حضرات کے لیے تاج کے درج ذیل دوہے خراجِ عقیدت و تحسین کی بہترین مثال ہیں۔

دوہا صنفِ سخن پر جب بھی ہو گا کام	لے گی اردو شاعری، خواجہ دل کا نام

دوہا دوہا سب کریں دوہا کرے نا کوئے	جو سچ مچ دوہا کہے وہ عشقی سا ہوئے

ہندی شعری ادب کی اس مقبول اور زرعی ودیہی کلچر کی نمائندہ اس صنفِ سخن میں تاج قائم خانی کی طبع آزمائی کے جو رجحانات نمایاں طور پر سامنے آئے ہیں ان میں اسلام سے ان کی والہانہ عقیدت خصوصاً حُب رسول کا بے پناہ جذبہ، پاکستان کی محبت اقدار و روایات سے قلبی لگاؤ اور لہجہ میں غزل جیسا جمالیاتی رچاؤ قاری کی خصوصی توجہ کو اپنی طرف راغب کرتے ہیں۔ چند مثالیں:

حمد و ثناء سے روح کو ملتی ہے تسکین	دُعا حمد کے ساتھ کر دل سے کہہ آمین

ہیں نبیوں میں آپ جیون، تاروں میں مہتاب	اسوۂ حسنہ آپ کے نورانی محراب

رب کے ساتھ حضورؐ بھی ہیں شہ رگ کے پاس	کیوں نہ شفاعت کی رکھوں پھر میں ان سے آس

بتا گئے معراج کا ہمیں غزالی راز	مومن کی معراج ہے پانچوں وقت نماز

تاج یہی ہے بائبل، گیتا اور قرآن	چار حرف ہیں پیار کے، پڑھ کے بن انسان

تاج، مادرِ وطن ہے، جس کی پاکستان	اس کو سدا عزیز ہے اردو ایک زبان

کیا بیٹی ماں بہن، کیا ان کے درجات	حیوانوں کی سمجھ سے باہر ہے یہ بات

پیار محبت ، فلسفہ ، حُسن رموزِ خیال دو مصرعوں میں غزل کے سمٹے سب احوال

جادوگر ہیں یہ کُھلے، گوری تیرے نین کبھی بکھیریں چین یہ، کبھی چرائیں چین

تاج قائم خانی کا پہلا شعری مجموعہ ''چھاؤں سلگتی راہوں میں'' اور دوسرا مجموعہ ''گیت پر کیوں گیت نہیں'' ۲۰۰۰ء میں منظر عام پر آ چکے ہیں ہمیں یقین ہے کہ ان کی یہ تیسری تصنیف بھی شرفِ قبولیت حاصل کرے گی۔

(جنوری۔مارچ ۲۰۰۵ء)

سمندر میں اُترتا ہوں (شعری مجموعہ)

انجم خلیق

انجم خلیق کی ربع صدی پر محیط شعری کاوشوں کا یہ زیرِ نظر مجموعہ اگست ۲۰۰۴ء میں منظرِ عام پر آنے سے اب تک ادبی حلقوں اور اہلِ نقد و نظر کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے انجم خلیق باعتبارِ عمر بزرگ اور نئی نسل کے درمیان ربط و تسلسل کی ایک خوبصورت علامت ہیں چنانچہ ان کا یہ شعری مجموعہ ہر دو رجحاناتِ فکر کا نہ صرف حسین امتزاج ہے بلکہ فکری توانائی تصوراتی حسن اور روایت و تجربہ کے محاسن سے آراستہ و پیراستہ ایک نادر مرقعِ شعری ہے دو سو صفحات سے متجاوز اور کم و بیش پچھتر غزلوں کے علاوہ چند آزاد نظموں پر مشتمل اپنی اس اولین تخلیق کا آغاز صاحبِ شعر نے حمدِ باری تعالیٰ اور نعتِ رسولِ مقبولؐ سے کیا ہے جب کہ متعدد اشعار میں منقبت کا رنگ نمایاں ہے۔ شعر سرِ آغاز ملاحظہ ہو:

خدائے کون و مکاں، ہستیِ ازل آغاز کھلی کتب کہوں یا تجھے سراپا راز

شعر کے اسلوب اور دروبست (Diction) سے شاعر کے زبان و بیان پر گرفت کی غمازی ہوتی ہے جس کو واضح بنیاد فارسی دانی نے مہیا کی ہے اور یہی وصف اس شعری مجموعہ میں از اول تا آخر نمایاں نظر آتا ہے جس نے شاعر کو اپنے ہم عصروں کی صفِ ممتاز میں لا کھڑا کیا ہے اس کا ایک سبب انجم خلیق کا تربیتی پس منظر بھی ہے جو شعر و ادب کی مہک سے رچا بسا نظر آتا ہے وہ فارسی و اردو کے ایک خوش فکر اور بدیہہ گو شاعر۔ عہد ساز صحافی اور زیرک و ذہین شخصیت خلیق قریشی مرحوم کے فرزند ارجمند ہیں اور ننھیال کی نسبت سے اردو کے ایک ممتاز شاعر اور غزل گو عدیم ہاشمی مرحوم کے بھانجے ہیں۔ انجم نے اپنے تحریر کردہ دیباچہ میں ان نسبتوں کو تفصیل سے واضح کیا ہے جس سے خود ان کی شخصیت کے دل آویز پہلو نمایاں ہو کر سامنے آگئے ہیں اور وہ عجز و انکسار، رواداری و مروّت اور اخلاص و ایثار جو ان کی پہچان بن

گئے ہیں۔ مزید کسی تصدیق وتوثیق کے محتاج نہیں رہے ان کا یہ مجموعۂ شعری بنیادی طور پر ان کی غزل گوئی کا ترجمان ہے جو شعور کی پہنائی، فکر ونظر کی گہرائی اور مختلف الجہت موضوعات کے حسین ودلکش اظہار اور لہجہ کی تازگی وشادابی کا مرقع ہے۔ آغاز کلام اس طرح کرتے ہیں:

قفلِ زندانِ خوفِ جہاں کھول کر　　　دل بہت مطمئن ہے زباں کھول کر

شاعر کی فکر کے مزید اسالیب کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے کیا جاسکتا ہے:

دستار ہنر بخششِ دربار نہیں ہے　　　صد شکر کہ شانوں پہ یہ سربار نہیں ہے
جسم تو جامے سے باہر ہو گئے　　　سر مگر چھوٹے رہے دستار سے
کچھ ذکر یار جس میں تھا کچھ ذکرِ وصل یار　　　تدوین زندگی میں وہی باب رہ گیا
پرسش ہے بہت سخت وہاں فردِ عمل کی　　　کچھ نعت کے اشعار بھی دیوان میں رکھنا
زمیں کربلائے فن میں پانی بن کے آیا ہوں　　　فراتِ فکر تازہ کی روانی بن کے آیا ہوں
مروّت نام کی اک شے کبھی ہوتی تھی دنیا میں　　　میں اس گم گشتہ دولت کی نشانی بن کے آیا ہوں

انجم خلیق کی توانا سوچ گردوپیش کے محرکات پر بھی مرکوز رہتی ہے لیکن اس کے ابلاغ میں وہ فنی محاسن کا سہارا لے کر شعر کی مشاطگی کا عمل بطریق احسن انجام دیتے ہیں اور غزل کے تازہ لب ولہجہ کو حسین سے حسین تر بنانے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ مثلاً:

اسی شرر کو جو اک عہد یاس نے بخشا　　　کبھی دیا کبھی جگنو، کبھی ستارا کریں
اے محتسب! انہیں بھی مگر جانتے ہیں ہم　　　جن پر کہ ہاتھ تجھ سے بھی ڈالا نہیں گیا
پہاڑ میرے تہور کا استعارہ ہے　　　میں پستیوں سے بھلا کیسے رسم وراہ کروں
سروں سے تاج بڑے جسم سے عبائیں بڑی　　　زمانے ہم نے ترا انتخاب دیکھ لیا
میری حیرت کو بھی تاریخ میں محفوظ کرو　　　میرے احباب میں ہر شخص بروٹس نکلا
مرے کہے کو امانت سمجھنا موجِ ہوا　　　میں آنے والے زمانوں سے کررہا ہوں خطاب

اس کے یقین حسن کا حسنِ یقیں تو دیکھئے   آئینہ دیکھتا ہے وہ اپنی نظر اُتار کر

زمین شعر پر انجم خلیق کے پہلے قدم کی گونج سماعتوں میں شہد گھول رہی ہے ہمیں یقین ہے کہ انکا مستقبل تابندہ تر ہے ان میں جادۂ شعر پر سنگ میل بن جانے کی صلاحیت برملا نظر آرہی ہے خدا انہیں اُن شعری گمراہیوں سے محفوظ رکھے جس میں نئی پود کے بہت سے اذہان اپنی علمی وفنی بے بضاعتی کے سبب شعر کی ہیئت اور حلیہ بگاڑ کر مبتلا ہو چکے ہیں۔

(جنوری۔مارچ ۲۰۰۵ء)

ترا آئینہ ہوں میں (شعری مجموعہ)

پروفیسر زُہیر کنجاہی

زہیر کنجاہی۔۔۔پوٹھوہار میں تخلیق ہونے والی اردو شاعری میں جانا پہچانا نام ہے بلکہ زہیر کنجاہی ملک کے بیشتر رسائل وجرائد میں اس کثرت سے چھپتے ہیں کہ شریف کنجاہی صاحب کے بعد شعری دنیامین کنجاہ کا دوسرا حوالہ بن گئے ہیں ان کا زیرنظر شعری مجموعہ ان کے شاعری سے والہانہ لگاؤ کا آئینہ دار ہے اوران کی اس قوی خواہش کا بھی مظہر کہ وہ مطلع شعروسخن کواپنی فکر کی روشنی سے منور کرسکیں۔ پروفیسر شریف کنجاہی نے دیباچہ اول میں لکھاہے کہ ''زہیر صاحب سے میرا مضبوط ترین رشتہ ہم وطنی کا ہے۔انہوں نے مجھے اپنی چند غزلیں ارسال کی ہیں کہ میں اُن کی زنجیر تعلق سے باہر نہ نکل سکوں'' جب کہ دیباچۂ دوم میں شاعر کے استاد مدرسہ ڈاکٹر احمد حسین احمد قلعداری رقم طراز ہیں کہ ''شاعر اپنی عظمت اُجاگر کرنے کے لیے عظیم دانشوروں اور نقادوں سے مقدمہ، پیش لفظ۔ دیباچے اور تبصرے لکھواتے ہیں جو میرے نزدیک ایک مصنوعی داستان ہوتی ہے'' ہمارے خیال میں محترم ڈاکٹر صاحب نے خودکو عظیم دانشوروں، شاعروں اور نقادوں سے علیحدہ کر کے کسرِ نفسی سے کام لیا ہے۔

بہت سے شعری مجموعوں کے برعکس زیرِ تبصرہ تصنیف کا نام نہ مبہم ہے نہ مہمل بلکہ واضح معنویت کا حامل ہے اس کے مطالعہ سے ایک بات جونہایت واضح ہوکر سامنے آتی ہے وہ شاعر کا خلوص اور حقیقت پسندی ہے ان کے حساس دل ودماغ نے جوشعری پیکر تراشے ہیں وہ ان کے احوالِ درون وبروں کے صحیح عکاس ہیں تاہم شعری روایت سے ہٹ کرنئی روش اپنانے کی جہاں جہاں کوشش کی گئی جسے عرفِ عام میں ''جدیدیت'' سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے وہاں وہاں شاعر کے ذہن میں جنم لینے والا ایک فکری تصادم اُبھر کر سامنے آیا ہے جس نے ان کی شاعری کو دوحصوں میں تقسیم کر دیا ہے ایک وہ حصہ جہاں کلاسیکی لب ولہجہ سے خوشہ چینی کا عمل واضح ہے اور غزل کے

مختلف النوع محاسن دیکھے جاسکتے ہیں جنہیں شاعر کے اُسلوب تازہ نے حسن ولطافت سے ہمکنار کر دیا ہے دوسرا حصہ جدیدت کی راہ اپنانے کی شعوری کاوش ہے جس نے ان کی غزل کی ہئیت ہی نہیں بلکہ معنویت کو بھی متاثر کیا ہے اور قاری محسوس کرتا ہے کہ لوازماتِ فن سے بے نیازی اور غزل کے مزاج و آہنگ سے متصادم الفاظ کا استعمال شاعر کو فکر وفن کے خلفشار سے ہمکنار کر رہا ہے، اول حصہ کے چند اشعار دیکھئے جو خوبصورت شاعری کے تمام لوازمات سے مزین ہیں:

مرے باغباں ذرا یہ بتا یہ مآلِ سیر چمن ہے کیا
کبھی پھول نظروں سے گر گئے کبھی خار دل میں اُتر گئے

ایک محفل ہیں اپنی ذات میں ہم — پھر بھی تنہا ہیں کائنات میں ہم
اس کے ہونٹوں کی سرخیوں سے زہیر — رنگ بھرتے ہیں بات بات میں ہم
کسی کی یاد ستاروں کے روپ میں ڈھل کر — چمک اٹھی مری پلکوں پہ آنسوؤں کی طرح
ہر پھول مضمحل ہے فضا ہے دھواں دھواں — یارو! بہار ہے کہ فریب بہار ہے
ہم سفینے کے لیے اک بوجھ ہیں — ہم اگر ڈوبے تو بیڑا پار ہے
ہے جن کے دم سے دنیا اک جہنم — چلے ہیں اب وہ تسخیر قمر کو
کیا ہو مآلِ اہل چمن کچھ خبر نہیں — شبنم کے آنسوؤں پہ گلوں کی نظر نہیں
تم نہیں جام نہیں رقص نہیں رنگ نہیں — کتنی بے کیف نظر آتی ہے برسات مجھے

شاعر کے ذہن میں جدیدیت کی تڑپ نے جو ذوق تخلیق اُبھارا ہے اس کے بھی چند مظاہر ملاحظہ ہوں:

اُپلے جلائے جاتے تھے اب گیس آگئی — تندور والی آہ! وہ مائی نہیں رہی
ہاں سربراہ گھر کا ہر اک چیز کھا گیا — ہاں گھر میں آج ایک بھی پائی نہیں رہی
اس کی آمد میرے گھر کے پاس متوقع ہے آج — میں نے اپنے نام کی تختی بھی در پر ٹانک دی
جمعہ کی تاکید کرتی ہے مگر خود بے نماز — کیا خبر اس کو نماز عشق میں نے ہے پڑھی

کرتا ہے جو خود اپنی کرامت پہ بہت شور　　دن رات روا رکھتا ہے وہ عہد شکن جور

سکھ بانٹ کے دامن میں بھروں دکھ میں کسی کے　　پھولوں کے عوض یوں بھی تو ملتے ہیں انگارے

میں مریض عشق ازل سے ہوں مرا عشق ہے مری آبرو　　جو سمجھ نہ پایا ہو عشق کو وہ تو نار کا سزوار ہے

ہم سمجھتے ہیں کہ شاعر ایک صاحب مطالعہ اور باصلاحیت شخصیت ہیں ان کا ذوق شعری بھی حسن تخلیق پر قادر ہے البتہ انہیں اپنی جدیدیت پسندی پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

(جنوری۔ مارچ ۲۰۰۵ء)

جدید سندھی ادب

سید مظہر جمیل

ڈیڑھ ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل سید مظہر جمیل کا یہ تحقیقی شاہکار جدید سندھی ادب کے میلانات، رجحانات اور امکانات کے حوالے سے عدیم المثال علمی دستاویز ہے کہ اس سے قبل اس قدر مبسوط اور ہمہ گیر کام سرانجام دینے کا اعزاز نہ کسی فرد کو حاصل ہو سکا نہ کسی ادارہ کو۔ مزید یہ کہ مصنف جن کی مادری زبان سندھی نہیں اپنی اس عظیم الشان کاوش کو جس عجز وانکسار کے ساتھ پیش کر رہے ہیں اس کا اندازہ خود انہیں کے ان الفاظ سے لگایا جاسکتا ہے۔

''میں سندھی زبان کا نہایت ادنیٰ درجہ کا طالب علم ہوں اور سندھی زبان کو جاننے اور سمجھنے کا قطعی دعویدار نہیں ہوں لیکن میں نے برسوں کی ریاضت سے بساط بھر سندھی زبان و ادب کی خوشبو کو اپنے احساس میں سمونے کی کوشش ضرور کی ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ مصنف کی ہم عصر معروف و معتبر شخصیات اور محققین ادب نے انہیں بھر پور انداز مین خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر ادل سومرو کے خیال میں

''ایسی زندۂ جاوید کتاب کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی جو کسی پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالہ سے بھی کہیں بڑا اور معیاری کام ہے، سندھی زبان و ادب پر ایسی جامع کتاب سندھی میں بھی موجود نہیں۔ مظہر جمیل نے سندھی زبان پر بہت بڑا احسان کیا ہے اور یہ قرض ہم لوگ کیا ہماری آئندہ نسلیں بھی نہ اتار سکیں گی۔''

سراج الحق میمن صاحب کے یہ الفاظ مصنف کی علمی صلاحیت کے لیے سند کی حیثیت رکھتے ہیں کہ ''وہ اردو کے ساتھ ساتھ سندھی زبان پر بھی عبور رکھتے ہیں۔ وسیع المطالعہ ہیں اور مضمون کے اعتبار سے کثیر المعلومات ہیں'' ڈاکٹر فہمیدہ حسین تو کہتی ہیں کہ ''یہ ایک ایسا تحقیقی مقالہ ہے کہ جس پر بجا طور پر انہیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملنی چاہیے کیونکہ اس سے قبل سندھی زبان و ادب

کی تاریخ پر اتنی جامع اور پر مغز کاوش کسی سندھی بولنے والے محقق نے بھی نہیں کی' اور مشفق خواجہ صاحب جن کی حالیہ وفات سے ادبی تنقید کی دنیا میں ایک زبردست خلا پیدا ہو گیا ہے یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ ''انہوں (سید مظہر جمیل) نے اس ادب کو صدیوں کے سیاق و سباق میں جس انداز میں دیکھا ہے وہ ان کی محققانہ کاوش اور ناقدانہ بصیرت کا بین ثبوت فراہم کرتا ہے۔''

کتاب پر تقاریظ جناب محمد ابراہیم جویو اور پروفیسر فتح محمد ملک نے تحریر کی ہیں جویو صاحب کے بقول ''سندھ کے سماجی پس منظر میں پہلی مرتبہ سندھی ادب کی ایک باقاعدہ منظم اور مرتب تاریخ لکھنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے'' اور پروفیسر فتح محمد ملک نے بجا طور پر کہا ہے کہ ''اس نوع کے وسیع اور ہمہ جہتی کام تو علمی و تحقیقی اداروں کے نامۂ اعمال میں بھی کم کم ہی دیکھنے میں آئے ہیں'' اس کے علاوہ جن مقتدر ادبی شخصیات نے مصنف کو ان کی اس علم افروز کاوش پر خراجِ تحسین پیش کیا ہے اُن میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ممتاز مہر، افتخار عارف اور آغا سلیم کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں کتاب کی ورق گردانی ہی سے مصنف کے سلیقہ و اہتمام کا اعتراف کرنا پڑتا ہے ان کی یہ نادر تصنیف جو اکتوبر ۲۰۰۴ء میں منصۂ شہود پر آئی سندھی زبان و ادب کے ماضی حال اور مستقبل (امکانات) کو نہایت خوبصورت انداز میں اپنے اندر سموئے ہوئے ہے کتاب کے پندرہ ابواب میں انہوں نے نہایت معتبر حوالوں اور ماخذات کی مدد سے معاشرتی و تہذیبی تغیرات، سندھی زبان کے رسم الخط، قواعد اور لغت سازی، شعری روایت، لوک ورثہ، عوامی گیت، رومانی داستانیں، عوامی کہانیاں، قدیم اصناف نیز جدید سندھی ادب کی رفتار ترقی و توسیع کے ساتھ ساتھ رجحانات و میلانات کے تغیر پذیر منظر ناموں کے لحاظ سے عہد تاسیس، عہد تعمیر اور عہد جدید (قیام پاکستان کے بعد) ادوار میں تقسیم کیا ہے اور سندھی میں فکشن، مختصر افسانہ، ناول، ڈرامہ وغیرہ کے ساتھ ساتھ تحقیق و تنقید انشا پردازی، سوانحی ادب، احتجاجی ادب اور سرحد پار یعنی بھارت میں سندھی ادب کی مختلف اصناف اور اُن کی تخلیقی وسعت و ہمہ گیری پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

کتاب کا انتساب جو مصنف کے والد گرامی مولوی سید عبدالقادر مرحوم سے کیا گیا ہے اس

اعتبار سے خصوصی معنویت کا حامل ہے کہ زیر نظر کتاب کی تدوین و تصنیف کا ابتدائی محرک والد مرحوم کی وہ حوصلہ افزائی ثابت ہوئی جو چھٹی جماعت میں لکھے جانیوالے ایک مضمون (سادھو بیلہ جی سیر) پر مصنف کو دو تین کتابیں عطیہ کے طور پر ملیں۔ اس مضمون کا ذکر سندھی کے استاد جناب ابوبکر شبلی نے مظہر جمیل صاحب کے والد گرامی سے بطور خاص کیا تھا۔ وہ تیرہ سال کی عمر میں اپنے والدین اور اہل خانہ کے ہمراہ ناگپور (سی۔ پی) اور حیدرآباد (دکن) میں ابتدائی تعلیم و تربیت کے پس منظر کے ساتھ ۱۹۴۹ء میں پاکستان آ گئے اور ۱۹۵۱ء ہی سے مسلسل سکھر میں رہائش پذیر رہے ہیں۔ البتہ ۱۹۷۳ء میں کراچی منتقل ہو گئے راقم الحروف کا مصنف سے تعارف و روابط کا سلسلہ کم و بیش پینتالیس سنتالیس برسوں پر محیط ہے وہ ادب کے شعبہ میں ہمیشہ فعال و متحرک رہے اور سکھر کے طویل قیام کے دوران اُن کے ترقی پسند ذہن اور سندھی ادب و معاشرت سے وابستگی بلکہ والہانہ محبت کی بھرپور نشوونما ہوئی جس کا روشن ثبوت ان کا زیر تبصرہ کارنامہ ہے اس سے قبل بھی اُن کی ایک اور وقیع تصنیف ''آشوب سندھ اور اردو فکشن'' جولائی ۲۰۰۲ء میں منظر عام پر آ چکی ہے اور یہ امر یقیناً حیرت واستعجاب کا باعث ہے کہ آئندہ دو سال کے قلیل عرصہ میں ان کا عظیم الشان تحقیقی مقالہ منظر عام پر آیا جس کی توفیق افراد کو تو کیا اداروں کو بھی سالہا سال کی کاوش و جستجو کے بعد شاذ ہی میسر آتی ہے مگر ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے سفارش گزیدہ اور مفاد پرستانہ نظام حیات میں صاحبان اقتدار کی نظر ایسے ٹھوس اور وقیع کام کرنیوالوں پر نہیں پڑتی بلکہ اُن کے عطا و سخا کے مستحق اکثر و بیشتر میڈیا کے اچھالے ہوئے وہ ظروفِ تہی ہوتے ہیں جنہیں ''جنس اشتہاری'' تو کہا جا سکتا ہے مگر کاروانِ علم و فن کی ''قافلہ سالاری'' پر محمول نہیں کی جا سکتا اعلیٰ ترین ریسرچ کے جملہ لوازمات سے مرصع مصنف کی یہ کاوش جمیل اُن کی محققانہ صلاحیتوں کی مظہر ہے جس کا اعتراف ادب و لسانیات سے تعلق رکھنے والے دوسرکاری اداروں کے سربراہانِ گرامی نے زیر نظر تخلیق میں کیا ہے مگر اس کے باوجود مصنف کا نام کہیں بھی سرکار والا مدار کے اعزاز یافتگان میں نظر نہیں آتا کاش ملک کی کوئی دانش گاہ اُن کی خدمت میں پی۔ ایچ۔ ڈی کا اعزاز استحقاق پیش کر کے اُن کی حق تلفی کا ازالہ کر سکے۔

(اپریل۔ جون ۲۰۰۵ء)

تلاش دانش

اقبال شفیع (علیگ)

سیف وقلم کے اوصاف سے متصف اقبال شفیع (علیگ) جو بریگیڈیئر اقبال شفیع کے نام سے بھی معروف ہیں اور اسلام آباد کی اکثر محفلوں میں اپنی شیریں سخنی اور بذلہ سنجی کے باعث مرکز نگاہ بن جاتے ہیں۔ شخصیت کے اعتبار سے دوآتشہ کہے جاسکتے ہیں۔فوج میں بریگیڈیئر کے منصب سے ستارہ امتیاز کے اعزاز کے ساتھ ریٹائر ہوئے ان کی سپہ گری کا تمام پس منظر ملک اور بیرون ملک کے متعدد مناصب جلیلہ اور اعزازات فاخرہ سے مُرصع ومزین نظر آتا ہے۔انہیں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ممتاز شخصیت پروفیسر ایس ایم شفیع کے فرزند ہونے کا بھی شرف حاصل ہے اور اس نسبت سے علی گڑھ کی آغوش تربیت میں پروان چڑھنے۔ ذہنی وفکری نشوو ارتقاء کے مراحل سے گزرنے اور سرسیّد کے افکار ونظریات سے بہرہ مند ہونے کا افتخار بھی ان کا سرمایۂ حیات ہے جس نے انہیں سیف ہی نہیں قلم کی عظمتوں کا بھی امین بنا دیا چنانچہ زیر نظر کتاب ''تلاش دانش'' ان کے اس شاہکار پس منظر کی غماز ہے۔جس کا مزید ثبوت کتاب کے سرورق پر مولانا روم کا یہ روح پرور شعر بھی ہے۔

بعد از وفات مرقدِ ما در زمین مجو　　　　در سینہ ہائے مردم عارف مزار ما

''تلاش دانش'' مصنف کی اس برملا تڑپ کی آئینہ دار ہے جو سرسید، علامہ اقبال اور قائد اعظمؒ کی عقیدت ومحبت کا فیضان ہے چنانچہ کتاب کا انتساب ہی قاری کے خون کی گردش تیز تر کر دیتا ہے۔ کہ ایک گمنام مسلمان بچہ جو تحریک پاکستان کے ولولہ انگیز دور میں بمبئی کی ایک شاہراہ پر گر جاتا ہے اور اپنے زخمی پاؤں دیکھ کر جب اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔تو وہ اپنے گرد جمع ہو جانیوالے لوگوں کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ زخم خوردگی پر گریاں نہیں بلکہ اس لیے آنسو بہا رہا ہے کہ وہ خون جو پاکستان کے لیے بہنا چاہیے تھا وہ بے مقصد ضائع ہو گیا

ہے۔ کتاب میں جا بجا علامہ اقبال کے فکر انگیز اشعار سے رواں وسلیس عبارت کو پُر تاثیر بنا دیا گیا ہے جب کہ سر سید کا تعلیم کے ساتھ تربیت کا تصور کتاب کی تخلیق کا محرک ہے چنانچہ کردار سازی کو مصنف نے اپنا موضوع بنا کر عہد حاضر کو ایک ایسا مجرب نسخہ تحفہ کر دیا ہے جس سے آئندہ نسلیں پاکستان کے حقیقی ورثے کی امین ومحافظ بن سکتی ہیں۔ مصنف نے اس تدریجی عمل کے نو مراحل پر کتب میں بحث کی ہے۔ جس نے کتاب کی منزلت کو سنجیدہ مقصدیت اور نصب العین کے ساتھ غیر مشروط وابستگی سے ہمکنار کر دیا ہے۔ مصنف نے اپنے ایثار و اخلاص کے تقاضے پورے کرتے ہوئے کتاب کی فروخت سے حاصل ہونے والی تمام آمدنی کو سر سید میموریل سوسائٹی کے نام وقف کر دیا ہے۔ جس کے اعزازی صدر کی حیثیت سے وہ اسلام آباد میں سر سیّد کے مشن سے منسوب ایک عظیم الشان کمپلیکس میں نئی نسل کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت وکردار سازی کے لیے بھی مخلص رفقائے کار کے ساتھ مصروف عمل ہیں۔

فاضل مصنف کی یہ کتاب ان کے سفرِ نگارشات کا تیسرا سنگ میل ہے۔ اس سے قبل وہ ''تلاش منزل'' اور ''تلاش سکون'' کے عنوانات کے تحت دو مزید کتابیں تصنیف کر چکے ہیں اور ملازمت کے دوران انہیں چونکہ چین میں قیام کا موقع ملا تو انہوں نے چینی زبان ہی نہیں سیکھی بلکہ "Silk Road to Sinkiang" کے نام سے انگریزی زبان میں ایک کتاب بھی مرتب کی۔ جس نے چین و پاکستان کے باہمی مراسم کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا، چنانچہ اقبال شفیع صاحب پاکستانچین دوستی کی انجمن کے سرپرست بھی ہیں۔ انہیں زیر تبصرہ کتاب ہی میں اہم شخصیات نے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ جن میں بریگیڈیئر گلزار احمد، کرنل حامد محمود، پروفیسر شوکت واسطی اور پروفیسر فتح محمد ملک جو کتاب کے تفریظ نگار بھی ہیں شامل ہیں۔

زیر نظر کتاب کا ایک حصہ انگریزی نگارشات پر مشتمل ہے۔ جس میں مصنف نے مشاہیر کے اقوال واقتباسات سے کتاب کی علمی، فکری اور معنوی حیثیت کو دوچند کر دیا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ یہ کتاب جو سال رواں کے اوائل ہی میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو چکی ہے۔ بالخصوص محبّ وطن حلقوں میں بے مثال پذیرائی کا شرف حاصل کر سکے گی۔

(اپریل۔جون ۲۰۰۵ء)

روشنی اور سائے (مجموعۂ رباعیات)

قمر رعینی

زیر تبصرہ کتاب ''روشنی اور سائے'' قمر رعینی صاحب کی تین سو رباعیات پر مشتمل ہے جسے انہوں نے بیک وقت تین شخصیات سے معنون کیا ہے جن میں سر فہرست حضرت راغب مراد آبادی ہیں کہ ''جنہوں نے اردو میں غیر منقوطہ رباعیات کے علاوہ فارسی اور پنجابی زبان میں بھی بکثرت رباعیاں کہیں ہیں'' اس کے بعد ڈاکٹر فرمان فتحپوری کہ ''جنہوں نے اردو زبان وادب کی تاریخ میں صنف رباعی پر پہلی پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ بعنوان ''اردو رباعی کا ارتقاء'' تحریر فرمایا اور شاعر کے تیسرے ممدوح جناب مامون ایمن ہیں کہ جنہوں نے ''دیار غیر (امریکہ) میں رباعی کا چراغ روشن کر رکھا ہے۔''

مصنف کی توصیف وتحسین میں راغب صاحب کی چند رباعیات بھی شریک اشاعت ہیں ایک رباعی میں وہ قمر رعینی صاحب کو اس طرح داد سخن دیتے ہیں:

جذبات وخیالات پہ رکھتے ہیں نگاہ — توضیح وکنایات پہ رکھتے ہیں نگاہ
جس وقت رباعیات کہتے ہیں قمر — یہ فن کی کرامات پہ رکھتے ہیں نگاہ

قمر رعینی صاحب بلاشبہ ایک کہنہ مشق شاعر ہیں اور معائب ومحاسن سخن سے کماحقہ، آگاہ بھی۔ ان کی شاعری جس کا غزل سے آغاز ہوا چھ دہائیوں سے بھی متجاوز مدت پر محیط ہے اور ۱۹۴۸ء میں پاکستان آنے کے بعد سے راولپنڈی کو اپنا مسکن بنائے ہوئے ہیں اس خطہ میں شعر وادب کی ترویج و ارتقاء میں ان کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ ''تذکرہ نعت گویان راولپنڈی اسلام آباد'' کے نام سے کم و بیش یک صد مقامی نعت گو شعراء کے سوانح اور نمونہ کلام پر مشتمل ایک کتاب شائع کر چکے ہیں۔ انہیں یہاں کی شعری محفلوں میں ایک بزرگ شاعر اور استاد کا مقام ومرتبہ حاصل ہے خود فرماتے ہیں کہ

پچاس کی دہائی میں رباعی کہنے کا شوق پیدا ہوا چنانچہ انکا یہ تجربہ بھی ''نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں'' بادۂ خیام کے نام سے خیام سے منسوب سو رباعیات کا رباعی ہی کی صنف میں اردو ترجمہ شائع کر چکے ہیں اور ''ولائے رسولؐ '' کے زیرِ عنوان ان کی نعتوں کا مجموعہ بھی منصۂ شہود پر آچکا ہے۔ جسے ۲۰۰۴ء میں وزارت مذہبی امور حکومت پاکستان کی طرف سے سال کے بہترین مجموعہ ہائے نعت میں شمار کر کے انہیں نقد انعام اور سندِ امتیاز سے بھی نوازا گیا۔

زیر تبصرہ کتاب کا دیباچہ ''میں اور رباعی'' کے عنوان سے مصنف نے خود تحریر کیا ہے جس سے ایرانی نژاد اس صنفِ سخن پر ان کی فن کارانہ بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے اور بحر ہزج کی نمائندہ یہ صنف سخن جس طرح دیگر اصناف سخن میں وقار و منزلت کی حامل ہے اسے فاضل مصنف نے نہایت بلیغ انداز میں واضح کیا ہے فرماتے ہیں۔

''رباعی چار مصرعوں پر مشتمل اصناف میں سب سے زیادہ مترنم صنف سخن ہے جو جان دار بھی ہے اور شان دار بھی اور فنی نقطہ نظر سے جان لیوا بھی۔ جان لیوا اس لیے کہ اس کے بھی کچھ مخصوص عروضی تقاضے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے مروجہ چوبیس اوزان ہیں جو آسانی سے قابو میں نہیں آتے''

محسوس ہوتا ہے کہ قمر رعینی صاحب کو رباعی سے خاص لگاؤ ہے کہ یہ صنف سخن اردو اور فارسی کے قادرالکلام شعراء کو بھی نہایت مرغوب و محبوب رہی ہے۔ چنانچہ وہ آج کل ''اردو رباعی عہد بہ عہد'' کے عنوان سے ایک کتاب کی تدوین و ترتیب میں مصروف ہیں جس میں رباعی کی تاریخ، ایجاد و آغاز اور فن پر سیر حاصل گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ان کی یہ محققانہ کاوش ضرور پذیرائی کی مستحق ٹھہرائی جائے گی۔ زیرِ نظر تصنیف ہی میں وہ ایک جگہ کہتے ہیں کہ:

''میرے خیال میں حقیقی شاعر وہ ہے جس کی شاعری زندگی آمیز ہو اور زندگی آموز بھی آپ میرے اس مجموعہ میں ایسی رباعیات دیکھیں گے جن میں واقعات کی عکاسی بھی ہے اور واردات قلبی کا بیان بھی۔''

قمر صاحب نے جن مضامین کو اپنا ہدف فکر بنایا ہے یا جن موضوعات پر زیر تبصرہ رباعیات کے در و بام تعمیر کیے ہیں ان کی تقسیم کے عنوانات درج ذیل ہیں:

ا۔افکار و حقائق ۲۔آیات بہار ۳۔ماضی کا تصور ۴۔کرب آگہی ۵۔متفرقات

چند نمونے ملاحظہ فرمائیے:

یہ خواب کا عالم ہے کہ بیدار ہو تم
انسان ہو یا نقش بہ دیوار ہو تم
شعروں سے جھلکتا نہیں ماحول کا عکس
کس منہ سے یہ کہتے ہو کہ فنکار ہو تم

نبّاضِ مزاجِ رگ دوراں ہیں ہم
آئینۂ مستقبلِ رخشاں ہیں ہم
لوگو ہمیں آسودۂ ساحل نہ کہو
پروردۂ ہنگامۂ طوفاں ہیں ہم

نازک بھی ہے یہ اور گراں بار بھی ہے
یہ اپنی جگہ پھول بھی ہے خار بھی ہے
لہجہ الفاظ ، گفتگو کا انداز
سچ پوچھو تو جادو بھی ہے تلوار بھی ہے

نظروں میں مجھے تول رہا ہو جیسے
جذبات میں رس گھول رہا ہو جیسے
یہ چاند کی کرنوں سے تراشا ہوا جسم
ہر عضو بدن بول رہا ہو جیسے

تھی کتنی ہمہ گیر کہانی میری
روداد تھی اوروں کی زبانی میری
میں نے تو بہت کہا یہ قصہ ہے مرا
لوگوں نے مگر ایک نہ مانی میری

پلکوں سے ستارے جو ڈھلک جائیں گے
یہ تذکرے پھر تابہ فلک جائیں گے
یوں پرسش احوال سے نشتر نہ لگاؤ
پیالے لبریز ہیں چھلک جائیں گے

پھولوں کو مہکنے کا قرینہ آجائے
پژمردہ زندگی کو جینا آجائے
تم زلف گہر ریز اگر بکھرا دو
ان کالی گھٹاؤں کو پسینہ آجائے

بپھری ہوئی موجوں کی جوانی ہیں ہم
اُمڈے ہوئے دریا کی روانی ہیں ہم
کیا جانیئے کب موجِ فنا سے مل جائیں
پانی پہ لکھی ہوئی کہانی ہیں ہم

(اپریل۔جون ۲۰۰۵ء)

مشارق (مجموعہ حمد ونعت)

اسد ملتانی (مرحوم)

زیر تبصرہ کتاب کے مرتب پروفیسر جعفر بلوچ ایک سنجیدہ فکر نقاد اور صاحب بصیرت ادبی محقق ہیں وہ چونکہ خود بھی بحیثیت شاعر شعری رموز ونکات سے آگاہ ہیں اور حمد ونعت جیسی احتیاط کی متقاضی لطیف اصناف سخن کا ادراک رکھتے ہیں اس لیے حضرت اسد ملتانی کے مجموعۂ حمد ونعت ''مشارق'' کی تدوین نو اور اس میں خوبصورت اضافون کے ساتھ اس کی پیش کش کو پروفیسر موصوف کی گراں بہا علمی ودینی خدمت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ وہ اس سے قبل بھی ۱۹۷۴ء اور ۱۹۹۱ میں علی الترتیب ایک کتاب بعنوان ''مطلعین'' اور دوسری ''اقبالیاتِ اسد ملتانی'' (طبع دوم) مظفر ادبی اکادمی اور اقبال اکادمی پاکستان لاہور کے توسط سے منظر عام پر لا چکے ہیں۔ ''مطلعین'' میں جناب اسد ملتانی کے علاوہ راجہ محمد عبداللہ نیاز کے فکر وفن، شخصیت اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو مرکز نگاہ بنایا گیا ہے۔ چنانچہ ان کی اس تیسری کاوش کے منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہونے کے بعد حضرت اسد ملتانی مرحوم سے ان کی خصوصی دلچسپی اور ذہنی وفکری تعلق کا سراغ ملتا ہے۔

بالخصوص مرتب کی حیثیت سے مشمولات کتاب میں ''اسد ملتانی کا حمدیہ ونعتیہ کلام'' کے زیر عنوان ان کی مبسوط تحریر ایک ایسا خرد افروز تحقیقی وتنقیدی جائزہ ہے جس سے نہ صرف قاری شاعر کی صلاحیت فکر وفن کا معترف ہوتا ہے بلکہ حمد ونعت جیسی اصناف سے والہانہ وابستگی اور ادب و احترام سے مملو مذہبی ذہن سے بھی متعارف ہوتا ہے۔ مرتب کا عہد حاضر کے گرد آلود منظر نامہ میں جو اکثر وبیشتر خود پسندی وخودستائی پر مبنی اور رُطب ویابس سے بھرے ہوئے شعری مجموعوں کی تقاریب رونمائی سے بری طرح دھندلا چکا ہے۔ رفتگان میں سے ایک ہستی کا انتخاب جو حضرت علامہ اقبالؒ کے افکار ونظریات ہی سے سرشار نہیں بلکہ اسلوب اقبال کا بھی نمائندہ ہے

ایک نہایت قابل تحسین اقدام ہے۔

حضرت اسد ملتانی کی حکیم الامت سے نسبت یکطرفہ نہیں بلکہ انہیں موخر الذکر سے دادِ سخن پانے اور اصلاح سخن حاصل کرنے کا اعزاز بھی حاصل تھا شاعر کے سوانحی خاکے میں مرتب لکھتے ہیں کہ:

''۱۹۲۱ء میں گونمنٹ کالج لاہور میں منعقد ہونیوالے مقابلہ نظم میں جناب اسد ملتانی کی نظم ''قطرۂ شبنم'' اول انعام کی مستحق قرار دی گئی۔''

اس مقابلہ کا فیصلہ حضرت علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا اسی موقع پر حضرت علامہ نے جناب اسد کی اس نظم پر از خود اصلاح بھی فرما دی تھی۔ فاضل مرتب نے اسد ملتانی مرحوم کے بارے میں بعض مشاہیر کی توصیفی آراء بھی پیش کی ہین جن میں مولانا حامد علی خاں، مولانا ماہر القادری، سید ضمیر جعفری، سید محمد عبدالرشید فاضل (اقبالیات کے موضوع پر معروف مولف و مصنف) منشی عبدالرحمان خاں (مولف 'چند نا قابل فراموش شخصیات') اور جمیل نقوی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ جناب خضر تمیمی سے روایت اور ''ملفوظات اقبال'' مرتبہ محمود نظامی کے حوالے سے حضرت علامہ کا یہ جملہ بھی نقل کیا ہے جس کی تصدیق آنے والے وقت نے کی کہ ''آئندہ پنجاب کی ادبی روایات کو برقرار رکھے جانے کی امیدیں ان دو جوانوں سے وابستہ نظر آتی ہیں، ایک تاثیر (ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر) اور دوسرے اسد محمد خان'' فاضل مرتب نے اپنے تحقیقی جائزہ میں اسد مرحوم کے کلام سے بہت سے حوالے دیئے ہیں جو ان کے مدح کی شاعرانہ عظمت اور دین اسلام بالخصوص آنحضورؐ کی ذات گرامی سے بے پناہ عقیدت و محبت کے آئینہ دار ہیں۔ ''معیار شعر و ادب'' کے بارے میں اسد مرحوم کے نقطہ نظر کی وضاحت کے لیے درج ذیل اشعار کا انتخاب بھی نہایت برمحل نظر آتا ہے۔

ادب کے حسن کا معیار ہے مذاقِ سلیم　　نہیں ہے اس میں جدید و قدیم کی تقسیم
ظہور ہر گل تازہ، نمود ہر مہ نو　　کوئی بتائے یہ جلوے جدید ہیں کہ قدیم

ماورائیت کا یہ تصور اسد مرحوم کی توانا فکر کا مظہر ہے۔ جس کی ہمہ گیر پذیرائی سے ادبی

تسلسل کے درمیان کم نظروں اور کم سوادوں کی پیدا کردہ خلیجوں کو پاٹا جا سکتا ہے اور خودنمائی میں لپٹی ہوئی علمی بے بضاعتی سے بھی گریز ممکن ہے جو بدقسمتی سے ''جدیدیت'' کے نام پر بہت سے سمت باختہ لکھنے والوں کا خود فریبانہ رویہ بن گیا ہے۔

پروفیسر جعفر بلوچ نے ۱۹۵۴ء میں پہلی بار شائع ہونیوالے جناب اسد ملتانی کے سفر حج کی نظموں کے دلآویز مجموعہ ''تحفۂ حرم'' کو تدوین نو کے بعد ''دریاب'' کے زیر عنوان اپنے حسن انتخاب کے شاہکار اضافوں کے ساتھ مکرر شائع کر کے ایک وقیع ادبی خدمت انجام دی ہے جس پر وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

بہت ہی تنگ سمجھ لی گئیں حدود حرم — کوئی وسیع انہیں قاف تا بہ قاف کرے
نبیؐ کا عشق، خدا کی اطاعتِ کامل — یہ دیں کی اصل ہے باقی تمام افسانے
سہل ہے حق کی مغفرت کا حصول — مشکل اندازۂ مقام رسولؐ
شہ رگ سے قریب اور حد ادراک سے باہر — اس تیرے عجب قرب کے قربان گئے ہم
یارب نگاہ عقل کو ذوق جمال دے — ایمان و آگہی کو محبت میں ڈھال دے

(اپریل۔جون ۲۰۰۵ء)

سارے جہاں کا درد (شعری مجموعہ)

ڈاکٹر صابر آفاقی

پروفیسر صابر آفاقی نہ صرف اردو زبان وادب کے محقق، ادیب اور شاعر ہیں بلکہ یہی مقام ومنزلت انہیں فارسی اور گوجری زبان وادب کے حوالے سے بھی حاصل ہے ان کی تصانیف کم و بیش تین درجن ہیں جو تینوں زبانوں کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ انہیں بجا طور پر سردار محمد ابراہیم خاں مرحوم سابق صدر آزاد حکومت، ریاست جموں وکشمیر نے ''کثیر التصانیف'' مصنف قرار دیا ہے۔ ان کے اہم ترین قلم پاروں میں کشمیر کے قدیم ترین تاریخی ماخذ ''راج ترنگنی'' کے فارسی ترجمہ کی مدیریت ونظارت کے علاوہ ''اقبال اور کشمیر'' جلوۂ کشمیر'' اور گوجری ادب'' جیسی تحقیقی تصانیف شامل ہیں نیز اردو میں بشمول زیرہ تبصرہ کتاب آٹھ، گوجری میں سات اور فارسی میں چار مجموعہ ہائے شعری ان کے فکروفن کے ترجمان ہیں۔ اس طرح آفاقی صاحب کے تبحر علمی اور فنی ریاضت سے صرف نظر کرنا کسی بھی مبصر یا مورخ کے لیے ممکن نہیں وہ پینتیس سال آزاد کشمیر کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تدریسی خدمات انجام دے چکے ہیں، چنانچہ وہ بلا شبہ آزاد کشمیر کا علمی و ادبی افتخار اور آزاد کشمیر ان کا سرمایہ افکار بن گئے ہیں۔

آفاقی صاحب کا زیر نظر شعری مجموعہ اپنے عنوان ہی سے ان کی فکری آفاقیت، انسان دوستی اور امن وسلامتی کے لیے ان کی دردمندانہ تڑپ کی غمازی کرتا ہے۔ ان کے بارے میں مرحوم حکیم محمد سعید نے فرمایا تھا کہ ''صابر آفاقی کو دلی تمنا ہے کہ دنیا جنگ کے عذاب سے محفوظ رہ کر امن وسلامتی کی طرف رواں دواں رہے۔ مقصدیت کے اسی رچاؤ نے ان کی شاعری کی سمت و جہت کو قبولیت سے ہمکنار کر دیا ہے''۔ ان کا زیر نظر مجموعہ ۶۳ غزلوں کے علاوہ جن دیگر اصنافِ سخن پر مشتمل ہے ان میں نظم، ماہیا اور دوہا شامل ہیں جو ان کے فنی تنوع کے ضمن میں فکری اجتہاد کے بھی آئینہ دار ہیں۔ ان کی نظم نگاری کے بارے میں بلراج کومل کا خیال ہے کہ وہ

''سادہ و باتر سیل اور با اثر زبان میں تخلیقی اظہار کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں'' ان کی ماہیا نگاری پر ایک منفرد انداز کا خوبصورت تبصرہ آصف ثاقب نے یوں کیا ہے۔

''باب شعر میں اردو ماہیا بھی اب لائق استغنا (یادر خور اعتنا) ٹھہرا ہے تو صابر آفاقی نے اس صنف سخن میں موتی موتی لفظ پرو کر شعریت کی مالا سخن فہمی کی دیوی کے گلے میں ڈال دی ہے''

اسی طرح تاج سعید نے بھی مصنف کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''جب ہم صابر آفاقی کے دوہوں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے دوہے کے مزاج کو خوب سمجھا ہے بلکہ اس کے باطن میں اترنے کے لیے دوسرے دوہا نگاروں کے تخلیقی رجحانات کو بھی پرکھا ہے'' صابر آفاقی کے یہاں محدود ہی سہی جاپانی صنف سخن ہائیکو' اور پنجابی صنف سخن ''ٹپہ'' کے بھی تجربات ملتے ہیں۔

'ہائیکو اور لوگ بھی لکھ رہے ہیں البتہ ٹپہ اردو میں خود بقول شاعر پہلی کوشش ہے اس ضمن میں ہمارا خیال ہے کہ دوسری زبان میں منتقل کیا جانا جو قطعی مختلف ثقافت اور تمدنی رویوں کی نقیب ہو ایک نہایت کٹھن کام ہے گو ناممکن نہیں لیکن کسی بھی ایسی کاوش کا تسلسل سعی لاحاصل ثابت ہوتا ہے جہاں دور دور تک فکری و جذباتی ہم آہنگی کے امکانات نہ ہوں جن کی بنیاد قطعاً مختلف و متضاد، تہذیبی و ثقافتی رویوں معاشری عوامل اور فکری رجحانات پر ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم گزشتہ چند دہائیوں سے تخلیق ہونیوالے شعری ادب پر نظر ڈالتے ہیں تو ایک مبہم و غیر شفاف منظر نامہ ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔ آفاقی صاحب کی غزل ان کے محسوسات، جذبات اور نظریات کی پر خلوص ترجمان نظر آتی ہے ان کے فکری رویوں سے ان کے ماضی سے حال میں سفر کی تمام سرگزشت سامنے آجاتی ہے جس کو ان کے مطالعہ، تجربہ اور مشاہدہ نے اساس مہیا کی ہے جہاں تک ڈکشن یا اسلوب کا تعلق ہے وہ غزل کی ہئیت میں تو روایت سے رشتہ قائم کئے ہوئے ہیں البتہ لفظ و معانی کے میدان میں اپنے اجتہادی رویے کے باعث ''جدیدیت'' کے طرف راغب نظر آتے ہیں

بایں ہمہ ان کا شعری افق ستارہ بار نظر آتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

پھر کیسے طلسمِ ہنر و عیب کھلے گا
اس شہر میں اب کوئے ملامت بھی نہیں ہے

وہ دور آتا ہے جو بھی کرے گا دعویٰ عشق
کہاں کہاں سے ہے سینہ دریدہ پوچھیں گے

صحرا کی طرح آنکھ نے پہنا ہے سراب
دریا کی طرح وقت رواں ہے مجھ میں

ان کی قسمت میں کہاں تازہ ہوا کے جھونکے
ذات کے خول سے جو لوگ نکلتے ہی نہیں

کھُلا کہ ہم ہی دیے کو نہ جلنے دیتے تھے
ہمارے بعد چراغوں میں روشنی تھی بہت

اور ایک نظم سے خوبصورت قطعہ اردو کے بارے میں ملاحظہ کیجئے!

ہے نئی نسل میں نغموں کا ترازو اردو
قمریاں بولتی ہیں شاخ پہ ''اردو، اردو''

اپنی دھرتی ہے گلستان محبت جس میں
رنگ اردو ہے ثمر اردو ہے خوشبو اردو

(اپریل۔جون ۲۰۰۵ء)

کلیاتِ یوسف ظفر

ڈاکٹر تصدّق حسین راجا

طلب وانتظار کے صبر آزما مراحل سے گزرنے کے بعد اہل ذوق کو بالآخرت نویدِ ظفر ☆ ملی اور یوسف ظفر مرحوم کا ''کلیات یوسف ظفر'' منصۂ شہود پر طلوع ہوا۔ جو شاعر کے نصف درجن مطبوعہ دواوین پر مشتمل ہے۔ چند دن قبل اس کلیات کی تقریب تعارف کا اہتمام اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں کیا گیا جو اس اعتبار سے منفرد تھی کہ وہاں نہ تو صدر نشیناںِ گرامی کے کوئی آثار تھے اور نہ مہمانانِ خصوصی کے البتہ شرکائے محفل کی ایک تعداد میزبانوں کے حسنِ انتخاب کی مظہر ضرور تھی کلیات کے نسخے مہمانوں کی میزوں پر پہنچا دیئے گئے تھے جس کی ورق گردانی وہ مدارات کے دوران کرتے رہے تقریب کی یہ انفرادیت اس لیے اور بھی واضح تھی کہ اسلام آباد ایک مدت سے شعراء کے شعری مجموعوں کی تقاریب رونمائی کے جس امراض لا دوا میں مبتلا ہے وہ وبائی شکل اختیار کر چکے ہیں اور اب اکثر صاحبان ذوق ایسی محفلوں میں شرکت سے گریز ہی میں عافیت سمجھتے ہیں کہ مخصوص صدور و مہمانان خصوصی کی شکلیں دیکھ دیکھ کر ان کی آنکھیں پتھرا چکی ہیں اور پیشہ ور مقررین کی توصیفی تقریریں سن سن کر کان گنگ ہو چکے ہیں جو کتاب کے مطالعہ کی زحمت کیے بغیر رطب اللسان ہوتے ہیں اور یہی حال اکثر فلیپ لکھنے والوں کا ہے۔

یوسف ظفر ماضیٔ قریب کی اردو شاعری کا ایک محترم و عہد ساز نام ہے جس کے کلام کو یکجا دیکھنے کی آرزو شاعر کے بے شمار پرستاروں کے دلوں میں کروٹیں لے رہی تھی چنانچہ ''کلیات'' کا متوقع استقبال شایانِ شان طور پر کیا گیا۔ اس میں شامل دو مجموعے ''زنداں'' اور ''زہر خند'' ۱۹۴۴ء میں اشاعت پذیر ہوئے تھے۔ ان دونوں نظموں کے مجموعوں میں ایک نمایاں تکنیکی

☆ معنوی اشارہ مرحوم شاعر کے صاحب علم وخبر فرزند جناب نوید ظفر کی جانب جن کی کاوشوں کے نتیجہ میں ایک منفرد فکر و اسلوب کے شاعر کا کلیات شعری منظر عام پر آیا۔

فرق یہ ہے کہ اوّل الذّکر غیر مقفّٰی اور ثانی الذّکر قافیہ وردیف کے اہتمام کے ساتھ نظموں پر مشتمل ہے البتہ شاعر نے زہر خند کے دیباچے میں ان دونوں مجموعوں کی تقدیم و تاخیر کی وضاحت اس طرح کی ہے:

''زہر خند میرا پہلا مجموعۂ کلام ہے زنداں نہیں۔ اشاعت کے لحاظ سے اوّلیت کا حق 'زنداں' ہی کو پہنچتا ہے لیکن میں اس کے باوجود 'زہر خند' ہی کو اپنا پہلا مجموعۂ کلام سمجھتا ہوں۔ میں نے اس میں اسلوب بیان اور اسلوب خیال کے تجربوں کو یکجا کر دیا ہے: پیش لفظ خود تحریر کرنے کے جواز میں مصنف لکھتے ہیں:

''زہر خند کا پیش لفظ میں خود ہی لکھ رہا ہوں اس لیے نہیں کہ مجھے کرم فرمایعنی ''مقدمہ نگار'' نہیں ملتے بلکہ اس لیے اور محض اس لیے کہ میں پامردیٔ ہمسایہ سے بہشت میں جانا نہیں چاہتا''

''پامردیٔ ہمسایہ'' کا بلیغ اشارہ یوسف ظفر مرحوم کے ذہن میں محفوظ سعدی شیرازیؒ کے مندرجہ ذیل شعر پر اُن کے ایمان وایقان کو ظاہر کر رہا ہے:

رفتن بپائے مردیٔ ہمسایہ در بہشت   حقّا کہ باعقوبتِ دوزخ برابر است

نیز ہم شاعر کے خود ''دیباچہ'' تحریر کرنے کے استدلال کو بھی زیادہ بامعنی سمجھتے ہیں کہ اس طرح قاری وفنکار کے درمیان براہِ راست رابطہ تفہیم کے عمل کو زیادہ سہل اور دلنشین بنا دیتا ہے جب کہ دوسرے تجزیہ نگاروں سے سہو بھی ہوسکتا ہے اور غلو بھی۔ زیر نظر ''کلیات'' جو ساڑھے آٹھ سو سے بھی متجاوز صفحات پر مشتمل ہے اس پر ڈیڑھ صفحہ کا دیباچہ محترم فتح محمد ملک نے تحریر فرمایا ہے اور اس اظہار خیال کے ساتھ کہ:

''مجھے یقین ہے کہ اگر زنداں اور زہر خند کی تفہیم وتحسین کے راستے شاعر اور اس کے فنی و فکری مسلک تک رسائی کی کوشش کی جاتی تو یوسف ظفر ایک ترقی پسند شاعر نظر آتے''

ترقی پسند اور جدت پسند شاعر کی بحث کا تعلق بالخصوص گذشتہ صدی میں چالیس کی دہائی

سے ہے جب یوسف ظفر (مرحوم) کا ذہن اپنی کامل توانائی اور فکر وفن کی ندرتوں کے ساتھ افقِ شاعری پر جلوہ بار تھا وہ حلقۂ ارباب ذوق کے نمائندہ فن کار تھے جب کہ انجمن ترقی پسند مصنفین بھی اپنی تمام تر قوتوں کے ساتھ شعر وادب پر اپنے مخصوص نظریات کی سایہ افگنی میں مصروف تھی چنانچہ پروفیسر ملک کی رائے خود شاعر (یوسف ظفر) کے مندرجہ ذیل اظہار خیال کے بعد محل نظر ٹھہرتی ہے:

''وہ حضرات جو مجھ پر ترقی پسندی کا لیبل لگاتے ہیں سمجھ لیں کہ میں کسی مقصدی ادب کا قائل نہیں میرے ساتھ میری زندگی۔ میرا ماحول۔ میرا وطن میری دنیا میری بے بسی ہے اور بس۔''

یوسف ظفر (مرحوم) کے طویل ادبی سفر میں جن رفیقان ہم قدم کے نام آتے ہیں ان میں بلا اختصاص میرا جی سعادت حسن منٹو، ساحر لدھیانوی۔ مختار صدیقی۔ ممتاز مفتی اور ضیاء جالندھری وغیرہ وشامل ہیں۔ بعض تذکرہ نگاروں کے ان کے حلقۂ ارباب ذوق سے تعلق خاص کو بنیاد بنا کر ان کے اور میرا جی کے درمیان فکری وذہنی ہم آہنگی کے افسانے تراشے ہیں جب کہ مرحوم کی شعری فکر اور فنی ارتقاء نیز نظریاتی تشخص کا عمیق جائزہ لینے والے شاید اس مفروضہ سے متفق نہیں ہوں گے ہمارے خیال میں بھی یوسف ظفر (مرحوم) جن کا علمی اور ادبی وفنی سفر جس نقطۂ عروج کو پہنچا وہ ان کے دینی مسلک افکار کی اخلاقی بنیاد حبِ رسولؐ اور بالعموم متصوفانہ انداز نظر کا ثبوت فراہم کرتا ہے وہ اپنے ایک ''دیباچہ'' میں دوٹوک انداز میں فرماتے ہیں:

''ادبی اعتبار سے ہم (یعنی میرا جی اور یوسف ظفر میں) ''بعد قطبین تھا''

اسی طرح ہمارے لیے ان کے ایک ناشر کی اس رائے سے کہ

''یوسف ظفر وہ پہلے اردو شاعر ہیں جنہوں نے بلینک ورس کو باقاعدہ آلۂ اظہار بنایا''

اتفاق ممکن نہیں کہ اس رائے کے پس منظر میں ہمیں وہ ادراک کارفرما نظر نہیں آتا جو دو مختلف زبانوں کے مختلف تہذیبی۔ معاشرتی اور تمدنی اجزائے ترکیبی کو نظر انداز نہیں کر سکتا انگریزی

شاعری میں بلینک ورس کو خود انگریزی زبان وادب کے مسلم الثبوت نقادوں نے اس لیے ہدف تنقید بنایا کہ اس میں نہ نثر جیسی سلاست ہے نہ نظم جیسی نغمگی بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ یہ صنفِ سخن قاری تک کو اس کے مطالعہ سے بیزار کر دیتی ہے بقول جانسن۔

" The disgust which blank.verse superads to an unpleasing subject repels the reader howsoever willing to be pleased"

یہی نقاد مزید ایک اور جگہ کہتا ہے:

"In balnk .verse there is neither the easiness of prose nor the melody of numbers and therefore, it is tiresome."

لیکن ہم ''کلیات یوسف ظفر'' میں ان کی نظموں کا مطالعہ کر کے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ان نظموں کی ہیئت و ماہیت ہمارے تمدن اور ہماری ثقافتی ترکیب نفسی سے ہرگز متصادم نہیں ہے ان نظموں کا صوری تاثر ردیف وقوافی سے ماورا شاعر کی تجربہ پسند افتاد طبع اور تخلیقی قدرت کا آئینہ دار ہے یوسف ظفر کی یہ نظمیں اس بلینک ورس کا عکس ہرگز نہیں جنہیں ہمارے بعض ''ترقی پسند'' شعراء نے اپنے لیے نمونہ بنا لیا بلکہ زیرِ نظر کلیات کی نظمیں جہاں ایک طرف ان کی بلاغت فکر کی نمائندہ ہیں وہاں شعری لطافت و نغمگی کا ایک مخصوص انداز لے ہوئے ہیں۔

یوسف ظفر مرحوم کی طویل ادبی زندگی میں بعض اہم سنگِ میل نظر آتے ہیں جنہیں وہ خود معرض اظہار میں لائے ہیں یعنی جوش ملیح آبادی کے ''کلیم'' سے بحیثیت منیجر وابستگی کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ ''انہیں کے ایماء سے غزل چھوڑ کر نظم کی طرف آیا'' اس طرح شہرت بخاری نے اپنی تصانیف ''ادبی آپ بیتی'' اور ''کھوئے ہوؤں کی جستجو'' میں ۱۹۴۰ء کی دہائی میں لاہور کا جو منظر نامہ پیش کیا ہے اور جس میں ان کی احسان دانش سے قرابت بطور خاص نمایاں ہے وہ بھی یقیناً ان کے ادبی سفر کا ایک اہم سنگ میل ہے۔ ادبی صحافت نے ان کے ادبی رجحانات کی تربیت و پرورش میں نمایاں کردار ادا کیا چنانچہ بجا طور پر ڈاکٹر وزیر آغا نے انہیں ''حرکت وحرارت کی مثال'' قرار دیا۔ اور سید ضمیر جعفری نے انہیں اردو شاعری کو ''انیسویں صدی سے بیسویں صدی

میں لانے'' کے اعزاز کا مستحق قرار دیا۔

''صدا بصحرا'' اور ''حریم وطن'' ان کے یہ دونوں شعری مجموعے ۱۹۶۱ء میں منظر عام پر آئے۔ موخرالذکر کے ''دیباچہ'' میں مختار صدیقی لکھتے ہیں:

''جناب یوسف ظفر کا نیا مجموعہ 'حریم وطن' اس ملی شعور کی ایک گراں بہا کڑی ہے جسے حالی کی دردمندی اور بصیرت اردو شاعری میں لائی تھی اور جسے اقبال کے عظیم ذہن اور آفاقی فنکاری کی بدولت عالمگیر پہنائیاں نصیب ہوئیں تھیں۔''

ایک سال بعد ہی انکی غزلیات کا مجموعہ ''نوائے ساز'' شائع ہوا جس کا پیش لفظ شاعر کے تصور غزل کا غماز ہے۔ فرماتے ہیں:

''میں نے اپنے معاصر بن کے رنگ غزل کو دیکھا تو مجھے ایک دھچکا لگا۔ غزل کے لطیف پیکر میں ایسے عناصر داخل ہوئے جن کا تصور بھی میرے لیے سوہان روح تھا۔ میر و غالب کا سرمایہ غزل محض جہالت اور کم نظری کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو رہا تھا۔ داغ و امیر نے غزل کو جس سطح پر کھڑا کیا تھا اس سے بچا کر حسرت موہانی۔ اصغر گونڈوی۔ فانی بدایوانی اور اقبال نے اسے جو مقام عطا کیا تھا وہ بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ غرض میرے پیش روؤں کی تمام محنتیں اکارت جا رہی تھیں۔ غزل میں سطحیت اور تنگ نظری در آئی۔ اور مجھ پر اور میرے ان معاصرین پر جنھوں نے نظم کو نئے اسالیب کا پیکر دیا یہ الزام بھی تو تھا کہ ہم لوگ غزل نہیں کہہ سکتے۔ اس لیے اس پیرایۂ اظہار کو اپنائے ہوئے ہیں ماحول کے تقاضے۔ غزل کی بے بسی اور اپنی ذات پر الزام۔ یہ سب باتیں مل کر ایک تحریک بن گئیں اور میں نے ۱۹۴۴ء سے باقاعدہ طور پر غزل کہنا شروع کر دی۔''

ہم محسوس کرتے ہیں کہ یوسف ظفر مرحوم نے غزل کے حوالے سے جن تاثرات کا اظہار اب سے تقریباً ساٹھ برس پہلے کیا تھا غزل کے بارے میں اکثر لوگوں کا رویہ دیکھ کر آج بھی ان کی رائے سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں خوشی ہے کہ ان کے کلیات کی ترتیب و تدوین میں

ڈاکٹر تصدق حسین راجا نے جس محنت و کاوش سے کام لیا ہے اس نے یوسف ظفر کے فکر و فن کو ایک بار پھر زندہ کر دیا ہے وہ اپنی اس پر خلوص کاوش پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اب کچھ نمونے استاد یوسف ظفر کے فکر و فن کے جن میں چند اقتباسات ان کی رحلت کے بعد شائع ہونے والے مجموعۂ نظم و غزل ''عشق پیچاں'' سے بھی ہیں۔

زمانہ مدفنِ ایّام ہے خموش رہو — نہ جانے کون ہماری صدا کو سنتا ہو
بھرم کھلا ہے تو ہر اک کو ایسے دیکھتا ہوں — کہ جیسے میں نے کبھی آدمی نہ دیکھا ہو
دھڑکتے دل کی صدا بھی عجیب شے ہے ظفر — کہ جیسے کوئی مرے ساتھ ساتھ چلتا ہو
ہزار غنچہ دہن تھے ہزاروں شعلہ سخن — بھرے چمن میں ترا رنگِ گفتگو نہ ملا
روش روش ہیں گلوں کی طرح نقوشِ قدم — وہ کون لوگ تھے جو ہم سے پیشتر آئے
ہر نفس جب خلشِ رفتہ و آئندہ ہو — کس کی موت آئی ہے اے دل کو یہاں زندہ ہو
میں ترا نقشِ قدم ہوں اے دوست — اپنے انداز سے پہچان مجھے
کوئے وفا میں جب کوئی نغمہ سرا ہوا — میں رو دیا کہ زخمِ محبت ہرا ہوا
محرابِ افق میں وہ ستارہ ہے پریشاں — شبنم بھی جسے چاہتی ہے اور صبا بھی
غنودہ رنگوں میں لپٹے ہوئے ہیں خواب کئی — وہ حسن ہے کہ ہیں جلوے کئی حجاب کئی
دھڑکنا سیکھ ستاروں سے اے دلِ ناداں — کہ ان کی راتوں نے دیکھے ہیں ماہتاب کئی

(جولائی۔ستمبر ۲۰۰۵ء)

پرداخت (شعری مجموعہ)

سیّد مشکور حسین یاد

''برداشت'' کے بعد سیّد مشکور حسین یاد کی غزلوں کا دوسرا مجموعہ ''پرداخت'' بھی مختصر وقفے کے بعد منظر عام پر آگیا ہے جس کے بارے میں وہ خود کہتے ہیں کہ اس میں آج کی غزلیں زیادہ ہیں اور ماضی کی بہت کم اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ وہ اپنی غزلوں سے اس قدر مطمئن نہیں جتنا کہ ہونا چاہیئے یعنی اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ ''برداشت و پرداشت'' کے ہم قافیہ الفاظ جب تک ختم نہ ہو جائیں یاد کے مجموعہ ہائے شعری برابر وارد ہوتے رہیں گے یہ اس لیے بھی بعید نہیں کہ فنی و فکری ایجاد و اختراع کے جس سیلِ بے مہار کو ان کا ذہن جنم دے چکا ہے وہ آمد و آورد پر ان کی یکساں گرفت سے مزید مہمیز ہو گیا ہمیں خود اس کا تجربہ اس طرح ہوا کہ ''پرداخت'' کی سرسری ورق گردانی نے ہمیں سطر سطر ہی نہیں حرف حرف پر چونکا چونکا دیا اور ہمارے حافظے پر مدتوں پہلے نظر سے گزرا ہوا یہ شعر دستک دینے لگا۔

ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی　　　طرح نو افگن کہ ما جدّت پسند افتادہ ایم

شعر کی ہئیت و ماہیت دونوں پر یاد کی سفا کانہ یلغار موثر و کارگر نظر آئی۔ شروع ہی کی چند غزلوں میں ان کے ان اشعار نے ہمارے حیرت و استعجاب کو مطمئن کر دیا۔

پھر ہمیں اک نئے آغاز میں آنے کا ہے شوق　　　پھر شروعاتِ جنوں ساز میں آنے کا ہے شوق

میری آواز ہے یا روح کا گمنام گلاب　　　رنگ و بُو کو مری آواز میں آنے کا ہے شوق

یاد نے شعر کی روایتی ہئیت و ساخت ہی نہیں بلکہ ماضی بدوش مفہوم و معانی کی بھی کایا پلٹ کر رکھ دی ہے جن کا اندازہ تمام مجموعہ شعری میں جا بجا بکھرے ہوئے نو تخلیق ردیف و قوانی سے کیا جا سکتا ہے مثلاً

۱۔ غمِ نو بہ نو میں رہتا ہے　　یم نو بہ نو میں رہتا ہے
۲۔ بولے زبانِ ممکن و ناممکن آدمی　　آئے میانِ ممکن و ناممکن آدمی
۳۔ فزوں کی بازیافت　　جنوں کی بازیافت
۴۔ صورت میں واقعہ کچھ اور　　ولایت میں واقعہ کچھ اور

بعض ردیفیں مثلاً ''سانپ سونگھ جاتا ہے''۔۔۔''بھاگ رہے ہیں''۔۔۔''افق پہ ہے دل وجاں''۔۔۔''کس بل نکلے''۔۔۔''یا کوئی دھڑکن'' وغیرہ وغیرہ ماضی ہی کی شعری روایت سے نہیں بلکہ معاصر اسالیب غزل سے بھی ماورائیت ''پرداخت'' کی شکل میں یاد کی انفرادیت کی غماز ہے جسے ان کے ذہن رسا۔ مطالعے اور لفظ و معنی پر قادرانہ گرفت نے بنیاد فراہم کی ہے۔ جو لوگ شعر کہتے ہیں وہ جانتے ہے کہ بعض مشکل یا نامانوس ردیف وقوافی میں لفظی دروبست کی مکمل صحت اور مفہوم ومعانی کی ندرت کو برقرار رکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں اور مشکور حسین یاد نے اس بحرجاں گسل میں دانستہ غواصی اختیار کی ہے بقولِ غالب:

شمار سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا　　تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

چنانچہ یاد عہدِ حاضر کی شاعری کے ''بت مشکل پسند'' ہیں مگر اپنی مہارت فن سے بڑی بڑی مشکلوں کو آسان بناتے چلے گئے ہیں۔ چند شعر:

اُسے ڈراتے ہو کیا کاکُلِ حقائق سے　　جو مشکلوں کے غمِ نو بہ نو میں رہتا ہے
سحر سحر ہوئے جاتے ہیں حرف حرف کے ساتھ　　سخن سخن سے اُبھرنے کی ہوگئی عادت
ہمارے گریہ کی سعیٔ مرادمت پوچھو　　بس ایک قطرہ سے دریا کا سینہ چیرنا ہے
اُسے جو دیکھا تو ہر جسم اک طلسم میں تھا　　بدن بدن گئی اس خوش بدن کی ایک خبر
قید میں عقدۂ تقدیر کے کس بل نکلے　　میرے پاؤں پڑی زنجیر کے کس بل نکلے

''میرے پاؤں پڑی زنجیر کے کس بل نکلے'' یہ مصرعہ کہنا صرف ایک ایسے ہی شاعر کا کام ہوسکتا ہے جو زبان کے رموز و نکات پر قدرت رکھتا ہو۔ غزل کا مزاج اور آہنگ یاد کے

یہاں بالکل بدلا ہوا لگتا ہے۔ ساخت اور متن دونوں اعتبار سے اس نوع کی سعی ان کے بعض ہم عصروں کے یہاں بھی ملتی ہے لیکن جہاں جہاں معانی آفرینی کی جہت بلاغت سے محروم اور ساختیات پر گرفت کمزور ہے وہاں یاد جیسا اسلوب پیدا نہیں ہو سکا ہے۔ یہی یاد کا اختصاص و امتیاز ہے۔ چند مزید مثالیں

نفس نفس پہ زمانے تراشتے رہئے
بہائے جاں کے بہانے تراشتے رہئے

یہ سنگ و خشت بھی جوہر سرشت ہیں مشکور
خزف خزف سے خزانے تراشتے رہئے

بنا ہے عالمِ فانی کہ میں رہوں باقی
یہی ہے رمزِ معانی کہ میں رہوں باقی

یہی ہے تیری حکایت کہ تو ورائے دوام
یہی ہے میری کہانی کہ میں رہوں باقی

ہماری کھینچی ہوئی اک لکیر ہے تقدیر
خدائے مانی و بہزاد ہو رہے ہیں ہم

پوچھو نہ عاشقوں کی شب ہجر کا جمال
سب رنج و غم ستارہ و مہتاب ہو گئے

بھلا مجھے کوئی کیسے شکست دے سکتا
میں کج کلاہِ تمنا تھا کامیاب رہا

''کج کُلاہِ تمنا'' جیسی خوبصورت تراکیب سے ''پرداخت کا صفحہ صفحہ مرصّع نظر آتا ہے۔ بلکہ بعض جگہ نئے نئے الفاظ تراشے گئے ہیں جو لفظیات شعری کے دامن کو مزید وسعت دیتے ہیں۔ یاد کا زیرِ نظر مجموعہ شعر کی دنیا میں اجتہاد کا مرقع ہے ایک سو سے زیادہ غزلوں پر مشتمل تجربہ و مشاہدہ کا امتزاج اور روایتی فکر و فن سے ماورائیت بعض ناقدین کے نزدیک ایک بے جواز جسارت ہو سکتی ہے لیکن یاد نے خود کو ایک ''عام شاعر'' قرار دے کر بھی ثابت کیا ہے کہ وہ روشِ عام سے ہٹ کر اپنے قاری کو تعمیق فکر کی دعوت دیتا ہے اور اپنی نو ذائقہ ''شرابِ سخن'' کو جام و سُبو بھی مختلف عطا کرتا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ حیران ہیں اور کہہ اٹھتے ہیں کہ ''حضرت آپ تو جن ہیں'' ڈاکٹر سلیم اختر، نے لکھا کہ مشکور کی شاعری، ''تیشۂ لفظ سے جادو تراشی'' کے مترادف ہے البتہ اس بار انھیں اسلم کمال جیسے باکمال فن کار کی مرصع کاری سے بھی مستفید ہونے کا موقع ملا ہے جو رنگوں اور خطوط کی شکل میں بھی ہے اور لفظ و معنی کے پیرائے میں بھی وہ کہتے ہیں:

''مشکور حسین یاد وہ خوش بخت شاعر ہے جو اپنے لب ولہجہ کی تازگی، تنوع اور ترفع میں ایک تخلیقی قوسِ قزح تعمیر کرنے کے لیے فنی لسانی اور ساختیاتی تجربات کے کٹھن مراحل سے گزرتے ہوئے حیرت ناک طور پر ایسا سالم وثابت نکلا ہے کہ وہ عصرِ رواں سے کٹا اور عہد رفتہ سے بچھڑا کہیں بھی دکھائی نہیں دیتا''

ہم البتہ اتنا کہنا چاہیں گے کہ مشکور جیسے نابغہ فن کار کو ابلاغ کی سہل کاری کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے قارئین کو کسی آزمائش میں نہ ڈالنا چاہئے اسلوب و معانی پر انہیں جو قدرت حاصل ہے وہ ان کا سرمایۂ فن بھی ہے اور متاعِ ذات بھی۔ انہوں نے درست کہا ہے:

دھوپ کو اپنے سائے میں لے کر آندھیوں کو غلاف کرتے چلو

(جولائی۔ستمبر ۲۰۰۵ء)

دوسرا ہمالہ (شعری مجموعہ)

شبنم رومانی

شبنم رومانی نے اپنے تازہ مجموعہ کلام ''دوسرا ہمالہ'' کی نقاب کشائی اس شعر سے کی ہے:

موسموں کی سازش کیا وقت کی نوازش کیا — عشق اپنی فطرت میں دوسرا ہمالہ ہے

زیر نظر مجموعہ کا نام جہاں اس شعر سے ماخوذ و مستعار نظر آتا ہے وہاں شعر کا لفظی دروبست معنوی و تخلیقی ندرت اور صوت و آہنگ کی نغمگی ایک ایسے شاعر کے تازہ و پرکار ذہن کی غمازی کرتے ہیں جس کا خالق شبنم رومانی جیسا شاعر ہی ہوسکتا ہے جو متعدد دہائیوں کے دقیقہ رس تجربہ و مشاہدہ کے عمل سے گزر چکا ہے۔ دیگر تصانیف میں ''جزیرہ'' اور ''تہمت'' کو قبل ازیں اہل دانش اور صاحبان ذوق کی طرف سے جو پذیرائی مل چکی ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ ''دوسرا ہمالہ'' کا آغاز روایتاً حمدیہ و نعتیہ نظموں سے کیا گیا ہے اور اس کے بعد منفرد لب و لہجہ کی آزاد و مقفیٰ منظومات اور تشبیہ و استعارہ کی نئی جہتوں سے مرصع غزلیات کا دبستان کھلتا ہے جسے ڈاکٹر محمد علی صدیقی ''نوائے سروش'' سے تعبیر کرتے ہیں ثبوت میں شاعر کے صریر خامہ کے نتیجۂ تخلیق کے طور پر درج ذیل اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں۔

ستم ظریفیٔ معنی کا شاخسانہ ہوئی — غزل بھی جدت افکار کا بہانہ ہوئی

بھٹک رہی ہے کسی اجنبی قلمرو میں — وہ رو جو ذہن سے سوئے قلم روانہ ہوئی

شب چراغ کر مجھ کو اے خدا اندھیرے میں — سانپ بن کے ڈستا ہے راستہ اندھیرے میں

جب بھی بند کیں آنکھیں کھل گئیں مری آنکھیں — روشنی سے گزرا ہوں بارہا اندھیرے میں

زمیں کو فتح کیا آسماں کے پار گئے — مگر بدن کے تقاضوں سے ہار ہار گئے

خزاں خفیف خود اپنی برہنگی سے ہوئی — شجر تمام لباس ادب اتار گئے

ڈاکٹر صدیقی شبنم کو ''حسیّت'' کا شاعر قرار دیتے ہیں جو درست ہے لیکن حسیّت کو لفظ و معنی کا جو لباس فاخرہ عطا کرنے کی شبنم میں صلاحیت ہے وہ اتنی برملا اور چونکا دینے والی ہے کہ ان کی اس فنکارانہ جہت سے کوئی متعصب ترین ناقد بھی انکار نہیں کر سکتا ہمارے مطالعہ میں آنے والے درج ذیل اشعار اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

اس قدر تشنگی کہ دم ٹوٹے
وقت ہے اب کہ جام جم ٹوٹے

پھر بھی روداد جاں ادھوری ہے
انگلیاں گھس گئیں قلم ٹوٹے

اس کے ہاتھوں سے آئینہ تمثال
فرش پر گر کے آج ہم ٹوٹے

یادوں کے یہ جگنو مری آنکھوں میں نظر بند
دیکھو مرے آنسو مری آنکھوں میں نظر بند

چہرہ کا وہ اک پھول ہے اب تک تر و تازہ
اب تک ہے وہ خوشبو مری آنکھوں میں نظر بند

چپ چاپ سر دشتِ غزل سوچ رہا ہوں
کیسے ہو یہ آہو مری آنکھوں میں نظر بند

شبنم رومانی کا اقلیم شعر و ادب میں دورانیہ اتنا طویل ہے کہ انکا تعارف یقیناً قارئین کی تین نسلوں پر محیط ہونا چاہیے وہ ایک قلمکار کی حیثیت سے قابل رشک مقام و منصب کے حامل ہیں ان کی شاعری ایک مدت سے ناقدین اور تجزیہ نگاروں کا مجبوب ہدف بنی رہی ہے جس میں اندرون ملک اور بیرون ملک بتدریج اضافہ ہو رہا ہے زیر تبصرہ کتاب امریکہ میں ڈاکٹر ستیہ پال آنند جیسی ادبی شخصیات کے لیے جاذب توجہ ثابت ہوئی ان کا تجزیہ نہایت بلیغ و پُر معنی ہے انہوں نے شبنم کی نظموں پر خصوصی توجہ دی ہے اور اپنے مخصوص انداز میں شاعر کے فکر و فن کے وہ اُفق واضح کیے ہیں جو مواد اور موضوع کو نت نئے سانچوں میں ڈھالنے پر شبنم کی قدرت و مہارت کو ظاہر کرتے ہیں۔ ستیہ پال آنند شاعر کے تصویری پیکر کے فن سے متاثر نظر آتے ہیں اور یہ فن انہیں شبنم کی نظموں میں اپنے نقطۂ عروج پر نظر آتا ہے لیکن اس کے ساتھ غزل گوئی کے حوالے سے کہتے ہیں کہ:

''وہ غزل کے اس مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں جس مین نصابی مضامین کلاسیکی بھی ہیں اور عصری بھی۔ وہ دونوں سے اس حد تک متاثر ہیں کہ وہ ان کا دامن ترک نہیں کر سکتے۔''

اس نقطہ نظر سے ہمیں بھی ایک حد تک اتفاق ہے لیکن ہم اس قدر اضافہ کرنا چاہیں گے کہ کلاسیکی وعصری مضامین کو شبنم نے اپنی تازہ کاری سے مستقبل کی امانت بھی بنا دیا ہے ماضی سے ان کی خوشہ چینی سے عصری اقدار کو متمول بنانے کا عمل کچھ اس انداز سے تشکیل پا رہا ہے جس سے مستقبل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا یہی شاعری کی فکری عظمت کی دلیل ہے ملاحظہ ہو:

اک طنز بھی نگاہِ سخن آفریں میں تھا
ہم پی گئے مگر یہ سلیقہ ہمیں میں تھا

خوشبو کسی طرح بھی نہ آئی گرفت میں
کیا حسنِ احتیاط مرے ہم نشین میں تھا

چاند جب نکلا اُفق پر تری انگڑائی کا
وہی لمحہ تھا مری تیری شناسائی کا

ہم تری راہ میں خونِ رگِ جاں سے اکثر
سرخ قالین بچھاتے ہیں پذیرائی کا

یہ فیصلہ گل نکہت مآب میں نے کیا
بھرے چمن میں ترا انتخاب میں نے کیا

دیگر اوصاف کے علاوہ ہمیں جس بات نے شدید متاثر کیا ہے وہ فن شعر کے بارے میں شبنم رومانی کا نہایت سنجیدہ رویہ اور تخلیقی کاوش کی تہذیب و تربیت ہے جو ان کے کلام میں شائستگی اور لطافت و پاکیزگی کی ضامن ہے۔

(جولائی۔ستمبر ۲۰۰۵ء)

خاک (شعری مجموعہ)

ریاض مجید

ریاض مجید سے ڈاکٹر ریاض مجید تک آج کم وبیش چار دہائیوں کی مسافت درمیان میں ہے ایک نوجوان ونوخیز شاعر جو چالیس برس پہلے کے لائل پور میں اپنا لب ولہجہ سب سے الگ رکھتا تھا۔ حساس، صاحب نظر''پُر اعتماد وخود آ گاہ ہی نہیں بلکہ اس کی شخصیت کی تشکیل مین ماضی و حال کا گہرا شعور اور مستقبل پر کمند افگنی کا واضح رجحان ہی نہیں فنکارانہ سلیقہ بھی موجود تھا۔ ثبوت آج اُس کی ایک درجن سے زیادہ وہ تخلیقات نظم ونثر ہیں جو اردو اور پنجابی میں نعتیہ کلام، نظم و غزل اور تنقید کے علاوہ پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے (اردو میں نعت گوئی) پر مشتمل ہیں، عمر کی اس منزل میں تجربہ ومشاہدہ نے (ڈاکٹر) ریاض مجید کو ادراک وشعور کی جو پختگی اور وجدان کی جو وسعت عطا کی ہے اس کی تازہ شعری تخلیق ''خاک'' میں دیکھی اور محسوس کی جاسکتی ہے۔ نقطۂ آغاز حمد باری تعالیٰ اور حیطۂ پرواز اسّی پچاسی غزلوں سے بھی متجاوز! ایک درجن مزید تخلیقات نظم ونثر کے زیر طبع ہونے کا اعلان ان ''مستقبلیات'' میں حمد ونعت اور نظم وغزل ہی کا تسلسل نہیں بلکہ ''لغتِ نعت، فرہنگ بحور اور فرہنگ قوافی'' جیسی تصانیف بھی شامل ہیں جو مصنف کے علم وفن کی غماز ہوں گی گویا ایک سکالر اور شاعر کی شخصیت کا امتزاج مصنف کی پہچان بن گیا ہے زیر نظر غزلیات کا مجموعہ ''خاک'' نام کے اعتبار سے بہ نگاہ اولیں پھیکا پھیکا سا لگا مگر کتاب کو تہہ کیا تو بیدل کا یہ شعر نظر میں روشنی بن کر سما گیا اور نام کے انتخاب پر مصنف کو داد دینا پڑی۔

ادب نہ کسب عبادت نہ سعی حق طلبی ست　　　بغیر خاک شُدن ہر چہ ہست بے ادبی ست

اسی کے ساتھ ایک غزل میں ریاض مجید کے ناقدانہ تفکر کے ترجمان اور تہذیب ذات کے نمائندہ یہ دو شعر بھی نظر آئے

سخنِ زیرِ لب سے خوف زدہ ہوں میں عرضِ طلب سے خوف زدہ
کوزے، کوزہ گروں سے ڈرتے ہیں ادب ، اہل ادب سے خوف زدہ

ماضی کا 'شعور' صحت مند روایات کا احترام اور اقدار کی پذیرائی شاعر کی صفاتِ برملا بن کر قاری کو متوجہ ہی نہیں متاثر بھی کرتی ہیں چند شعر:

بس ان کے سینوں میں اک چیز دل کے نام کی تھی ہمیں کچھ اور نشان سلف نہیں معلوم
کس انتشار کے جنگل میں بھٹکی نسل ہیں ہم ہمیں ہمارا مقام اور صف نہیں معلوم
ہیں سر بلند ریاض اعتبار رفتہ سے ہیں اپنی جیب میں دُر یا خذف نہیں معلوم
کوئی فضیلت نسبت کوئی نشانِ نسب حوالۂ اَب وجد کی بہت ضرورت ہے

'حوالۂ اب وجد کی ضرورت ، اور ''اعتبار رفتہ'' سے ''سر بلند'' ہونے کا احساس شاعر کی فکر کا طرۂ امتیاز ہے جب کہ اس کے پس وپیش ایسے ''کاریگرانِ شعر'' بھی صف بہ صف نظر آتے ہیں جو ماضی بیزاری کو وجہ افتخار سمجھتے ہیں اور تجربہ وتخلیق کے نام پر وہ نام نہاد ادب سے قرطاس وقلم کو آلودہ کر رہے ہیں جسے بیدل کی زبان میں ''ہر چہ ہست بے ادبی ست'' ہی کہا جا سکتا ہے۔ ریاض مجید کے ذہن میں یقیناً ایسا ہی کوئی تضاد ہدف فکر بنا ہوگا جب اس نے کہا:

عظمت رفتہ کا پندار لیے پھرتے ہیں سر نہیں ہاتھ میں دستار لیے پھرتے ہیں
وقت ہنستا ہے ہماری خرد افروزی پر خواب میں دیدۂ بیدار لیے پھرتے ہیں
اسی سماج کے پروردہ ہم بھی تم بھی مگر تم اس کے ساتھ ہم آواز اور ہم بیزار

ریاض مجید پوری فکری توانائی اور وجدانی استعانت سے عصر رواں کی بے لگام جہتوں پر بھی وار کرنا چاہتا ہے جس کا ثبوت اس کے کلام میں جا بجا ملے گا۔

زبان حال سے کہتے ہیں زخم کے پہلو کہیں قریب ہے قاتل زیادہ دُور نہیں
سکوتِ لہجہ ولب سے سراغ ملتا ہے کہ عہدِ طوق و سلاسل زیادہ دور نہیں

عجیب لوگ تھے شب زادگان و تیرہ نژاد ۔۔۔ جو خود کو روشنی کے نکتہ داں سمجھتے تھے
امیر شہر ہی آئی رتوں سے تھا لاعلم ۔۔۔ سب اہل شہر ہوا کی زباں سمجھتے تھے

اپنی شاعری کے اس واشگاف عمل جراحی کے نتیجہ میں ایک مبنی بہ غلاظت سماجی نظام سے ''خاک'' کا شاعر خوف زدہ ہرگز نہیں بلکہ اُس کی عقابی نگاہیں حال ہی میں پیوست نہیں بلکہ مستقبل کا سینہ چیرتی بھی دکھائی دیتی ہیں وہ سمجھتا ہے کہ حق گوئی کے نتیجہ میں ایک سفا کانہ ردعمل ضرور اس کا تعاقب کرے گا مگر بہ ایں ہمہ وہ کہتا ہے:

ہم اہلِ عشق کی تقدیر لکھی جا چکی ہے ۔۔۔ ہمارے بخت میں زنجیر لکھی جا چکی ہے
جگہ کا، دن کا، تعین ریاض باقی ہے ۔۔۔ ہمارے قتل کی تحریر لکھی جا چکی ہے
ہر اک کے ہاتھ پہ اک بے گناہ کا خوں ہے ۔۔۔ تمام لوگ ہی قاتل ہیں اس کہانی میں
بہت بیزار ہیں اشرافیہ کی رہبری سے ۔۔۔ کوئی انسان کوئی خاک زادہ چاہتے ہیں

''کوئی انسان کوئی خاک زادہ چاہتے ہیں'' ایک دردمند دل سے اُبھری ہوئی ایسی آواز ہے جسے ''سفا کی دوراں'' کا تجزیہ کرنے والا کوئی بھی مورخ نظرانداز نہیں کرسکتا۔ البتہ ''خاک'' کے شاعر کا لب ولہجہ باغیانہ نہیں کہا جاسکتا اُس کا اُسلوب اظہار دردمندانہ ہے جو اُس کی شخصیت کے نرم وگداز پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہی نہیں عجز وانکسار شاعر کی تہذیب نفس کے ضامن عناصر دکھائی دیتے ہیں مگر اس طرح کی ایمان وایقان کی چٹان شاعر کی شخصیت کے گرد آئینی حصار بن گئی ہے۔ مثلاً

نہ اضطراب نہ عجلت نہ انتشار نہ خوف ۔۔۔ بڑے مزے سے ہیں، ہیں جب سے آخری صف میں
ہمارے اشک ہیں افتادگانِ خاک کے اشک ۔۔۔ چمک رہے ہیں جو کوکب سے آخری صف میں
کچھ اور دن یہ حوالے ہیں ربط ونسبت کے ۔۔۔ ہم اہلِ عشق ہیں نام ونسب کے آخری لوگ

''ربط ونسبت'' کے حوالے شاعر کی تربیت و پرورش کا فیضان ہیں وہ ان حوالوں کے تیزی سے معدوم ہوتے جانے پر زیاں کے شدید احساس کرب سے دوچار ہے لگتا ہے کہ ''شاعرِ

خاک''، واقعی قدیم وجدید کے درمیان ایک ربطِ معنوی ہے جس کے غماز ایک طرف اس کے شعری موضوعات ہیں اور دوسری طرف عہدِ نو کے ادراک و احساس کی وہ لطیف سرسراہٹ جو اس کے لہجہ و اسلوب سے ظاہر ہوتی ہے۔

بہت اداس ہیں دنیا کے چل چلاؤ پہ ہم
سمٹتا جاتا ہے تیزی سے حلقۂ احباب

مرا اپنا دمِ واپسیں ہے کوئی نہیں
کھلا کہ سانس کی میراث بھی پرائی ہے

ریاض مجید کی شاعری توانا فکر کی نمائندہ اور اسلوب کی نئی جہتوں کی نقیب ہے انہوں نے فکر و فن کے ریگزار پر اپنے نقوشِ پا ثبت کر دیئے ہیں جو موجودہ و آئندہ اذہان کو نئی وسعتوں سے ہمکنار کر سکتے ہیں، ان کا زیرِ نظر مجموعہ شعری چونکہ سال ۲۰۰۴ء کے آخری دن منظرِ عام پر آیا اس لیے اسے سال ۲۰۰۴ء کا حرفِ آخر بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

(جولائی۔ستمبر ۲۰۰۵ء)

باب فضیلت (شعری مجموعہ)

خُرّم خلیق

''باب فضیلت'' خرم خلیق کا پہلا شعری مجموعہ ہے جس کا آغاز حمد باری تعالیٰ سے ہوتا ہے اور کتاب کے باقی صفحات ۴۵ نعتوں اور ۲۸ سلام ومنقبت پر مبنی منظومات سے مزین ہیں کتاب کی ترتیب وتدوین اور طباعتی تزئین کا انداز ثقاہت ومتانت کا آئینہ دار بھی ہے اور حسن ودلکشی کا مرقع بھی شعر کی دنیا میں نقشِ اول ثبت کرنے کا یہ والہانہ قرینہ صاحب تصنیف کے مذہبی ذہن کی طہارت وشیفتگی کا غماز ہے اور وہ اس لیے بھی کہ وراثت شعری کے حوالے سے انہیں ''نجیب الطرفین'' کہا جا سکتا ہے۔ ان کے والد گرامی جناب خلیق قریشی مرحوم کو دیگر اصنافِ ادب کے علاوہ حمد ونعت اور سلام ومنقبت کے شعبہ میں ربِ تعالیٰ نے خصوصی صلاحیتوں سے نوازا تھا اور نام یعنی غلام رسول کی نسبت نے انہیں حُب رسولؐ کی دولت وثروت سے بھی مالا مال کیا تھا وہ ایک یگانۂ روزگار صحافی اور شمع آزادی کے قابل رشک پروانوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ دوسری طرف صاحب تصنیف خرم خلیق کو ادب وشعر کی وراثت ننھیالی وسیلوں سے بھی میسر آئی یہی وجہ ہے کہ ان کی شعر گوئی ایک خاص سلیقے اور باعتبارِ موضوع اُن کے جذباتِ احترام وعقیدت کی مظہر ہے۔ افتخار عارف صاحب نے شاعر کی اس نمایاں خوبی سے متاثر ہو کر کتاب کے فلیپ میں اظہار خیال کیا ہے۔

''خرم خلیق نے محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے جس شیفتگی اور وارفتگی کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کیا ہے وہ ایک ایک مصرعے بلکہ ایک ایک لفظ میں چھلکتا اور جگ مگ کرتا نظر آتا ہے۔''

میری قسمت میں محمدؐ سے محبت لکھ دی — شکر صد شکر مقدر میں فضیلت لکھ دی
نذر محبوبؐ تو معراج میں کچھ کرنا تھا — لوح محفوظ پہ محشر میں شفاعت لکھ دی

اب دیکھیے کہ شاعر کی سخن وری کا یہ سلیقہ فیضانِ نظر ہے کہ مکتب کی کرامت وہ خود لکھتے ہیں:

''سچے جذبوں کے سہارے اس راستہ پر آ گیا ہوں جس کی منزل مقصود بخشش ہے اس دروازے پر آ گیا ہوں جہاں سے کوئی سوالی خالی ہاتھ لوٹا یا نہیں جاتا۔ شکر ہے میرا سفر یقین کا سفر ہے۔''

مصنف کی اس تحریر کے پس منظر میں ایقان و ایمان اور جذب و کیف کا جو عالمِ سرمدی کار فرما ہے وہ زیرِ نظر مجموعہ کے ان اشعار میں خاص طور پر جلوہ ریز نظر آتا ہے۔

تپش تھی رنج و غم کی اس قدر صحرائے عالم میں — جو دامانِ نبیؐ سے دور ہوتا جل گیا ہوتا

آقا کے حسیں نقشِ کفِ پا مری منزل — خاکی ہوں مگر عرشِ معلیٰ مری منزل

ہوں راہِ صداقت کا میں خوش بخت مسافر — ہیں احمدِ مرسل مرا توشہ مری منزل

احمدؐ کی محبت کا خزینہ مرا دل — اس نام سے روشن مرا سینہ مرا دل

آنکھوں میں وہ اترے تو مکیں دل میں ہوئے — آنکھیں مری مکہ ہیں مدینہ مرا دل

خُرم کا نعتیہ کلام یوں تو ان کی عقیدت و ارادت کا پر نور مرقع ہے لیکن متعدد مقامات پر تاریخ اسلام کے حوالوں اور تلمیحی اشاروں سے بھی وقیع و منفرد نظر آتا ہے بلکہ لفظ ''یثرب'' کا استعمال حدیث نبویؐ کے سبب اور لفظ 'مدینہ' کے متبادل کے طور پر میسر آ جانے کے بعد متروک ٹھہرا ہے لیکن ''باب فضلیت'' کا شاعر پوری فنکارانہ مہارت کے ساتھ قبل و مابعد کے ادوار کو واضح کرتے ہوئے پورے اعتماد سے استعمال کرتا ہے۔

یثرب تھا کبھی جب نہ تھے اس دل میں محمدؐ — اب اُن کی سکونت سے یہ سینہ ہے مدینہ

اس طرح تلمیحی انداز بھی دیکھیے:

ابرہہ کا زور گرچہ سیکڑوں فیلوں میں تھا — معجزہ پر ربِ احمدؐ کا ابابیلوں میں تھا

روشنی ہی روشنی آدم سے تا ختم الرسلؐ — نورِ رب کا ضوفشاں ان ساری قندیلوں میں تھا

سلام و منقبت میں بھی خرم اپنا ایک مخصوص لب و لہجہ رکھتے ہیں جو ادب و احترام کے

جذبات سے مملو ہے چند نمونے:

بصد خلوص، بصد احترام جانتے ہیں　　　تمام لوگ علیؑ کا مقام جانتے ہیں

کوئی مقدس چمن ہے ایسا، نہ ایسا پاکیزہ پھول کوئی
نہ کوئی میرے رسولؐ جیسا، نہ مثل بنتِ رسولؐ کوئی
میں بلالؓ و بوذرؓ و سلمانؓ کے قدموں کی خاک
میں تو ہوں ان کے غلاموں کے غلاموں کا غلام

شکستِ شب کی خبر ہے سحر کا تارا ہے　　　حسین صبح درخشاں کا استعارہ ہے

خرم خلیق خوش نصیب ہیں کہ وہ حمد و نعت اور سلام و منقبت کی سعادت کے ساتھ اقلیم سخن میں وارد ہوئے ہیں:

دے کے یہ سلطنتِ عشق پیمبرؐ مجھ کو　　　کر گیا وقت مقدر کا سکندر مجھ کو

(جولائی۔ستمبر ۲۰۰۵ء)

شب نامہ (شعری مجموعہ)

خیال آفاقی

زیر تبصرہ کتاب ''شب نامہ'' کراچی کی کہکشانِ سخن کے کوکب نظرافروز پروفیسر خیال آفاقی کے شعری مجموعہ کی اشاعت ثانی ہے جو سال ۲۰۰۵ء میں نمو پذیر ہوئی۔ اکثر شعری مجموعوں کے پس منظر میں ایک جہانِ معنی کارفرما ہوتا ہے چنانچہ زیرِ نظر مجموعہ بھی اِس روایت سے متصف نظر آتا ہے جس کا ترجمان یہ شعر ہے:

شب نامہ رقم کیوں نہ کروں میں کہ خیال آج　　ہے عکسِ قلم پرتوِ آیاتِ مبینہ

مصرعہ ثانی میں شاعر کے موضوعاتِ فکر سے منسوب ایک بلیغ اشارہ موجود ہے جس کی صراحت کلام کے مطالعہ سے میسر آتی ہے چنانچہ طبع اوّل (۱۹۸۴ء) کے تقریظ نگار ڈاکٹر رفیق خاور بھی یہی نشان دہی فرماتے ہیں:

''خیال، اقبال اور اس کے ہم مشربوں کا شریک سفر ہے اس لیے کچھ اقبال کے زیرِ اثر جس کا پرتو جدید اذہان پر کافی گہرا ہے اور کچھ اپنی افتادِ طبع کے باعث اس پر حکیم اُمت کے ''سرودِ رفتہ'' کی خاصی چھاپ ہے''۔

لیکن ''شب نامہ رقم کرنے'' کا سراغ اور جواز خود صاحب کتاب کے مندرجہ ذیل الفاظ میں پوشیدہ ہے:

''۔۔۔دن کے اجالوں اور ہنگاموں سے جی اُچاٹ ہو گیا اور تاریک راتوں کی تنہائی اور خاموشی میں عافیت ملنے لگی۔ شب باشی نے مزہ دکھایا تو روح ایک نئے وجدان سے آشنا ہوئی پھر دل بول اٹھا، لفظوں کو زبان مل گئی اور شب نامہ رقم ہونے لگا۔''

یہی وجہ ہے کہ شاعر کے کلام کا مطالعہ شب بیداری کا احساس دلاتا ہے جس میں غنودگی کا

شائبہ تک نہیں ایک لگن جو کسی بھی نصب العین کی روح بن جاتی ہے شاعر کے اسلامی و دینی طرزِ فکر و احساس کی عکاس ہے۔ چنانچہ حصہ نظم میں جس کا آغاز حکیم الامت کے شعر ''اگر چہ بت ہیں۔۔۔'' سے کیا گیا ہے بیالیس اشعار پر مشتمل نظم بعنوان ''شب نامہ'' مصنف کی شعری مقصدیت کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے غالباً آفاقی صاحب کا یہی وہ توانا احساس ہے جس کی سرسراہٹ اُن کے کلام کا واضح امتیاز ہے ایک اور نظم ''دعائے انقلاب'' کے درج ذیل صرف دو شعر اُن کی مبنی بر عقیدہ شاعری کی ترجمانی کرتے ہیں:

نئی بہار نئے رنگ و بُو فراہم کر — حیاتِ نو کے پیامی مرے گلوں کے لیے
فروغ روح کو وہ آبرو فراہم کر — چراغ عصر جسے دیکھ کر طواف کرے

''شب نامہ'' کی ترتیب و تدوین بھی مصنف کے پاکیزہ عقائد سے مستعار ہے یعنی آغاز کلام حمدیہ اشعار سے کیا گیا ہے خصوصاً بیتِ اوّل:

مرے شانوں پہ رکھا ہے مگر بارِاماں تو نے — زمیں سے عرش تک کیا کیا بنائے ہیں نشاں تو نے

'باراماں' کا باریک نکتہ مخلوقات خداوندی میں عظمت آدم کی جانب رہنمائی کرتا ہے اور شعرِ فارسی سے شاعر کی مناسبت طبع کا اظہار بھی:

قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند — آسماں بارِ امانت نہ نتواست کشید

راقم الحروف کے خیال میں یہ بحث غیر متعلق ہے کہ شاعر کی افتادہ طبع کی کمند افگنی نظم پر زیادہ ہے یا غزل پر۔ اصل میں وہ ان امتیازات سے خود ہی محترز نظر آتے ہیں خاص طور پر غزل کے بارے میں درج ذیل شعر کے بعد کوئی ابہام باقی نہیں رہنا چاہیے۔

خود کلامی ہے حقیقت میں غزل کی تعریف — ایک مفروضہ ہے محبوب سے باتیں کرنا

شاعر کا استدلال خاصا وزنی نظر آتا ہے بایں ہمہ شعری ہیئت کے بارے میں روایت کا احترام اور کلاسیکی در و دبست شعری کا اہتمام ان کے کلام کا خاصّہ ہے اسلوب کے حسن کو

تلازمات اور تشبیہ واستعارہ کی جمال آفرینی سے دوبالا کرنے کی سعی نمایاں نظر آتی ہے مثلاً۔

کچھ اور دیر ستارے بکھیر دامن میں | کہ تیری شب سے گریزاں ہے آفتاب ابھی
زمیں کا قرض ادا کر گلوں کی پیاس بجھا | پکارتے ہیں تجھے نجم و ماہتاب ابھی
نکل کے دیکھ خیالوں کے رنگ زاروں سے | پسِ بہار حقیقت ہے محو خواب ابھی
پھر لبِ خورشید پر پھوٹی تبسم کی کرن | چشمِ نرگس پھر گئی تنویر شبنم کی طرف
اے نسیمِ صبح شاداں اے شمیم گلفشاں | آمرے ہمراہ! چلتے ہیں شب غم کی طرف
ہمراہ مہ و مہر بھی ہیں شام و سحر بھی | ہے کتنا دل آویز محبت کا سفر بھی
یہ کاہکشاں جیسے تری راہ گزر ہو | شاید ہے ترا نقشِ کفِ پا یہ قمر بھی

کاہکشاں کو رہ گزرا اور قمر کو نقشِ کف پا کہنا نعتیہ شاعری کا خوبصورت اُسلوب ہے جس کی مثالیں زیر نظر مجموعہ میں جابجا ملتی ہیں اور اسلامی فکر کے نمونے دلنشین شعری پیکر میں ڈھلے ہوئے ملتے ہیں ملاحظہ ہو:

کیوں لب شوق پہ جلتے نہیں نغموں کے چراغ | کیوں نہیں آتی لب طور سے آواز وہی
جائزہ لے، نہ کہیں تار نفس ہو ناساز | ورنہ آواز وہی ، نگہ وہی ، ساز وہی
مرا علم ہے کتابی ، مری فکر ہے نصابی | نہ شعار بوذری ہے نہ شعورِ بوترابی
تری مہربانیوں سے مرے روز و شب فروزاں | ترا ذکر آفتابی تری فکر ماہتابی
مجھے ڈر ہے اُٹھ نہ جائیں کہیں رنگ و بو کے پردے | تجھے کر نہ جائے رسوا کسی گُل کی بے حجابی

اور آخر میں یہ شعر اپنے نظر نواز ڈکشن کی مثال آپ ہے۔

نے پھول نہ پتہ نہ کوئی شاخ ہری ہے | جو کچھ ہے چمن میں مری شوریدہ سری ہے

(جنوری۔ مارچ ۲۰۰۶ء)

سورۃ العصر۔ قرآن حکیم اور جدید ترین نظریہ تاریخ

پروفیسر مشکور حسین یاد

پروفیسر مشکور حسین یاد ایک ایسا نام کہ گذشتہ نصف صدی سے بھی زیادہ مدت سے شعرو ادب کے قارئین کے لیے ایک مانوس علامت بن چکا ہے جس نے مختلف جہتوں میں تقسیم ہو کر کبھی انشائیہ نگاری میں خود کا منوایا۔ کبھی غزل کے حوالے سے شعری ماحول میں ارتعاش پیدا کیا اور کبھی تنقید و تجزیہ نگاری سے بعض چتونون کو شکن آلود کیا اور بعض کو خودافروز، بہرحال جہت کوئی بھی ہو یاد کی شناخت کا اگر کوئی ناقابل فراموش حوالہ ہے تو صرف اور صرف ادب و شعر۔ یہ الگ بات کہ ہر معروف شخصیت کی طرح انہیں بھی منفی و مثبت ہر دو انداز سے دیکھا گیا اس لیے وہ متنازعہ فیہ بھی ہیں۔ اور متفق علیہ بھی۔ اُن کی حالیہ تصانیف ''میر بلانوش''، ''مطالعہ دبیر''، ''مطالعہ انیس''۔ انیس کی شاعرانہ بصیرت''۔ ''غالب کی طبع نکتہ جُو۔'' ''غالب کا ذوق الٰہیات'' اور ''کلامِ اقبال کے عوامی اُفق'' کے علاوہ ان کے منفرد انداز فکر کے مجموعہ ہائے شعری ''داشت'' اور ''پرداشت'' پر اہل علم وخبر کا ردِعمل منظر عام پر آچکا ہے لیکن زیر تبصرہ تصنیف نے ان کے قرطاس و قلم کا رُخ بالکل ہی موڑ کے رکھ دیا ہے اور اُن کے آفاق فکر و نظر میں بالکل ایک نئے اُفق کا اضافہ کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے بعض ناقد و تجزیہ نگار خود کو ورطہ حیرت میں محسوس کریں کہ ادب و شعر سے مختلف بھی یاد کی کوئی جولانگاہ فکر و ہوسکتی ہے لیکن ہم اتنے متعجب بھی نہیں کہ یاد کی وسعت مطالعہ ہی نہیں بلکہ اُس موضوعاتی تنوع کو بھلا بیٹھیں جو اُن کی نصف صدی پر محیط تصنیف و تالیف کے شہ پاروں سے مترشح ہوتا ہے۔

سورۃ العصر کے حوالے سے قرآن حکیم اور جدید ترین نظریہ تاریخ کے زیر عنوان ان کی تازہ تصنیف اس اعتبار سے ان کی ماسبق تخلیقات کا معنوی تسلسل ہے کہ انہوں نے آغازِ تحریر ہی سے اختلاف و استراد کے امکانات کو درخورِ اتمنا نہیں سمجھا اور بیشتر مترجمین و مفسرین قرآن اور اہل

دانش کو آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ مذہب یا دین کے تناظر میں اُن کی یہ ''تازہ کاری'' انہیں مولانا یا علامہ کے لاحقے یا سابقے بھی عطا کر سکتی ہے اور انہیں مزید ''متنازعہ فیہ'' بھی بنا سکتی ہے کم وبیش ۱۴۰ اصفحات پر محیط یہ کتاب ۱۹ ابواب پر مشتمل ہے جن میں موضوعی تعلق کے حوالے سے جو ابواب توجہ طلب ہیں اُن میں ''قرآن کریم کا انسانی لب ولہجہ''۔ ''والعصر کے معانی اور ان کا اطلاق''۔ ''سورۃ العصر میں حرفِ انسان۔ حرف توجہ''۔ ''سورۃ العصر کا استثنائی پہلو''۔ ''قرآن کریم اور جدید ترین نظریہ تاریخ'' اور ''سورۃ والعصر اور انسان کی نفسیات'' شامل ہیں ویسے مصنف نے بالواسطہ مواد پر بھی مشتمل چند ابواب اضافہ کیے ہیں مثلاً ''جمہوریت میں ایمان''۔ ''عمرانیات اور ایمانیات''۔ ''ابنِ خلدون کا فلسفہ تاریخ'' اور ''قومیت اور تاریخ'' لیکن کتاب کو قرآن کے عام قاری سے معنون کرنے کے ساتھ ساتھ صاحبِ کتاب نے خودنوشتہ دیباچہ بعنوان ''حرفِ اعتراف'' میں عجز وانکسار کا برملا اظہار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ ''میں کوئی عالمِ دین ہوں نہ عربی زبان کا فاضل۔ ہاں عربی کی شُد بد ضرور رکھتا ہوں اور قرآن حکیم کا ایک عام قاری بھی ہوں''۔ تاہم انہیں شکوہ ہے کہ اہل دانش قرآن کے لب ولہجہ پر غور نہیں کرتے بلکہ اُسے ''دھندلانے'' کی کوشش کرتے ہیں اور انسان کو خوف زدہ کرتے ہیں جب کہ ''دل خوش کُن''۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان مجبور نہیں وہ نقصان سے بچنے کا اختیار رکھتا ہے۔

مصنف نے بہرکیف مولانا سید سلیمان ندوی کے ترجمہ کو معتبر گردانا ہے۔ مصنف قاری کو متوجہ کرتے ہیں کہ پہلی آیت میں زمانے کی قسم کھائی گئی ہے اور قسم کھانے کا نفسیاتی اثر انسانی ذہن پر اس طرح مرتب ہوتا ہے کہ وہ کسی اہم بات کو سننے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ قرآن زمانے کی قسم کھا کر بتاتا ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے لیکن وہ انسان گھاٹے میں نہیں جنہوں نے ایمان اور عمل صالح سے کام لیا ہے۔ مصنف نے مزید شرح اس طرح کی ہے کہ والعصر کی قسم کھا کر قرآن کریم نے تمام انسانی تاریخ کو اپنی مٹھی میں لے لیا ہے۔ لسانی اعتبار سے اس سے بڑا معجزہ حرفِ کُن کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ تاویلاً یاد صاحب کہتے ہیں کہ انسان گھاٹے میں ہے یہ کوئی طنزیہ آیت نہیں بلکہ اظہار ہمدردی کا ایک مخصوص انداز ہے۔

قسم کے علاوہ زیرِ نظر سورۃ میں قسم کھانے والا بھی قابل غور ہے مصنف کے نزدیک سورۃ العصر کا کمال یہ ہے کہ اس میں تاریخ کے بارے میں انسان کی ایک بہت بڑی غلط فہمی کو دور کر دیا گیا ہے یعنی اعیار و مکار لوگ راہِ راست پر چلنے والوں کی نسبت کامیاب رہتے ہیں چنانچہ یہیں یہ نکتہ پوشیدہ ہے کہ انسان کو اختیار بھی سونپا گیا ہے۔ انسان کا لفظ جس طرح سورۃ العصر میں آیا ہے اُس طرح کسی اور آیت میں نہیں انسانی تاریخ کے بارے میں قرآن حکیم کا نظریہ بہت جامع۔ ہمہ گیر واضح اور حقیقت افروز ہے جدید ترین نظریہ تاریخ کو مصنف کی زبان میں ''تاریخیت'' کہا جا سکتا ہے جو تمام تر تصدیق شدہ حقائق پر مبنی ہوتی ہے چنانچہ تاریخ وہ ہے جس کی شہادت دستیاب ہو۔ یاد اظہار تاسف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہمارے مفسرین اور اہل دانش نے اس اہم نکتہ پر غور نہیں کیا والعصر کہہ کہ قرآن نے تیزی سے گزرتے ہوئے ایک ایک لمحہ کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ پروفیسر مشکور حسین یاد نے قرآن حکیم کی جس مختصر سورۂ مبارکہ کا انتخاب کیا ہے اس کے امکانات، مضمرات اور تاویلات پر انہوں نے دلائل و براہین کی تکرار سے بھی گریز نہیں کیا اور جواز اً کہا ہے کہ اس طرح انہوں نے اپنے نقطہ ہائے نظر کو موثر بنانے کی سعی کی ہے حالانکہ ہماری عاجزانہ رائے میں اس کی چنداں ضرورت نہ تھی کہ قرآن حکیم کے موضوعات پر صدیوں سے اس قدر لکھا جا چکا ہے اور لکھا جاتا رہیگا۔ کہ کسی بھی نوع کا ابہام نہ ممکن ہے نہ وضاحت طلب بہر کیف موضوع کی حساس نوعیت اور وسیع و عمیق بصیرت قرآنی کی مقتضیات کے پیش نظر ہمیں اپنی بے بصاعتی کا شدید احساس ہے کہ ہم اس میں کسی بھی نقطہ نظر کو سند تائید و تردید دینے کی حیثیت نہیں رکھتے البتہ قرآن حکیم میں بار بار غور و فکر اور تدبر کی جو دعوت دی گئی ہے اس کے پیشِ نظر مصنف کو اپنی تفہیمات پیش کرنے میں حق بجانب تصور کرتے ہیں اور اہل علم سے توقع کرتے ہیں کہ نگارشات زیرِ تبصرہ کو کسی بھی اعتبار سے تحریفاتِ معنوی پر محمول کرنے کی بجائے انہیں موضوعاتِ قرآنی پر فکر و نظر مرکوز کرنے کی ایک سعی اخلاص تصور کیا جانا چاہیے۔ وما علینا البلاغ۔ (جنوری۔ مارچ ۲۰۰۶ء)

وقت جمع وقت (شعری مجموعہ)

رابعہ برنی

دکن کی مٹی میں شعروادب کی خوشبو ہمیشہ سے رچی بسی ہے بلکہ دیوانِ اردو کا مطلع اول وہیں مرتب ہوا چنانچہ دلی دکنی کا یہ شعر ایک جادواں حقیقت بن گیا ہے

تجھ لب کی صفت لعلِ بدخشاں سے کہونگا   جادو ہے تری نین غزالاں سے کہونگا

اسی طرح سراج اورنگ آبادی کی ''خبر تحیرِ عشق'' بھی غزل کے ارتقاء کا آج بھی ''باب نختین'' سمجھی جاتی ہے۔ رابعہ برنی کے فکروفن کا خمیر بھی اسی مٹی سے اُٹھا ہے وہ ولی نہ سہی لیکن اپنے کلام کے آئینہ میں دکنی روایت کی وارث نظر آتی ہیں ان کی تازہ ترین تصنیف ''وقت جمع وقت'' اُن کی فکر شعر کا نقشِ ثانی ہے۔ نقش اوّل ''پروازِ شوق'' کم وبیش دو دہائی قبل منصۂ شہود پر جلوہ بار رہ کر تاریخ کی گرد میں روپوش ہو چکا ہے۔ لیکن زیرِ نظر تصنیف کے تقریظ نگار پروفیسر مُغنی تبسم کے الفاظ میں ''شاعری زندگی کے فانی لمحوں کو اپنی گرفت میں لاکر جادواں بنا دیتی ہے'' چنانچہ اس قول کی صداقت کا احساس ''وقت جمع وقت'' کے مطالعہ سے واضح طور پر اُبھرتا ہے جس میں غزل کے باب کی پیشانی پر شاعر کا یہ فکر انگیز شعر مرقوم ہے:

جذبۂ شوق ہر اک راہ گزر سے گزرا   پر پرواز لیے شمس و قمر سے گزرا

اس شعر کے حوالے سے اگر شاعرہ کے تہذیبی وثقافتی پس منظر کی تہوں کو کریدا جائے تو اُن کی آغوشِ تربیت میں، ادراک وشعور کی نشوونما ایک ایسے ماحول کا فیضان نظر آتی ہے جہاں مکتب کی رسمی تعلیم سے پہلے ہی بچوں کو سعدیؒ کی گلستاں و بوستاں حرزِ جاں، بنادی جاتی تھیں اور دیوانِ حافظ سے فال نکالنا معمولات زندگی کا حصہ تھا لہٰذا زیرِ نظر تصنیف کی مصنفہ کے مذکورہ شعر میں اگر حافظ شیرازی کے درج ذیل شعر کا عکس نظر آتا ہے تو تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ یہ وجدان کی کرشمہ

سازی ہے:

گدائے میکدہ ام لیک وقتِ مستی بیں   کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

شاعرہ رابعہ برنی نے ''حرفِ تسلیم'' کے عنوان کے تحت اپنی شخصیت۔ تربیت، پرورش تہذیبی و معاشرتی پس منظر اور عہد بعہد شعرو ادبی رجحانات اور شخصیات سے اپنے ذہنی و فکری رشتوں پر نہایت دلنشیں انداز میں گفتگو کی ہے جس سے قارئین کو اُن کے کلام کے مفہوم و معانی سے بھی ماورا کار فرما عوامل کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے ایک مختصر سا اقتباس:

''میری شاعری، سمجھ بوجھ، سوچ بچار اور ذوقِ نظر کو اردو و فارسی کے مشہور شعراء نے استوار کیا ہے جیسے غالب و اقبال یا حافظ و سعدی اور خیام۔ اس کے علاوہ ترقی پسند شعراء سے بھی میرا قریبی ربط رہا ہے مثلاً مجاز، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری، سردار جعفری اور مخدوم محی الدین''

لیکن اس اکتسابی عمل کے سنگ ہائے میل میں چھ دہائیوں سے بھی متجاوز مدت پر محیط تجربہ و مشاہدہ کی ذاتی متاع کے علاوہ اُن کے قرطاس و قلم کو آب و تاب بخشنے میں اُن کا وہ گراں بہا ورثہ نمایاں دکھائی دیتا ہے جو اُن کے خانوادے کے صاحبانِ علم و فضل اور اہلِ فکر و نظر ہستیوں سے انہیں منتقل ہوا ان کے دادا سلطان حسن اپنے وطن مالوف موہان ضلع آناؤ (جوارِ لکھنؤ) سے دکن ہجرت کر آئے تھے چنانچہ اس ضمن میں رابعہ برنی کو ایک اعزازِ مزید یہ بھی حاصل ہے کہ وہ رئیس المتغزلین حسرت موہانیؒ کی بھتیجی ہیں اور جس طرح غالب نے یہ کہہ کر کہ ''غالب از خاکِ پاک تورانیم'' اظہار تفاخر کیا تھا حسرت مرحوم نے بھی اسی طرح یہ کہہ کر کہ ''ہے تعلق آخر ہم کو خاکِ نیشاپور سے'' اپنی اس نسبت کو واضح کر کے اپنی ذات کے حوالے سے ریسرچ کے نئے باب وا کر دیئے ہیں۔

رابعہ برنی کا زیرِ تبصرہ شعری مجموعہ جو سوا دو سو صفحات پر مشتمل ہے اسے منظومات، قطعات اور غزلیات کے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن میں نظموں کی تعداد سب سے زیادہ یعنی

۷۶غزلیں اور قطعات علی الترتیب صرف ۱۲۱اور ۱۰ ہیں جن سے یہ تاثر ملتا ہے کہ رئیس المتغز لین کی بھتیجی غزل کی نسبت نظم کی صنف سے قریب تر ہیں میرے خیال میں یہ تاثر ایسا غلط بھی نہیں جس کی واضح نشان دہی ان کے تقریظ نگار پروفیسر مغنی تبسم نے بھی کی ہے لیکن میرے تجزیہ کے مطابق ان کی افتادِ طبع کے جوہر اقلیم غزل میں زیادہ مسحور کُن نظر آتے ہیں جہاں ان کا معیارِ فکر مقدارِ شعر پر واضح برتری کا حامل ہے ان کی نظمیں اُن کے تجربہ ومشاہدہ کی غماز اور فلسفیانہ فکرو مطالعہ کی ترجمان ہیں اپنی بعض نظموں کے بارے میں وہ خود لکھتی ہیں کہ:

''نظم ''وجودیت'' میں ژان پال سارتر کی تلاش ذہنی کا ہلکا سا عکس نظر آتا ہے اور نظم ''خواب پریشاں'' میں کامو کے فلسفہ لاعینیت کی جھلک ملتی ہے۔''نظام قدرت'' میں شوپنہار کی قنوطیت پرستی کی کیفیت نظر آتی ہے تو ''تہذیب انسانی'' میں برٹرنڈ رسل کی آہٹ کا احساس ہوتا ہے اور ''فطرت انسانی میں ڈاستاوسکی کی انڈرورلڈ کی لَے۔سنائی دیتی ہے۔''

مزید یہ کہ نظموں کی فنی ہئیت غزل کے پیکر سے نہ صرف مشابہہ ہے بلکہ مزاج وآہنگ کے اعتبار سے بھی تغزل بداماں محسوس ہوتی ہے۔پہلی نظم جس کا عنوان کتاب کا عنوان قرار پاتا ہے۔ ہر چند کہ بہ اعتبار ساخت ردیف وقافیہ سے بے نیاز ہے۔لیکن ڈکشن غزل کی لطافت وایمائیت کا غماز ہے۔مثلاً

پیار کی بات
وفا کی سوگند
تیرے انفاس کی خوشبو
تری قربت کے چراغ
جن سے سرشار چمن زارِ بساطِ دل وجاں

دو اور نظمیں جن پر فکر فلسفہ غالب ہے ہیئت میں غزل کی روایت کے قریب اور کلاسیکی طرز

اظہار کی حسین مثالیں ہیں نظم ''اکیلی رات'' کے دو شعر:

آج کی رات ہے میری　　　　رات کیا کائنات ہے میری
رات ادراک ذاتِ کامل ہے　　　　جس میں میرا وجود شامل ہے

دوسری نظم ''وجودیت'' سے ایک بند:

جب میں آغوش عدن چھوڑ کے باہر آئی　　　　آخری بار ترے جبر کا بندھن ٹوٹا
کتنی سرشار ہوں آزادہ روی میں اپنی　　　　دونوں عالم مرے قدموں کے نشاں ہیں گویا

بہر حال غزل کے ضمن میں اب چند مثالیں ایسی کہ جن سے رابعہ برنی کے فکر و احساس کی وسعت اور لفظوں کے دروبست پر قدرت کا تاثر نہیں ملتا بلکہ موضوعات و مضامین کا تنوع اُن کے تجربہ و مشاہدہ کی باریکیوں اور لطافتوں کی غمازی بھی کرتا ہے ملاحظہ ہو۔

کبھی خوشبو، کبھی نغمہ تو کبھی سایہ نُور　　　　خوب مہکا تری یادوں کا شجر آخر شب
بام مہتاب سے اترا کوئی آہستہ خرام　　　　لب گلگوں پہ لیے ذکر سحر آخر شب
چپکے چپکے میری تنہائی غم کو چھو کے　　　　چاند تاروں نے کیا عزم سفر آخر شب
رات افسانہ بنی صبح کے ہوتے ہوتے　　　　رقص پروانہ ہوا رقصِ شرر آخر شب
پھر ہوا آئی فضا مہکی کہ تارا ٹوٹا　　　　کون لایا ترے دامن کی خبر آخرِ شب
یاد محفل سجاتی رہی رات بھر　　　　زندگی گنگناتی رہی رات بھر
شمع امید کلیوں سے روشن ہوئی　　　　آرزو گُل کھلاتی رہی رات بھر
دوریاں جیسے چنگاریاں بن گئیں　　　　رات دامن جلاتی رہی رات بھر

غزل کا یہ انداز اچھوتا ہی نہیں دل نواز بھی ہے چند اور شعر کہ شاعرہ کے بحیثیت غزل گو ممتاز مقام و منزلت کے تعین میں سند بن جاتے ہیں:

سائے میں بادلوں کے وہ مہتاب سا کنول　　　　مٹھی میں دامنِ سحر و شام آگیا

جس لالہ رُخ کے خواب تراشے تمام شب
سورج کے ساتھ ساتھ وہ گلفام آ گیا

یاد لب و رخسار ستاروں کی لڑی ہے
ہنگام شب تار سحر چونک پڑی ہے

خوشیوں کی تمنا میں یہ دریوزہ گری کیوں
ہر ضربتِ جاں کیف و مسرت کی گھڑی ہے

(جنوری۔ مارچ ۲۰۰۶ء)

برگِ گل

سید نفیس الحسینی

جناب سید انور حسین نفیس الحسینی (نفیس رقم) کی منظوم تصنیف ''برگِ گل'' ایک ایسا نظر نواز مرقع ہے جو ان کے سحر آفریں فنِ خطاطی کا شاہکار بھی ہے اور مذاق شعر و سخن کی عظمتوں کا آئینہ دار بھی۔ یہ ارمغان نفیس اس اعتبار سے انفرادیت کا حامل ہے کہ اس میں مصوری خطاطی اور شاعری اپنے جلال و جمال کی مکمل بوقلمونی کے ساتھ یکجا نظر آتی ہیں۔ زیر نظر تصنیف اشاعت ثانی ہونے کے سبب صاحب تصنیف کے پاکیزہ فکر و فن کا زیادہ موثر انداز میں احاطہ کرتی ہے جس کا اندازہ دو صد سے متجاوز تزئینی صفحات کے متنوع عنوانات سے ہوتا ہے آغاز کلام حمد باری تعالیٰ سے کیا گیا ہے جو ایک روایت مبارکہ ہے:

حمد باری مری زباں پر ہے　　　وجد طاری مری زباں پر ہے

حمد و نعت، نظم و غزل اور سلام و منقبت کے لیے جن مترنم رواں اور برجستہ بحور و قوافی کا انتخاب کیا گیا ہے وہ مصنف کی فنکارانہ صلاحیتوں اور زبان و بیان کے اعتبار سے قادر الکلامی کے مظہر ہیں۔ اصناف و موضوعات سے قطع نظر ''برگِ گل'' شاعر کی وحدت فکر کا آئینہ دار بھی ہے جسے حُبّ رسولؐ کے عظیم جذبہ سرمدی نے بنیاد فراہم کی ہے چنانچہ کتاب کو جس کیف پرور نعتیہ شعر سے معنون کیا گیا ہے وہ یہ ہے:

مرا قلم بھی ہے ان کا صدقہ مرے ہنر پر ہے ان کا سایہ
حضورِ خواجہ مرے قلم کا مرے ہنر کا سلام کہنا

اس برملا حقیقت کی تصدیق تقریظ نگار محترم جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی نے بھی فرمائی ہے اور

مرتب وتدوین کار سید اظہار احمد گیلانی نے بھی جنہوں نے ''برگِ گل۔ ایک تاثراتی مطالعہ'' کے زیرِ عنوان جناب نفیس الحسنی کی شخصیت اور فکر وفن پر ایک مبسوط عقدت مندانہ جائزہ پیش کیا ہے بہرحال برگِ گل کا مطالعہ ذہن کو ایک خاص تازگی عطا کرتا ہے اور جذبہ واحساس کو طہارت آمیز مہمیز بھی۔ زیرِ نظر مجموعہ کو جن عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے ان میں نفائس النبیؐ، مناقب، شعر الفراق۔ اذانِ جہاد۔ مینائے غزل اور صریرِ قلم وغیرہ شامل ہیں صریرِ قلم کے زیرِ عنوان جناب نفیس رقم کی شہرۂ آفاق خطاطی کے نمونے پیش کیے گئے ہیں جنہیں ''جنتِ نگاہ'' سے تعبیر کرنا مبالغہ نہ ہوگا ''مینائے غزل'' بھی جو صہبائے روحانیت سے لبریز ہے بہ اعتبار اسلوب ''تغزل کے شاہکار اشعار سے تہی دامن نہیں البتہ کلام جگر سے اثر پذیری کا واضح تاثر ملتا ہے بلکہ صفحات، آغاز ہی میں جگر مرحوم کا مندرجہ ذیل شعر جاذب توجہ ہے:

لاکھ ستارے ہر طرف ظلمت شب جہاں جہاں　　ایک طلوعِ آفتابِ دشت و چمن سحر سحر

یہی نہیں بلکہ منقبت ونعت میں بھی یہ رنگ کلام واضح ہے مثلاً

اے غمِ جاناں اے غمِ جانم　　دل ہے پُر خوں آنکھیں پُرنم
اللہ اللہ ان کا عالم　　عشق سراپا، حسن مجسّم
حُسنِ تبسّم، رنگِ تکلّم　　غم کا مداوا زخم کا مرہم
گاہ اشارہ گاہ کنایہ　　مجمل مجمل، مبہم مبہم

خطاطی میں جو مرتبہ ومنزلت جنابِ نفیس رقم کو حاصل ہے وہ محتاج تعارف نہیں البتہ بحیثیت شاعر زیرِ نظر تصنیف انہیں ایک بلند وارفع مقام عطا کرنے کی ضامن ہے انہیں افکار و احساسات کو حسین و پُروقار لفظوں کے سانچوں میں ڈھالنے کے فن پر دسترس حاصل ہے تصدیق کے لیے نظم ''بر مزارِ قطب الارشاد'' سے درج ذیل شعر کا حوالہ کافی ہے جو آپ نے اپنے سلسلہ طریقت کے ایک عظیم روحانی بزرگ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے مزارِ مبارک پر ہندوستان میں حاضری کے دوران کہا:

یہاں اک نگار ہے خیمہ زن، یہ حریمِ حسنِ نگار ہے　　یہاں محوِ جلوۂ سرمدی وہ ہزار رشکِ بہار ہے

حضرت نفیس رقم کی غزل جہاں تغزل کی جملہ روایات سے مملو نظر آتی ہے۔ وہیں یہ اُسلوب حمد ونعت ومنقبت میں بھی جادو جگاتا دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً یہ شعر:

لب پر درود، دل میں خیال رسولؐ ہے　　اب میں ہوں اور کیفِ وصالِ رسولؐ ہے
حُسنِ حَسن کو دیکھ حُسینِ حسیں کو دیکھ　　دونوں میں جلوہ ریز جمالِ رسولؐ ہے

دوسرے شعر میں منقبت ونعت کا حسین امتزاج شاعر کے حسنِ کمال کا مظہر ہے ایسے ہی محاسن موصوف کے افکارِ غزل سے جابجا مترشح ہوتے ہیں:

فکر سلیم ،ذوقِ نظر ہمتِ بلند　　ہر چیز نذرِ گردش حالات ہو گئی
اربابِ ہوش اپنا سا منہ لے کے رہ گئے　　جوشِ جنوں میں مجھ سے کوئی بات ہو گئی
غم وہ تحریر ہے محبت کی　　خونِ دل جس کی روشنائی ہے

امید کی جانی چاہیے کہ جناب نفیس الحسینی کے مجموعہ کلام ''برگِ گُل'' کے وسیع تر تعارف کے بعد اُن کے اُس شاعرانہ مقام کا بھی تعین ہو سکے گا جس کے وہ حقدار ہیں کہ ایک بلند پایہ خطاط بحیثیت فن کار اپنی حسیّات کے ابلاغ واظہار میں دوسری اصناف پر بھی قدرت ومہارت کا مظاہرہ کر سکتا ہے جیسا کہ جناب صادقین کی مثال سے بھی اظہر من الشّمس ہے۔

(جنوری۔مارچ ۲۰۰۶ء)

کرم ونجات کا سلسلہ (نعتیہ کلام)

عزیز احسن

گزشتہ چند دہائیوں سے صنف نعت میں طبع آزمائی کا رجحان تیزی سے فروغ پاتا آرہا ہے جس کے نتیجہ میں اس موضوع پر عظیم الشان لٹریچر تخلیق ہو چکا ہے مقدار سے قطع نظر معیار کے بھی دل پذیر نوادر اس بابِ زرفشاں کا حصہ بن چکے ہیں بایں ہمہ صاحبانِ بصیرت ہمیشہ نو واردانِ سراپا شوق کو احتیاطِ کلام کی تاکید وتلقین کرتے رہے ہیں کہ

ادب گا ہے ست زیرِ آسماں از عرش نازک تر　　نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

چنانچہ یہ سعادت جن خوش نصیبوں کے حصہ میں آئی ہے ان میں عزیز احسن اپنے والہانہ و پاکیزہ کلام کے آئینہ میں جاذب توجہ نظر آتے ہیں ان کا یہ شعر جس کا جزو آخران کے زیر تبصرہ نعتیہ کلام کا عنوان بن گیا ہے سندِ شہادت مہیا کرتا ہے۔

میں عزیز نعت نبی لکھوں تو امید ہے کہ پہنچ سکے
مری ذات تک بھی جزا کے دن کرم ونجات کا سلسلہ

کلام کے مطالعہ سے احساس ہوتا ہے کہ احترم وحُب رسول کا جذبہ شاعر کو نعمۃً ارزانی ہوا ہے یہی نہیں بلکہ کلام کی بلاغت و جامعیت کلیم کی علمی وفنی بصیرت کی بھی آئینہ دار ہے لگتا ہے کہ انہیں اللہ نے خودنمائی کے منفی اندازِ حیات سے مامون فرما دیا ہے ورنہ نام نہاد شہرت اُن کے در پر دست بستہ نظر آتی اس لیے بھی کہ وہ سماعت نواز خوش الحانی سے بھی متصف ہیں۔ عزیز احسن جو پانچ دہائیوں سے متجاوز سفر حیات طے کر چکے ہیں اسلام اور تاریخ اسلام کی معرفت رکھتے ہیں اور زبان و بیان پر جس قدرت کا ان کا کلام غماز ہے وہ ان کے اردو فارسی وعربی کے فاضل ہونے کا ثبوت مہیا کرتا ہے انہوں نے شعر کے فن کو بھی بڑی مہارت سے برتا ہے اور کہیں تکبّر کو

قریب نہیں آنے دیا ان کی کتاب کے مرتب قمر رعینی فرماتے ہیں۔:

''عزیز احسن کے کلام میں عجز ہنر کا اعلان جا بجا ہے اور بیشتر نعتوں میں ان کی تمنائیں ضو ریز ہیں پھر وہ خود نقاد بھی ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ انہوں نے نقد سخن کے لیے اس صنفِ مقدس یعنی نعت کو چنا ہے اس لیے ان کی شاعری جذبے کی تہذیب، ابلاغ حق کے ساتھ ساتھ اظہار عقیدت واعترافِ عجز اور خیال کی راست ترسیل کی آئینہ وار ہے۔''

عزیز احسن کا شعری مجموعہ ''تیرے ہی خواب میں رہتا'' ۲۰۰۰ء میں طبع ہو چکا ہے اور زیر تبصرہ نعتیہ کلام ۲۰۰۵ء کے وسط میں اشاعت پذیر ہوا جس کے ایک شعر سے شاعر کے اوّل الذّکر شعر مجموعے میں جاری وساری بنیادی فکر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

یوں رقم ہو نعت کہ اُسلوب میں تازہ غزل   اتباعِ سرور عالمؐ سے روشن ہو عمل

علاوہ ازیں ان کی دو اہم تصانیف تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''اردو نعت اور جدید اسالیب'' جو ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا اور ۲۰۰۳ء میں مطبوعہ ایک اور مضامین کا مجموعہ ''نعت کی تخلیقی سچائیاں'' اس اعتبار سے اہم ہیں کہ ان کی حرف وصوت سے مرصّع نعت گوئی کو انتقادی سندِ اعتبار عطا کرتی ہیں ان کی کم وبیش نصف درجن تالیفات بھی ہیں جن میں ''جواہر النعت'' (۱۹۸۱ء) ان کے حسنِ انتخاب کی مظہر ہے۔ تصنیف وتالیف کے اس سیاق وسباق میں خود صاحب تحریر عزیز احسن کی درج ذیل رائے ان کے نعتیہ کلام کی روح تک پہنچنے میں معاون ہو سکتی ہے۔

''شعر میں قافیہ، نفسِ مضمون یا متن اور اسلوب دونوں کی اہمیت ہوتی ہے۔ نعت میں قافیہ، نفسِ مضمون کی اہمیت اس لیے زیادہ ہوتی ہے کہ یہ عقیدت آشنا شعری عمل اور رفیع الشان صنفِ ادب ہے جس میں کیفیات کی لمحاتی سچائی سے لے کر تاریخ وسیر اور دینی اقدار کی آفاقی سچائی تک صرف اور صرف صداقت ہی منعکس ہوتی ہے یا ہونی چاہیے۔''

صاحب کتاب کے اس تصورِ شعری کے بعد حمد ونعت کے ضمن میں زیرِ نظر مجموعہ کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے!

حمد: تصویر تری کثرتِ جلوہ سے ہے معدوم — آئینہ حیرت ہے کہ آغوش کشا ہے
نعت: آقا جو نہیں تھے تو امانت بھی نہیں تھی — آدم بھی نہ تھے ان کی خلافت بھی نہیں تھی

مدح کب تک شہِ کونین شنیدہ لکھوں — کاش وہ وقت بھی آئے کہ میں دیدہ لکھو
دولتِ درد عطا ہو مرے آقاؐ جس کو — آپ کی نعت میں با قلب تپیدہ لکھوں
کاش وہ چشمِ کرم میری طرف بھی ہو جائے — میں بھی حسان کے لہجہ میں قصیدہ لکھوں
تڑپ تو رکھتا ہوں زادِ سفر نہیں رکھتا — کرم حضورؐ! کہ میں بال و پر نہیں رکھتا
میں عرضِ حال کے قابل کہاں مرے آقاؐ — سوائے عجزِ بیاں کچھ ہنر نہیں رکھتا
ہم کو دامن ان کو گنجِ شائیگاں بخشا گیا — یوں فقیروں کو وہ دستِ مہرباں بخشا گیا
آدمی کو اُن کے صدقہ نعمتِ عظمیٰ ملی — دینِ برحق کا شعورِ جاوداں بخشا گیا
یقین ہے تو سمجھ منزلِ نظر ہے یہی — کہ نخلِ عشقِ محمدؐ کا اک ثمر ہے یہی
در یقیں سے تہی ہوں اگر دلوں کے صدف — مدینے آؤ کہ بس معدنِ گہر ہے یہی

شاعر کے شعور و وجدان کے ساتھ ساتھ عقیدت و الفت کی ایک مخصوص کیفیت اشعار کی روح بن گئی ہے۔ اور اب دیکھیے کہ لفظ و معنی کے پس منظر میں اتباعِ رسولؐ کا جذبہ صادق بھی کار فرما ہے اور احساسِ ندامت و گنہگاری بھی۔

تذکرے چاروں طرف شاہِ اممؐ آپؐ کے ہیں — ہر طرف پھیلے ہوئے نقشِ قدم آپؐ کے ہیں
ایسے اعمال ہیں اپنے کہ نہ پوچھیں آقاؐ — شرم آتی ہے یہ کہتے ہوئے ہم آپؐ کے ہیں
ہم مدحتِ رسولؐ گرامی اگر کریں — لازم ہے پہلے اپنی طرف بھی نظر کریں
جتنا بلند دعویٰ الفت ہے کاش ہم — اتنی ہی پیروی شہہؐ بحر و بر کریں
میں فقیرِ راہ ہوں اب شاہ کر دیجے مجھے — نعت کے مفہوم سے آگاہ کر دیجے مجھے
میں تو جوں توں آگیا ہوں آپ کے دربار میں — سوز دے کر اب چراغِ راہ کر دیجے مجھے

بخش دیجے اب غلامی کی سند یا شاہ دیں　　ایک ذرہ ہوں مثالِ ماہ کر دیجے مجھے

ہمیں امید ہے کہ عزیز احسن کے نعتیہ کلام میں جو کیف سرمدی اور روحِ عاشقی لفظ لفظ کے رگ و پے میں سمائی ہوئی ہے وہ انشاءاللہ تیزی سے نسیم صبح کی خوشبو بن کر نزدیک و دور پھیل جائے گی کہ خود بقول شاعر:

سلسبیلِ نور میرے قلب تک پہنچی عزیز　　احمد مختارؐ کی الفت کا یہ فیضان ہے

(جنوری۔مارچ ۲۰۰۶ء)

ناموسِ رسولؐ اور قانونِ توہین رسالت

محمد اسماعیل قریشی

جناب محمد اسماعیل قریشی کی زیرِ نظر تصنیف نہ صرف فاضل مصنف کی ژرف نگاہی اور بلاغتِ فکر کی آئینہ دار ہے بلکہ موضوع کی معنوی اور واقعاتی وسعتوں کا اس انداز سے احاطہ کیے ہوئے ہے کہ اسے بلاشبہ علمی تحقیقی وتلاش کا شاہکار کہا جاسکتا ہے۔ عقیدت جسے مذہبی ذہن نے بنیاد فراہم کی ہو عموماً معروضی نقطۂ نگاہ پر غالب آجانے کے امکانات رکھتی ہے اور تحقیق کے عمل کو مبنی بہ صداقت نتائج اخذ کرنے سے محروم کردیتی ہے لیکن زیرِ تبصرہ کتاب سے جو سنجیدہ مطالعہ کی متقاضی ہے واضح ہوتا ہے کہ صاحب تحریر نے داخلیت اور معروضیت کے درمیان حد فاصل کو بالالتزام قائم رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ کتاب کا علمی مرتبہ بین الاقوامی سطح کی دستاویز دانش کی حیثیت اختیار کر گیا ہے جسے نابغہ روزگار شخصیات خراجِ تحسین پیش کر چکی ہیں مرحوم حکیم محمد سعید کے الفاظ میں یہ کتاب ''مرتبہ تحقیق پر فائز ہے اور قولِ فیصل کی حیثیت رکھتی ہے'' جسٹس محمد رفیق تارڑ محسوس کرتے ہیں کہ اس کتاب میں ''علم ودانش کے خوشہ چینوں کے لیے معارف وبصائر کے خزینے موجود ہیں'' جسٹس ڈاکٹر فدا محمد خان فرماتے ہیں کہ مصنف نے ''تاریخی حوالوں سے اس موضوع پر ایسا اہم مواد یکجا کردیا ہے جو سلیس سادہ عام فہم اور ایمان افروز ہونے کے ساتھ ساتھ جامع انداز کا حامل ہے۔''

تصنیف، مصنف کی دانش وحکمت اور علم وآگاہی کی ترجمان ہوتی ہے صاحبِ کتاب ایک ماہر اور دقیقہ شناس قانون داں کی حیثیت سے شہرت دوام حاصل کر چکے ہیں اور معارفِ اسلامی کے شعبہ میں انہیں ناقابلِ تردید مقام حاصل ہے لیکن زیرِ نظر تصنیف نے ان کی شخصیت کے کچھ اور نئے افق بھی واضح کیے ہیں جنہیں ان کے دینی وفقہی شعور نے تاریخ کے حوالے سے بصیرت افروز اور ادب وشعر کی نسبت سے سرور وسوز کا نظر نواز منظر بنا دیا ہے یہی وجہ ہے کہ کتاب دینی

معنویت کے ابلاغ اور ردعمل و منطق کی برملا قوت کا دلکش مرقع ہے۔ قریشی صاحب فکر و فلسفہ سے متعلق نابغہ روزگار شخصیات میں اقبالؒ کو خصوصی اہمیت دیتے ہیں چنانچہ جگہ جگہ کلام اقبال کی گلپاشی نے ان کے اسلوب تحریر کو شگفتگی اور حسنِ معنویت سے ہمکنار کر دیا ہے۔

فاضل مصنف کا یہ ایمان پرور اور خرد افروز محاکمہ جولائی ۱۹۹۴ء میں منصۂ شہود پر طلوع ہوا اور دیکھتے دیکھتے ادیانِ عالم اور علوم فہمی کی دنیا میں مرکز توجہ بن گیا دوسری بار ستمبر ۱۹۹۹ء میں پُر مغز اضافوں کے ساتھ شائع ہوا اور اب اشاعت سوئم فروری ۲۰۰۶ء میں مزید توجیہی مواد کے ساتھ گذشتہ برسوں میں مشرق و مغرب میں رونما ہونیوالے ردعمل اور حالات و واقعات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے منظر عام پر آئی ہے یہ سب کچھ ان محرکات کا نتیجہ تخلیق ہے جنھیں بالصراحت فاضل مصنف نے کتاب کے صفحات ۴۰ تا ۴۵ کے مندرجات کے ذریعہ پیش کر دیا ہے اور جن کا نقطہ عروج فیڈرل شریعت کورٹ آف پاکستان کا وہ تاریخ ساز فیصلہ ہے جو ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۰ء کو بمقدمہ محمد اسماعیل قریشی سینئر ایڈووکیٹ و چیئرمین ورلڈ ایسوسی ایشن آف مسلم جیورسٹس (مصنف) بنام حکومتِ پاکستان صادر کیا گیا اور بعد میں عدالت عظمیٰ نے جس کی توثیق فرمائی۔ اس بارے میں ملاحظہ ہو فاضل مصنف کی تحریر سے ایک اقتباس:

''پاکستان میں تعزیرات ہند کی طرح برٹش گورنمنٹ کی پالیسی کے تحت قانون توہین رسالت سرے سے موجود ہی نہ تھا مگر اب بفضل خدا یہ قانون سارے پاکستان میں نافذ العمل ہے لیکن اردو یا انگریزی میں قانون توہین رسالت پر قرآن و سنت، فقہ اور مروجہ قانون کے حوالے سے تاریخی پس منظر کے ساتھ کوئی مستند کتاب موجود نہ تھی۔ اس لیے توہین رسالت کے سلسلہ میں کافی مواد اکٹھا کرنا پڑا۔ نئے مسائل اور مباحث کے جوابات بھی علمی دیانت کے ساتھ پیش کئے گئے تھے اس لیے انہیں بھی یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع کرنے کی سعادت مجھ عاجز کو حاصل ہوئی۔''

صاحب کتاب کی علمی دیانت کے مستند شواہد اُن تمام صفحات کی محققانہ قدر و قیمت کا تعین

کرتے ہیں جو ضخیم و مبسوط آٹھ ابواب پر مشتمل ہیں اور جن کا انتساب بصد عقیدت واحترام ماضی و حال اور استقبال کے شہیدان ناموس رسالت کے نام کیا گیا ہے ان ابواب میں نہایت جانکاہی کے ساتھ ناموس رسولؐ کے حوالے سے قرآنِ حکیم اور دیگر آسمانی صحائف غیر الہامی کتب دیگر مذاہب عالم اور یورپ کی عظیم شخصیات کا ہدیۂ حمد وستائش برصغیر کے غیر مسلم مشاہیر کا خراج عقیدت، آیاتِ قرآنی اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں دربارِ نبوت کے فیصلے، دورِ خلافت دور بنوامیہ وعباسی دورِ حکومت نیز حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی فقہ کے تناظر میں احکامات کے علاوہ توہین رسالت کے باب میں جرم وسزا سے متعلق علمائے جدید کے فتاویٰ اور مقالات کو زیرِ نظر تصنیف میں مجتمع کر دیا گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ عالمی وملکی تناظر میں نہایت اہم نتائج تحقیق پیش کیے گئے ہیں۔ نیز ایک مکمل باب مسلم اسپین میں قانون توہین رسالت اور حقوق انسانی سے نہایت بصیرت افروز انداز میں بحث پر مبنی ہے اور آخر میں وہ عدالتی فیصلے جو سنگ ہائے میل کی حیثیت رکھتے ہیں پیش کیے گئے ہیں جن میں موجودہ قانون توہین رسالت تاریخی پس منظر کے ساتھ یورپین کورٹ آف ہیومن رائٹس ۱۹۹۶ء کا فیصلہ ہاؤس آف لارڈز برطانیہ کا ۱۹۹۰ء کا فیصلہ اور امریکن سپریم کورٹ کا بھی ایک فیصلہ شامل ہے۔

فاضل مصنف کی یہ معرکہ آرا تصنیف جو اُن کے اخلاص عمل اور تبحرِ علمی کی مظہر ہے 9/11 کے سانحہ کے مضمرات اور بعد میں پیش آنے والے واقعات کے خون آشام تسلسل میں اسلام اور مسلمانانِ عالم کو تنقید وتحقیر کا ہدف بنائے جانے کے بعد خصوصی اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ خصوصاً نام نہاد اظہار آزادی کی کمیں گاہ سے گذشتہ فروری میں ڈنمارک کے ایک تہذیب باختہ اخبار نے رحمت اللعالمینؐ کی شان میں جس غلاظت ذہنی اور خبث باطنی کا مظاہرہ کیا ہے اُس کا مدلل جواب زیرِ نظر تصنیف میں اُن ناقابل تردید حوالوں سے ملتا ہے جن میں یورپی ممالک میں نافذ العمل اُن قوانین کی نشان دہی کی گئی ہے جو نام نہاد اظہار رائے کی آزادی کے دعاوی کے باوجود 'بلاس فیمی' کے تحت تعزیرات کا تعین کرتے ہیں اس ضمن میں فاضل مصنف کی تحریر سے ایک

برمحمل اقتباس:

''قانونِ توہین انبیاء دنیا کے تقریباً تمام ملکوں میں تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھ نافذ رہا ہے۔ نیو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مطابق اکثر مشرقی اور یورپی ملکوں میں 'بلاس فیمی لا' کسی نہ کسی صورت قابل مواخذہ جرم رہا ہے۔ آسمانی صحائف کو ماننے والی اقوام جہاں بھی حکمران رہی ہیں وہاں توہین رسالت کی سزا، سزائے موت پر عملدرآمد ہوتا رہا ہے۔''

ہم فاضل مصنف کے اس مہتمم بالشان علمی و تحقیقی کارنامے پر ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں اور ایمان وایقان کے ساتھ سمجھتے ہیں کہ یہ اُس عظیم ہستیؐ کا فیضان ہے جس کی ذات گرامیؐ سے فاضل مصنف کی زیرِ نظر تصنیف کو نسبتِ افتخار حاصل ہے اللہ تعالیٰ انہیں اجر وثواب سے سرفراز فرمائے۔ ''این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد''

(اپریل۔جون ۲۰۰۶ء)

'متفرقافِ غالب'

پرتو روہیلہ

آفرین ہے پرتو روہیلہ پر کہ وہ غالب جیسے ''گنجفہ بازِ خیال'' شخص کے کلام پر بار بار طبع آزمائی فرما رہے ہیں اور ہر بار نہ صرف بچ نکلتے ہیں بلکہ کامیاب کمند افگنی پر منتج بھی ٹھہرتے ہیں انہوں نے ۲۰۰۲ء میں اس کے باوجود کہ شارحینِ غالب ''شمار و قطار'' سے کہیں آگے نکل گئے ہیں۔ غالب کے مشکل اشعار کی شرح ''مشکلات غالب'' کے زیر عنوان لکھ ڈالی حالانکہ غالب کے مخاطب اُس کے مستقبل کے شارحین ہی تھے جب اُس نے یہ کہہ کر چیلنج کیا تھا کہ:

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے　　　مُدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

چنانچہ شارحین گرامی اپنی اپنی علمی وفکری بساط کے مطابق ''کوہ کندن و کاہ بر آوردن'' کے مصداق دُور کی کوڑی لاتے رہے اور ''عنقا'' کی تلاش وجستجو میں سرگرداں رہے تا آنکہ حضرت پرتو گرد راہ سے نمودار ہوئے اور اس قافلے میں شریک ہو گئے ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ ''عنقاشکار'' بھی ثابت ہوئے کہ نہیں البتہ تفہیم غالب کی سعی میں وہ خاصے سرخرو نظر آتے ہیں سرخروئی اور کامرانی کا یہی وہ نشہ ہوتا ہے جو عالم بیخودی میں انسان کو ہوا کے دوش پر بٹھا دیتا ہے یعنی ''دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوکہ یوں''

اور اب پرتو نے تفہیم کے بعد تسہیل غالب کے ضمن میں ''متفرقات غالب'' ۲۰۰۵ء میں چھپوا ڈالی اور اس طرح انہوں نے شعر غالب کے بعد نثر غالب کو ''بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا'' کے باوصف اپنا ہدف بنالیا اور اس طرح صرف غالب کے حوالے سے اپنے تراجم کی تعداد کو نصف درجن تک پہنچا دیا جن میں ''نامہ ہائے فارسی غالب (۱۹۹۹ء) مآثر غالب (۲۰۰۰ء) آہنگ پنجم (۲۰۰۱ء) ''غالب کے پراگندہ فارسی خطوط'' (منتظر اشاعت) اور ''باغ

دودر'' (۲۰۰۰ء) کے علاوہ زیر تبصرہ کتاب ''متفرقاتِ غالب'' (۲۰۰۵ء) شامل ہیں ترجمہ کا کام بڑے 'جان جوکھوں' کا ہے لیکن لگتا ہے کہ پرتو روہیلہ غالب کا پیچھا اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے جب تک وہ اسے مکمل طور پر اپنا ''مغلوب فکر'' نہ بنالیں کیونکہ خود بقول غالب:

ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے — کہ جو شریک ہے میرا شریک غالب ہے

ویسے تو غالب 'بے استادے' مشہور ہیں مگر کہا جاتا ہے کہ آگرہ میں ایک ایرانی کا ان کے یہاں طویل قیام رہا۔ چنانچہ گمان غالب ہے کہ اسی شخص کی رفاقت کے سبب غالب کی فارسی دانی وجہ تفاخر ٹھہری جس نے انہیں یہاں تک دعویٰ کرنے پر مجبور کر دیا کہ:

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ — بگزر از مجموعہ اردو کہ بے رنگ من است

فارسی میں غالب کے ''نقش ہائے رنگ رنگ'' کو اردو میں منتقل کرنے کا کام علمی تبحر اور دونوں زبانوں پر قدرت و مہارت کا متقاضی ہے اور ایک چیلنج ہے کہ ترجمہ کے لیے صرف لفظ و معنی ہی پر گرفت کافی نہیں بلکہ لہجہ و اسلوب کے ساتھ ساتھ اس تہذیبی، معاشرتی اور تمدنی پس منظر کو بین السطور میں جذب کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جو کسی بھی نظم و نثر کے پیکر کو روح کی حرارت عطا کرتا ہے۔ بقول جوش:

لیلائے سخن کو آنکھ بھر کر دیکھو — قاموس و لغات سے گزر کر دیکھو
الفاظ کے سر پر نہیں اڑتے معنیٰ — الفاظ کے سینوں میں اُتر کر دیکھو

چنانچہ ہم نے دیکھا کہ اکثر مقامات پر مترجم پرتو نے جو خود بھی ایک کثیر الجہت شاعر ہیں کہ ان کی کم و بیش ایک درجن تخلیقات میں حمد و نعت سلام و منقبت نظم و غزل کی اصناف کے علاوہ لوک گیت اور دوہے جیسی اصناف سخن بھی شامل ہیں فارسی و اردو دونوں زبانوں کے مزاج شناس ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ کتاب کی تقریظ میں ترجمہ کی باریکیوں اور لوازم پر مترجم پرتو روہیلہ یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

’’ترجمہ کرتے وقت یہ مقصد پیش نظر رہا ہے کہ وہ متن کے عین مطابق ہو اگر بوجوہ ایسا ممکن نہ ہو سکے تو متن سے قریب ترین ضرور ہو کہ قاری خطوط نگار کی لطافتِ خیال ہی سے نہیں اس کے اسلوبِ نگارش سے بھی آشنا ہو سکے۔‘‘

اس نقطہ نظر کی صحت کو جانچنے کے لیے مترجم نے ۴۹ خطوط کے تراجم کے ساتھ ساتھ فارسی متن شامل کتاب کیا ہے نیز مکتوب الیہم کے سوانحی خاکے بھی پیش کئے ہیں تا کہ یہ مکاتیب اپنے جملہ سیاق وسباق کے ساتھ قاری کے ذہن میں پیدا ہونے والے کسی بھی نوع کے تحفظات کو دور کرنے میں مددگار ثابت ہو سکیں۔ چنانچہ اس کی تصدیق کے لیے ہماری نظر ایک مکتوب پر پڑی جو اپنی لسانی پیچیدگیوں کے باوجود غالب کے ایک ایسے شعر کو تمثیلی پس منظر عطا کرتا ہے جو شاعر کی ذہنی اُپج کا آئینہ دار ہے یعنی:

دل حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد　　　کام یاروں کا بقدرِ لب ودنداں نکلا

خط کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

’’جود وکرم کے دستر خوان کے ظرف کا ریزہ خوار (آپ کی) خدمت میں یہ عرض کرتا ہے کہ سری پائے پہنچے اور کام جاں کو محبوبوں کے تبسم شور انگیز کی لہر میں لوٹ پوٹ کر دیا دماغ کو بھی طاقت دی اور ہاتھ پاؤں کو بھی توانائی بخشی اس کا گودا اپنے خمیر کی لطافت میں قوائے انسانی کے اضافے کا سرمایہ، نہیں نہیں میں نے غلط کہا زندگی کے چراغ کے تیل کا مادّہ ہے۔ فمِ معدہ اس کے شوربے کی روانی کا ثنا خواں ہے اور آنتیں اس کے کنچوں کی لذت کے شمار کی تسبیح پڑھ رہی ہیں روٹی نے جب اس کے شوربے کے معیار کو پہچانا تو پہلے حملے ہی میں خوف سے سپر ڈال دی اور جب زبان اس کی روانی کی لذت کی شکر گزاری میں (مشغول ہوئی) تو شوربے کی آب حیات کی موج اُس کے سر سے گزر گئی اس کی ہڈیوں کے نظر فریب جلوے پر ہُما دیوانہ ہو گیا ہے اور اُس کے بھنے ہوئے مغز کے حسن پر عقل فریفتہ ہو گئی ہے اُس کے مرچوں کے مزے کی تیزی محبوبوں کی ادائے عتاب کی

طرح گلو سوز تھی اور اس کی ہڈیوں کے چٹخنے کی آواز چنگ ورباب کے نغمے کی طرح سامع نواز۔ میں تو بات کو طول دینا اور اس نعمت کی تعریف کے بعد صاحب نعمت کا شکر ادا کرنا چاہتا تھا کہ اچانک میرے جبڑے نے مجھے ناز کے ساتھ آنکھ کا اشارہ کیا اور اپنے سر کی قسم دیکر گویا ہوا کہ اپنے ہاتھ سے قلم فوراً رکھ دو اور نلی کے گودے کی لطافت کا مزہ لو چونکہ مجھے اس کی خاطر داری منظور تھی اور اس کی قسمت پُر مایہ تھی للہذا تعمیل کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔''

اللہ اللہ غالب کی طبّاعی اور قادر الکلامی! ہمارا ارادہ تھا کہ ترجمہ کے بعد جو پرتو روہیلہ کی زبردست لسانی گرفت کا شاہکار ہے فارسی متن بھی پیش کرتے تاکہ قارئین فارسی کے نقش ہائے رنگ رنگ پر بھی ایمان لے آتے مگر حالت یہ ہے کہ ترجمہ پیش کر کے ہی منہ میں پانی بھر آیا۔ اصل متن پیش کر کے ہم اپنی اور قارئین کی حالت وگرگوں نہیں کرنا چاہتے کتاب اور صاحب کتاب یعنی پرتو روہیلہ کے فن ترجمہ وابلاغ کے بارے میں جن مشاہیر نے خراج تحسین پیش کیا ہے ان میں مشفق خواجہ، ڈاکٹر وحید قریشی، پروفیسر شوکت واسطی اور پروفیسر سلیمان اطہر جاوید جیسی ہستیاں شامل ہیں ہماری کیا مجال کہ ان سے اختلاف کریں؟

(اپریل۔جون ۲۰۰۶ء)

شہر علم کے دروازے پر

افتخار عارف

افتخار عارف کہ محتاجِ تعارف ہیں نہ صلہ وستائش کے طالب تاہم ادب وشعر کا ایسا معتبر و محترم حوالہ ہیں جس سے صرف نظر ممکن نہیں وہ خوش نصیب ہیں۔ کہ جہاں ''تندی بادِ مخالف'' اور ''تنگئ چشم حسود'' نے ان کے فکر وفن کو مہمیز مہیا کی وہاں ان کے اخلاص کیش قدر شناسوں نے اہل دانش سے ان کے اُس سرمایہ تخلیق کو متعارف کرایا ہے جسے وہ ''ورثہ حرف'' کا نام دیتے ہیں اور بصد عجز وانکسار مال وزرا اور جاہ وحشم کی ہوسِ دُوں نہاد سے بے نیاز قلم کو عطائے خداوندی سمجھتے ہیں۔ افتخار عارف مالک الملک سے مملکت لفظ وبیاں کی خسروی کے لیے دعا گو ہیں۔

سینۂ ظلم میں ہوتا ہے ترازو اک تیر
کاش ایسا ہو کہ اس بار کماں میری ہو
مالک الملک جو چاہے تو یہ عزت مجھے دے
ایک دن مملکتِ لفظ و بیاں میری ہو
نہ مال وزر ہے نہ جاہ وحشم ہمارا ہے
مگر خدا کی عطا ہے قلم ہمارا ہے

زیرِ نظر تصنیف جو نعت ومنقبت کا حسین مرقع ہے کچھ ایسے اشعار سے بھی مزین نظر آتی ہے جو غزل کے مزاج وآہنگ کے باوجود حب رسولؐ اور عقیدت آل رسولؐ کے مظہر ہیں۔

یہ میرے لفظ جو کچھ آب وتاب رکھتے ہیں
کسی سے منزلتِ انتساب رکھتے ہیں
ندیم دوست سے آتی ہو بوئے دوست جنہیں
وہ حق بندگی بوتراب رکھتے ہیں
زرہِ صبر سے پیکان ستم کھینچتے ہیں
ایک منظر ہے کہ ہم دم ہمہ دم کھینچتے ہیں
حکم ہوتا ہے تو سجدے میں جھکا دیتے ہیں سر
اذن ملتا ہے تو شمشیرِ دو دم کھینچتے ہیں

زیرِ تبصرہ کتاب کا نام ہی (شہر علم کے دروازے پر) شاعر کے ممدوحین کی نسبت ارادت وعقیدت سے مملو ایک خوبصورت کنایہ بھی ہے اور صاحب تصنیف کی علمی بصیرت کا

ترجمان بھی۔ کتاب جو ''مہر دو نیم''، ''حرف بار یاب'' اور ''جہان معلوم'' کے مصنف کے انتخاب کلام پر مشتمل ہے ۔ ٹورنٹو (کینیڈا) میں ان کے پرستار اِن فکروفن یعنی اشفاق حسین کی ترتیب وتدوین اور جعفر نقوی وزہرا نقوی کے تزئین واہتمام کی مرہون منت ہے۔ کتاب کے پیش لفظ میں اشفاق حسین صراحت فرماتے ہیں

''شہر علم کے دروازے پر'' میں ان کے تینوں مجموعوں کے علاوہ ایسا غیر مطبوعہ کلام بھی ہے جو محفلوں اور مجلسوں میں پڑھا گیا۔۔۔افتخار عارف کی ذاتی درخواست پر ممتاز دانش ور اور سیاسی مدبر اور بین الاقوامی شہرت کے حامل مصوّر جناب حنیف رامے نے کتاب کے لیے خوبصورت سرورق بنایا۔''

معنوی وصوری آب وتاب کے ان حوالوں میں ہمیں بین الاقوامی شہرت کے حامل ان ناقدین شعروادب کی آراء بھی ملتی ہیں جو افتخار عارف کے شعری فن کی عظمت پر مُہر تصدیق بھی ہیں اور ذکاوت فکر پر خراج تحسین بھی۔ فیض مرحوم کی تحریر سے ایک اقتباس

''افتخار عارف نے جدید مضامین ومطالب کی ادائیگی میں روایت کے خزینے سے یوں کسب فیض کیا ہے کہ تلمیح کو علامت اور علامت کو استعارے کا روپ دے کر نظم اور غزل دونوں کے لیے رمز وکنایہ کا نیا سامان پیدا کیا ہے۔ اس ضمن میں اب سے پہلے عشق وطلب، ایثار و جان فروشی، جبر وتعدی کا بیاں صرف منصور وقیس اور فرہاد وجم کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔ پھر جب گھر میں دار ورسن کی بات چلی تو مسیح وصلیب کے حوالے بھی آ گئے لیکن المیۂ کربلا اور اس کے محترم کرداروں کا ذکر بیشتر سلام ومرثیہ تک محدود رہا صرف علامہ اقبال کی نگاہ وہاں تک پہنچی۔ افتخار عارف نے گزارش احوال واقعی کے لیے ان مآخذ سے بہت اثر افریں اور خیال افروز کام لیا ہے۔''

فیض صاحب کے نقطۂ نظر کی تصدیق کے لیے ملاحظہ ہو افتخار عارف کا منفرد حمدیہ آغازِ کلام (مکالمہ) جو زیر نظر مجموعہ کی زینت ہے۔

''ہوا کے پردے میں کون ہے جو چراغ کی لو سے کھیلتا ہے''

کوئی تو ہوگا۔

''جو خلعتِ انتساب پہنا کے وقت کی رو سے کھیلتا ہے''

کوئی تو ہوگا،

''حجاب کو رمز نور کہتا ہے اور پرتو سے کھیلتا ہے''

کوئی تو ہوگا۔

تلمیح کو علامت اور علامت کو استعارے کا روپ دے کر رمز و کنایہ کا نیا سامان پیدا کرنا واقعی افتخار عارف کا مسحور کن ہنر ہے۔ مثلاً

دل ایک وضع کی آب وہوا میں رہتا ہے مدینہ و نجف و کربلا میں رہتا ہے

کہاں دمشق مقدر کہاں مدینۂ خواب ملے تو کیسے ملے منزل خزینۂ خواب

وہ عجیب رات تھی سارے شہر میں ایک چراغ نہیں جلا

مگر اک لکیر لہو کی ایسی کھینچی کہ نور رہی نور رہے

اور ایک نظم ''اِنیِ کُنتُ مِن الظالمین'' سے اقتباس:

پڑھا تو یہ تھا زمین عنبر پہ کشت خاشاک کرنے والے نہیں رہیں گے

سنا تو یہ تھا ہوا کے ہاتھوں پہ بیعت خاک کرنیوالے نہیں رہیں گے

مگر ہوا یوں کہ نیزۂ شام پر سرِ آفتاب آیا

امانت نور جس کے ہاتھوں میں تھی اسی پر عذاب آیا

جرمن سکالر این مری شمل کے افتخار عارف کے کلام کے بارے میں انگریزی زبان میں تجزیہ و تاثر کا اردو ترجمہ کچھ یوں ہے کہ ''ابتلا و مصائب کا موضوع حالیہ اردو شاعری میں اکثر و بیشتر اور خاص طور پر افتخار عارف کی شاعری میں نمایاں دکھائی دیتا ہے وہ زبان کے استعمال میں جدید اور اشاروں، علامتوں نیز استعاروں میں مخفی اپنی شدت احساس کے اعتبار سے کلاسیکل انداز کے حامل ہیں'' چنانچہ دیکھیے

کبھی چھپے ہوئے خنجر کبھی کھنچی ہوئی تیغ　　سیاہ ظلم کے ایک ایک ڈھب سے واقف ہیں
یہ رات یوں ہی تو دشمن نہیں ہماری کہ ہم　　درازی شب غم کے سبب سے واقف ہیں

بقول ڈاکٹر آفتاب حسن

''افتخار عارف عمیق مذہبی جذبات کے حامل انسان ہیں اور اقبال کی طرح اسلامی تاریخ کے حوالوں کا علامتوں اور استعارون میں استعمال یقیناً ان کے ذاتی عقائد کا اظہار ہے۔''

(انگریزی سے ترجمہ) ملاحظہ ہو:

مرا شرف کہ تو مجھے جواز افتخار دے　　فقیر شہر علم ہوں زکوٰۃ اعتبار دے
میں نے قرآن کی تفسیر میں سیرت کو پڑھا　　نور کو دائرہ نور کے اندر رکھا
دیکھنے والے نے دیکھے ہیں وہ آشفقہ مزاج　　جو حرم سے بھی مدینے کی طرف دیکھتے ہیں
حضور شافع محشرؐ علیؑ کہیں کہ یہ شخص　　گناہ گار بہت ہے مگر حسینؓ کا ہے
ہوئی ہے جب بھی صف آرا سپاہِ ظلمت وظلم　　کہیں، سپر کہین شمشیر بن گیا تیرا غم

فقیر شہر علم ہونا افتخار عارف کے لیے باعث تکریم ہے اور شہر علم کے دروازے پر ان کی ادب پر در عقیدتیں سرنگوں نظر آتی ہیں۔ جس کا اظہار وہ اپنی ایک نظم میں جس کا عنوان سرنامۂ کتاب ٹھہرا ہے یوں کرتے ہیں

مجھے تو بس صرف یہ خبر ہے
وہ میرے مولاؐ کی خوشبوؤں میں رچا بسا تھا
وہ ان کے دامان عافیت میں پلا بڑھا تھا
اور اس کے دن رات میرے آقاؐ کے چشم ابرو وجنبش لب کے منتظر تھے
وہ رات کو دشمنوں کے نرغے میں سو رہا تھا تو ان کی خاطر
جدال میں سر سے پاؤں تک سرخ ہو رہا تھا تو ان کی خاطر

میں اس کو محبوب جانتا ہوں
میں اس کو مقصود مانتا ہوں

افتخار عارف کے کلام کی جہتوں میں ان کی عقدت آگیں مذہب اور سلام ومنقبت کی دلربا صورتوں میں محبت پرور تعظیم وتکریم سب سے زیادہ سحر آفرین ابلاغ فن ہے جس کے لیے بعض مخصوص بحروں کا انتخاب اس طرح ان کا نشان امتیاز بن گیا ہے کہ قاری ان کے ڈکشن سے مسحور گہوارہ جنبانی جیسی کیفیت محسوس کرتا ہے وہ قرطاس وقلم کی خرمت اور لفظ و بیاں کی طہارت پر ایمان بھی رکھتے ہیں اور اظہار پر بھی قادر ہیں۔ ،رجائیت اور صداقتِ احساس ان کی شخصیت کے دلنواز پہلو ہیں:

کبھی فغاں کی طرح رائیگاں اثاثۂ حرف
کبھی دعا کی طرح مستجاب رکھتا ہے
میں جب بھی صبح کا انکار کرنے لگتا ہوں
تو کوئی دل میں مرے آفتاب رکھتا ہے

اب اس میں کاوش کوئی نہ کچھ اہتمام میرا
ہوائیں محفوظ کر رہی ہیں کلام میرا

دعا بغیر اجازت بغیر ، اذن بغیر
ہم ایک لفظ سپرد قلم نہیں کرتے

جو میں نہیں کر سکا مرے ہم قلم کریں گے
بصورتِ نعت استغاثہ رقم کریں گے

(اپریل۔جون ۲۰۰۶ء)

حمایت علی شاعر کے ڈرامے

انور جبین قریشی

زیر نظر کتاب ۲۰۰۵ء میں منظر عام پر آئی جس میں ''حرف اقرار'' کے زیر عنوان کتاب کے مرتب' حمایت علی شاعر کو'' ہمہ جہت'' فنکار قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی دور میں بحیثیت افسانہ نگار متعارف ہوئے اور'' اس صنف ادب سے ان کی وابستگی، ان کی شاعری میں کس طرح نمایاں ہوتی رہی اور فن و ادب کے دوسرے شعبوں مثلاً فلم۔ٹی۔وی اور ریڈیو کے تخلیقی ادبی مظاہر میں کس طرح اپنا ہنر دکھاتی رہی کسی وضاحت کی محتاج نہیں۔فلمی نغمہ نگاری ہو کہ مکالمہ نویسی، سکرین پلے ہو کہ ہدایت کاری، ریڈیو سے نشر ہونے والی گیتوں بھری کہانیاں ہوں کہ مختلف غنایئے، منظّم و نثری ڈرامے ہوں کہ سٹیج پر پیش کش کے نت نئے تجربے۔۔۔سب ہی حمایت صاحب کی فن کارانہ خوبیوں کے آئینہ دار ہیں''

اس میں شک نہیں کہ ہمارے ماضی و حال کی اہل ہنر و اہل قلم ہستیوں میں بہت کم نام ایسے ہونگے جو اپنے فکر و فن میں اتنے کثیر الاطراف ہوں جتنے کہ حمایت علی شاعر۔زیر نظر مجموعہ ان کے ایک اسٹیج ڈرامے (اندھیرے اجالے) اور چھ عدد ریڈیائی ڈراموں (دشمن آسماں اپنا۔۔۔برزخ۔۔۔فاصلے۔۔۔پتھر کی لکیر۔۔بگولا اور مرنا ہے تو۔۔۔) پر مشتمل ہے جس کی اشاعت سے تمثیلی ادب کی تاریخ میں قابل قدر وسعت پیدا ہوئی ہے یہ ڈرامے اپنے موضوعات اور تکنیکی محاسن کے حوالے سے حمایت صاحب کی تخلیق صلاحیتوں کے نہ صرف بہترین نمائندہ ہیں بلکہ زندگی کی تلخ و شیریں حقیقتوں کے ترجمان بھی ہیں اشاعت کا اہتمام کرنے والوں نے اچھا کیا کہ ''ڈرامہ اور میں'' کے عنوان کے تحت حمایت صاحب کا ایک تقریظی نوٹ بھی کتاب میں شامل کر دیا جو ان تحریروں کے محرکات، واقعات، پس منظر و پیش منظر شخصیات، مقامات نیز اس صنف ادب کے ارتقاء و ترویج کے اسباب و علل پر قارئین کو مفید اور پُر معنی معلومات مہیا کرتا ہے جو اس

ضمن میں تحقیق کے شعبہ سے وابستہ افراد کی رہنمائی بھی کر سکتا ہے اس کے مطالعہ کے بعد افسوس ہوا کہ حمایت صاحب ''پاکستان میں اردو ڈرامہ'' کے موضوع پر اپنے پی۔ایچ۔ڈی کے مقالہ کو بوجوہ مکمل نہ کر سکے کیونکہ وہ اس ریسرچ کے بارے میں جتنے سنجیدہ تھے اس کے پیش نظر توقع کی جاسکتی تھی کہ ان کا یہ مقالہ اس شعبہ میں نہ صرف ایک سنگ میل ثابت ہوتا بلکہ مستقبل کی بعض سمتوں کا تعین بھی کر دیتا بہر حال انہیں چاہیے کہ اس ضمن میں وہ جس قدر بھی کام کر پائے ہیں اسے بعجلت تمام منصۂ شہود پر لے آئیں کہ بادشہ حسین کے مقالے کی مثال ہمارے سامنے ہے جو ڈرامہ کی دنیا کے اولین نقوشِ تخلیق میں اپنے مقام ومنصب کے باعث آج بھی اہل فن کے لیے منبع فیضان کی حیثیت رکھتا ہے۔

حمایت علی شاعر کا فنی سفر اُن کی چونکا دینے والی تخلیقی صلاحیتوں سے عبارت ہے جس نے اپنی بوقلمونی کے اعتبار سے اُنہیں آزادی کے بعد ابھرنے والے ہم عصر فن کاروں میں قابل رشک مقام عطا کیا ہے جو ان کی مسلسل محنت وکاوش کا نتیجہ ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ نصف درجن دوا دین شعری کے خالق ہیں جن پر ادبی دنیا کے معروف اور معتبر اہل الرائے انہیں خراج تحسین پیش کر چکے ہیں۔اور ایک درجن سے زیادہ اعزاز انہیں ملکی یا برصغیر ہی کے نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح کے معروف ومعتبر تحقیقی اداروں اور حکومتوں کی جانب سے پیش کیے جا چکے ہیں جن میں دوبار حکومت پاکستان کی جانب سے صدارتی ایوآرڈ تین بار نگار ایوارڈ اور امریکہ کی اعزازی شہریت شامل ہیں وہ ایک نمایاں اختصاص یہ بھی رکھتے ہیں کہ ان کی منظوم خودنوشت'' آئینہ در آئینہ'' جو ساڑھے تین ہزار اشعار پر مشتمل ہے اردو کی پہلی منظوم سوانح کی حیثیت سے اہل علم وخبر سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے وہ اردو شاعری میں ''ثلاثی'' کی نئی صنف سخن کے موجد بھی ہیں جس کا اعتراف امریکہ میں شگاگو کی ایک معروف علمی تنظیم کی جانب سے ان کی خدمت میں ایوارڈ پیش کر کے کیا جا چکا ہے۔ یہ اعزاز شاید بہت کم لوگوں کو حاصل ہو کہ وہ نصف صدی سے بھی زیادہ مدت سے قومی وبین الاقوامی مشاعروں میں حرف وصوت کے جادو جگاتے رہے ہیں اور ایک مقبول و

محبوب شاعر کی حیثیت سے آج بھی وہ شعری محفلوں کے معیار کی علامت سمجھے جاتے ہیں اور تعصب وتنگ نظری کا کوئی بھی تسلسل ان کے مقام ومنزلت پر اثر انداز نہیں ہو سکا ہے۔

ضرورت ہے کہ ان کے تمام تخلیقی شہ پاروں کو حیطۂ اشاعت میں لا کر محفوظ کر لیا جائے جو مستقبل میں ہمارے ادب کی گراں بہا میراث قرار دیئے جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کاش ہمارے قومی ادارے بھی ایسی توفیق سے بہرہ مند ہوں اور کوتاہ بینی ترک کر کے رطب ویابس کی اشاعت کا اہتمام کرنے کی بجائے جواہر ریزوں کو تلف ہونے سے بچائیں ہم حمایت صاحب کو اُن کی عظیم فن کارانہ خدمات پر ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے ان کی صحت وتندرستی کے لیے دعا گو ہیں۔

(اپریل۔جون ۲۰۰۶ء)

برسبیلِ سخن (نظمیں)

جعفر بلوچ

’’معاصر شعری منظرنامے میں اگر کوئی شاعر اور مسلمانوں کے درد سے سرشار ہو، پاکستان سے محبت کا دعوٰی دار ہو، ملکی سیاسیات پر ہنرمندی سے اظہار رائے پر قادر ہو، عام معاشرہ کی صورت حال اور عمومی انسانی مسائل کو اپنی شاعری کا بنیادی موضوع تصور کرتا ہو اور اپنے فکری مسلک و مشرب کے اعلان و اظہار کے سلسلے میں کسی نوع کی مصلحت پسندی کو روا نہ جانتا ہو، نیز اگر اس کی شاعری میں روانی و انداز بیان میں جوانی پائی جائے اور وہ شاعری کے فنی تقاضوں سے بھی آگاہ نظر آئے تو بلا تامل سمجھ لیجئے کہ وہ ہمارے خوش گفتار شاعر جعفر بلوچ ہیں‘‘

صاحب تصنیف کے بارے میں متذکرہ رائے کی اصابت اور صحت و صداقت پر اولاً ہمیں کوئی ابہام یا تشکیک اس لیے نہیں کہ صاحب الرائے کے مذاق شعروادب اور متوازن الفکر انتقادی صلاحیتوں سے راقم الحروف کا تعارف اس وقت سے ہے جب وہ ۱۹۵۸ء میں گورنمنٹ ایمرسن کالج ملتان میں منجملہ دیگر مضامین فارسی زبان وادب کے طالب علم تھے اور ہمارے ایک رفیق کار پروفیسر جابر علی جابر کے منظورِ نظر شاگرد رشید، پروفیسر جابر کی ایک خوبصورت غزل کا مطلع آج تک حافظہ کی امانت بنا ہوا ہے۔

جلتی رہے گی صبح سلگتی رہے گی شام　　　جب تک لبوں کو چھوتا رہے گا کسی کا نام

ثانیاً زیر نظر تصنیف کے تنقیدی مطالعہ کے بعد کسی بھی قاری کے لیے یہ ہرگز ممکن نہیں کہ پروفیسر ڈاکٹر اسلم انصاری کی متذکرہ رائے سے اختلاف کر سکے جن کی تجزیاتی تحریر دیگر مبصرانِ گرامی یعنی مشفق خواجہ (مرحوم) عبدالعزیز خالد اور شہزاد احمد کے نقد و تبصرہ کے ساتھ شریک اشاعت ہے۔

پروفیسر جعفر بلوچ شعروادب کی دنیا میں کوئی نو متعارف نام نہیں ان کی کم و بیش ڈیڑھ

درجن تصانیف گذشتہ تین دہائیوں سے بھی متجاوز مدت میں منصۂ شہود پر جلوہ بار ہو چکی ہیں اور ارباب علم و دانش سے سندِ اعتبار بھی حاصل کر چکی ہیں۔ ان میں تین مجموعہ ہائے شعری کے علاوہ ادبی تحقیق۔ انتقاد و تبصرہ اور حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ، راجہ محمد عبداللہ نیاز، مولانا ظفر علی خان، اسد ملتانی، اور محقق و دانشور مرحوم خلیل الرحمٰن داؤدی کے فکر و فن اور شخصیات پر تصنیف و تالیف کے جواہر پارے پروفیسر جعفر بلوچ کی علمی و ادبی کاوشوں کے غماز ہیں زیر تبصرہ مجموعہ میں شامل منظومات کو شاعر نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے چنانچہ حصہ اوّل کو ''تجلیات'' کا عنوان دیا گیا ہے جو حمد و نعت اور سلام و منقبت پر مشتمل ہے اور مظہر ہے نہ صرف شاعر کے ایقان اور جذبہ تحریم و تکریم کا بلکہ اس بلاغتِ فکر اور زبان و کلام کے ان محاسن کا بھی جو 'تجلیات' کا احاطہ کیے ہوئے ہیں، ملاحظہ ہو:

(حمد) ہمیں سلیقۂ اصلاح حال دے یارب — شدید پیاس ہے آبِ زلال دے یارب
ہمیں وقوفِ شر و خیر مرحمت فرما — ہمیں شعورِ حرام و حلال دے یارب

(نعت) نعت کا قصد ہے اگر اور خیال آبرو — تو بھی کرائے مرے قلم زمزم اشک سے وضو

جانِ کن فکاں، تو ہے اے مرے عظیم آقاؐ
کس جگہ نہیں تیری رحمت عمیم آقاؐ
دل ہم اہل ایماں کے ہیں ترے حریم آقاؐ
اے مرے کریم آقاؐ

(منقبت) بہرہ ورصدیقؓ ہیں اللہ کی توفیق سے — وہ مشرف ہیں شب معراجؐ کی تصدیق سے
شکوہِ دین نبیؐ سیّدی عمر فاروق — مُراد مصطفوی سیّدی عمر فاروقؓ
حبیب مرتضوی سیّدی عمر فاروقؓ — دلیل راہبری سیّدی عمر فاروقؓ
رشکِ مہر و ماہ ہے دامان عثمان غنی — نطق و انشا سے ورا ہے شان عثمان غنیؓ
پیغامِ برگ و بارِ در شہرِ علمؓ ہے — سرمایۂ بہار درِ شہر علمؓ ہے

انساں کی عظمت کا علَم ہے تیری یادِ حسین — زندہ بادِ حسینؓ

تا بہ ابد ہر انساں دے گا تجھکو دادِ حسین — زندہ بادِ حسینؓ

تو دینِ حق کا نقشِ فروزاں ہے یا حسینؓ — تو مظہرِ جلالتِ ایماں ہے یا حسینؓ

صدیقؓ اور عمرؓ ہوں کہ عثمانؓ و مرتضیٰؓ — تو ان تجلیوں کا نگہباں ہے یا حسینؓ

منظومات کا گوشہ جو ''حدیثِ چمن'' کے زیرِ عنوان ترتیب دیا گیا ہے مسحور کُن اسلوب جمالِ معنویت نیز وطن سے والہانہ محبت اور زعمائے وطن کی عقیدت وارادت سے سرشار کلام کا آئینہ دار ہے حکمتِ شعر جہاں شاعر کا وصف کمال ہے وہیں ملی وقومی مسائل ومصائب کے حوالے سے شاعر کی تشویش اور دردمندی قاری کے دل ودماغ کو متاثر کرتے ہیں محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کی ذہنی نشو ونما اور ادراک وشعور کی پختگی ان کی تخلیقات کا بیش بہا اثاثہ ہیں وہ احترامِ روایت اور پُر مغز و پُر معنی جدتِ فکر واسلوب سے نہایت انہماک وکاوش کے ساتھ شعر کی مشاطگی کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ دیکھئے:

(اہلِ وطن سے) بنائیں زمزمہ زار نشاط روحوں کو — دیارِ جاں میں سفیرِ غزل روانہ کریں

بہار سے متمتع ہم اہلِ گلشن ہوں — مگر اہانتِ سرمستیٔ صبا نہ کریں

(اے قلم) اے قلم تو ہے جہانِ علم وفن میں محترم — آسمانوں نے تری عظمت کی کھائی ہے قسم

(ستارۂ صبح) شب ہوئی تو جہاد فرض ہوا — چاند پر اور ہر ستارے پر

رات کو دی شکست فاش اس نے — آفریں صبح کے ستارے پر

اسی گوشے میں بعض ایسی نظمیں بھی شامل ہیں جنہیں فکر وفن کے اعتبار سے شاہکار کہا جا سکتا ہے چنانچہ ''ہم اہلِ حرم'' اور ''اب جاگو بھی'' ایسی ہی نظمیں ہیں جو شاعر کی دردمندی اور ذہنی کرب کی آئینہ دار ہیں ان کے علاوہ اقبال، قائداعظم، ظفر علی خان اور حفیظ (جالندھری) پر کہی ہوئی نظمیں شاعر کی ارادت مندانہ طبع اور حسین شعری دروبست کی غماز ہیں۔ ''آئینہ خانہ'' ہر چند بالعموم طنز ومزاح کا شگفتہ مگر شائستہ اسلوب لئے ہوئے ہے لیکن یہاں بھی معنی کی تہوں میں اگر

اُترا جائے اور بین السطور جذبہ واحساس کے درد آمیز پہلو محسوس کئے جائیں تو وہی کرب ابھر کر سامنے آجاتا ہے جو شاعر کی سنجیدہ شاعری کی روح ہے۔ ایک جگہ نظم (اقبال کا استغاثہ) میں شاعر مشرق کا حوالہ دیتے ہیں جو شاعر ''برسبیل سخن'' پر بھی صادق آتا ہے۔

''مرا یاراں غزل خوانے شمردند   من اے میر اُمم ؐ داد از تو خواہم''

جعفر بلوچ اس دیانتدارانہ اختلاف رائے کا بھی برملا اظہار کرتے ہیں جو انھیں نام نہاد اور بے بضاعت جدید شاعری اور اس کے کم سواد تخلیقی کاروں سے ہے۔

کلام تیرا جدید شاعر

سنا ہے میں نے پڑھا ہے میں نے   عجیب لفظوں کا رکھ رکھاؤ
عجب تراکیب کا چناؤ   عجیب تر ان میں استعارے
فلک کے روڑے زمیں کے تارے   بیان مفہوم کو پکارے

(نظم ابہام)

بہر کیف ہم جہاں پروفیسر جعفر بلوچ کے نقطۂ نظر کی واقعیت کو معتبر سمجھتے ہیں اور انہیں زیر نظر تصنیف پر تہنیت پیش کرتے ہیں۔ وہیں انہیں از رہ اخلاص یہ مشورہ بھی دینا چاہتے ہیں کہ اگر ممکن ہو تو مستقبل میں وہ طنز و مزاح پر مبنی اپنی شگفتہ تحریروں کو انفرادی حیثیت میں طبع کرائیں تاکہ ناقدین ان کے سنجیدہ کلام کی ذہنی کیفیات سے مُبرا ایک علیحدہ صنف سخن کے طور پر ان کے فکروفن کا جائزہ لے سکیں۔

(جولائی۔ستمبر ۲۰۰۶ء)

پطرس بخاری۔ شخصیت اور فن

عبدالحمید اعظمی

پطرس بخاری مرحوم ہمہ جہت شخصیت تھے، انگریزی اور اردو زبان وادب میں ان کا نام سند کا درجہ رکھتا ہے مگر جس طرح غالب کو فکر وفن کی کثیر الجہتی کے باوجود اپنے مختصر اردو کلام کے سبب شہرتِ دوام حاصل ہوئی بالکل اسی طرح پطرس کی شہرت اُن کے مختصر مجموعہ مضامین کے مرہون منت ہے گویا ''دیوانِ غالب'' اور ''مضامین پطرس'' اپنے اپنے سیاق وسباق میں یکساں انداز کی نتیجہ آفریں تصانیف ہیں۔ شخصیت جس قدر بلند وبالا ہوگی اُس کے مبصرین وناقدین کے لیے بھی ضروری ہوگا کہ وہ فکر ونظر کے اعلیٰ اوصاف کے مالک ہوں ورنہ نقد وتجزیہ کا حق ادا نہ ہو سکے گا۔ عبدالحمید اعظمی کی زیرنظر کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ انہوں نے ایک شارح، مبصر اور مورخ کا کردار پوری علمی بصیرت اور محققانہ ذکاوت وذہانت سے ادا کیا ہے وہ خود ایک صاحب طرز انشا پرداز اور بسیط الفہم اہل علم ہیں۔ شخصیت اور فن کے حوالوں سے جس جانکاہی اور ژرف نگاہی سے انہوں نے اختصار مگر جامعیت سے پطرس کی جمیع الصفات زندگی کا احاطہ کیا ہے وہ ان پر اب تک کئے جانے والے تحقیقی کاموں میں سب سے زیادہ منفرد اور وقیع ہے۔

اعظمی کی یہ علمی کاوش کئی برسوں کی تحقیق وجستجو پر محیط ہے۔ ان کے مآخذِ تحقیق میں مرحوم صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کی تحریروں اور ملاقاتوں کے علاوہ کوئی تین درجن اردو کتب، رسائل وجرائد اور تقریباً ڈیڑھ درجن انگریزی زبان کی کتب، اخبارات اور عالمی سطح کے مستند آرکائیوز شامل ہیں۔ اس کے علاوہ فاضل مصنف نے تقریباً دو درجن معروف ومستند شخصیات سے انٹرویو لیے، جن میں ریڈیو کی اہم شخصیات قاضی احمد سعید، سید انصار ناصری، حمید نسیم احمد حسن شیخ، سید ظفر حسین، عشرت رحمانی، کے جی علی ڈائریکٹر آل انڈیا ریڈیو اقبال سنگھ، مسعود تابش، اور ایس۔ اے عزیز کے علاوہ مولوی محمد سعید، آغا بابر، صادق نسیم، ڈاکٹر محمد اجمل، حمید علوی، آغا بشیر، آغا

عبدالحمید، اعجاز بٹالوی، سحاب قزلباش اور مرزا ادیب جیسی ہستیاں شامل ہیں جن سے پطرس مرحوم کے بارے میں وہ معلومات میسر آئیں جن کے لیے متبادل ذرائع ممکن نہیں۔

کتاب کے مختصر پیش لفظ کا آغاز جسے خود عبدالحمید اعظمی نے تحریر کیا ہے، ایک ایسے خوبصورت اور ''گنجینۂ معانی'' قسم کے جملے سے کیا گیا ہے جو مصنف کی سوانح نگاری کا شاہکار ہے۔ ملاحظہ ہو:

''انسان کی شخصیت ایک قفل ابجد کی طرح ہوتی ہے جس کے کلیدی اعداد اس کے اب وجد کی رگ و پے میں پیوست ہوتے ہیں۔''

اعظمی اپنا مدعائے نگارش بھی اس طرح بیان کرتے ہیں:

''میں نے سوانح کے بیان میں کوشش کر کے ان کی تحریروں اور خطوط ہی کو بنیاد بنایا ہے تاکہ سطر سطر میں پروفیسر بخاری کا عکس جھلکتا رہے اور اپنے اس قول پر پورا اترتے نظر آئیں کہ ''وہ شخص انمول ہے جو اپنی تحریروں سے ہزارہا لوگوں کو خوش کر دیتا ہے۔''

پطرس کے سوانح نگار کی حیثیت سے عبدالحمید اعظمی معتبر بھی ہیں اور موقر بھی کہ وہ ریڈیو کی طویل ملازمت کے بعد ایک اعلیٰ منصب سے ریٹائر ہوئے۔ انھوں نے کتاب کو جن عنوانات میں تقسیم کیا ہے ان سے پروفیسر بخاری کی متنوع اور مدوجزر سے لبریز زندگی کے تمام اہم نقوش واضح ہو جاتے ہیں مثلاً ان کی زندگی میں گورنمنٹ کالج لاہور۔ ریڈیو اور اقوام متحدہ سے وابستگی کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور۔ میں ان کا طالب علمی کا دور ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۲ء تک جاری رہا جہاں بحیثیت طالب علم بھرپور زندگی گزاری اور مجلّہ ''راوی'' کی ادارت کے فرائض انجام دیئے ۲۶۔۱۹۲۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ (کیمبرج) گئے۔ اعظمی نے اس عہد کے واقعات کو اپنے مخصوص طرز تحریر سے جاذب توجہ بناتے ہوئے ایک دلچسپ واقعہ بیاں کیا ہے، جو ۱۹۲۲ء سے گورنمنٹ کالج میں بحیثیت لیکچرار ۱۹۳۵ء تک کی ملازمت کے دوران پیش آیا جس کے بعد مرحوم کو گورنر پنجاب نے ایک انگریز استاد کی جگہ انگریزی زبان و ادب کے شعبہ کا سربراہ مقرر کر دیا۔ ۱۹۴۷ء میں ایک اور انگریز استاد پروفیسر ڈکنسن (Dickenon) کے ریٹائرمنٹ کے بعد گورنمنٹ کالج کے پرنسپل مقرر

ہوئے۔

فاضل سوانح نگاریوں تو پروفیسر موصوف کی زندگی کی تمام اہم جہتوں کو حیطۂ تحریر میں لائے ہیں لیکن حکمت و دانش سے مملو حیات پطرس کو خصوصیت سے مرکز توجہ بنایا ہے چنانچہ ۱۹۴۹ء میں اقوام متحدہ میں پاکستان کا مندوب مقرر ہونے کے بعد سے اُسی ادارہ میں انڈر سیکرٹری انچارج پبلک انفارمیشن جیسے ممتاز وارفع منصب پر تقرری اور بیرون ملک بالخصوص مغربی دنیا میں اپنے دل دماغ کی صلاحیتوں کا جس طرح پروفیسر پطرس نے لوہا منوایا۔ اُسے صاحب کتاب نے نہایت دلپذیر انداز میں سپرد قلم کیا ہے ریڈیو سے وابستگی جس ڈرامائی انداز میں ہوئی اسے مرحوم ہی کے ایک نابغۂ روزگار معاصر پروفیسر رشید احمد صدیقی کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ مرکزی حکومت کے ایک انتخابی بورڈ میں پنجاب کی نمائندگی کرتے ہوئے کس طرح بورڈ کے انگریز سربراہ مسٹر فیلڈن کو اپنی ذہانت وعلمیت سے نہ صرف متاثر کیا بلکہ اس قدر مرعوب بھی کیا کہ اس نے بطرس مرحوم کی ریڈیو میں تقرری کے لیے وائسرائے لارڈ لنلتھگو سے خصوصی احکام حاصل کیے۔ جہاں ۱۹۴۰ء میں مسٹر فیلڈن کی جگہ کنٹرولر مقرر ہوئے اور ۱۹۴۳ء میں یہ عہدہ ڈائریکٹر جنرل کے عہدہ میں تبدیل کر دیا گیا۔

فاضل مصنف نے کتاب میں پطرس بخاری کے تقریباً دو درجن شاگردان رشید کے اسماء بھی دیئے ہیں جو علم وخبر کی دنیا کے اہم ترین نام ہیں مثلاً فیض احمد فیض، ن۔م۔راشد، مظہر علی خاں، کنہیالال کپور اور حفیظ ہوشیار پوری وغیرہ۔ بخاری مرحوم کی ادبی تخلیقات میں مضامین پطرس کے علاوہ پطرس کے خطوط' افسانے، ڈرامے، اور ناولٹ، خطبات پطرس، تنقیدی مضامین اور اقوام متحدہ میں تقاریر کا احاطہ کیا گیا ہے اور آخر میں شجرۂ نسب بھی دیا گیا ہے کہ پطرس کے ''صحیح بخاری'' ہونے میں کسی کو کوئی شک وشبہ نہ رہے۔ غرض فاضل مصنف نے صرف ۱۴۴ صفحات پر مشتمل جامعیت کی اس شاہکار تصنیف کو حیات پطرس کے حوالے سے ''جام جہاں نما'' بنا دیا ہے۔ کاش وہ اس کی طباعت واشاعت کا اہتمام خود کرتے تو کتاب کے اکثر ناقابل درگزر معائب کے سبب خود بھی ذہنی کوفت سے بچ جاتے اور قارئین بھی۔

(جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۶ء)

می رقصم (شعری مجموعہ)

انور شعور

''می رقصم''، حضرت عثمان مروندی المعروف بہ حضرت لعل شہباز قلندرؒ کی مشہور غزل کی کیف پرور ردیف کو اپنے اردو شعری مجموعہ کا عنوان قرار دینا انور شعور کی مجتہدانہ فکر کی آئینہ داری بھی ہے اور کلام کے مجموعی تاثر کی ترجمانی بھی۔ ایک سو بارہ غزلوں پر مشتمل یہ تازہ مجموعہ شاعر کے جذبہ و احساس اور تصور و تفکر کا ایک ایسا رقص جمیل پیش کرتا ہے جس میں سادگی و پُرکاری اور بیخودی و ہشیاری کی تمام کیفیات مجتمع ہیں۔ یعنی شعور ہی کے اپنے الفاظ میں:

کون و مکاں کے آئینہ خانوں کے درمیاں　　　دل کا جہان بھی ہے جہانوں کے درمیاں

مشفق خواجہ مرحوم کی تحریر ''کچھ انور شعور کے بارے میں'' بہت کچھ ہی نہیں بلکہ شاعر کے فکر و فن اور زندگی کے سیاق و سباق کی تفہیم کے لیے ''سب کچھ'' کا درجہ رکھتی ہے چنانچہ زیر نظر کلام کے مطالعہ کے بعد بمشکل ہی کوئی ناقد یا صاحب نظر قاری خواجہ صاحب کی درج ذیل رائے سے اختلاف کر سکے۔

''شعور کی غزل کے لیے میں نے ''مختلف اور منفرد'' کے جو الفاظ استعمال کئے ہیں انہیں رعایتی توصیف نہ سمجھا جائے اس سے میری مراد یہ ہے کہ اب تک اردو غزل کے جتنے سانچے اور جتنے اسالیب ملتے ہیں شعور کی غزل ان سب سے الگ ہے۔ اس کی اپنی ایک فضا ہے۔ اپنا ایک مزاج ہے یہاں تک کہ ذخیرۂ الفاظ بھی مروجہ غزل کے ذخیرۂ الفاظ سے بڑی حد تک مختلف ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ شعور کی غزل ہماری شعری روایات سے یکسر انحراف کی مثال ہے اپنی شعری روایات سے جتنی واقفیت شعور کو ہے اتنی کم شاعروں کو ہو گی لیکن شعور نے بنے بنائے سانچوں پر انحصار نہیں کیا اپنی شعری روایات

سے استفادہ کرتے ہوئے ایک الگ راہ نکالی ہے اور ایک الگ لہجے کی تشکیل کی ہے جس سے نئی غزل کی وسعتوں اور امکانات کا اندازہ ہوتا ہے''۔

خواجہ صاحب کے اس دعوے یا مفرضہ کے ثبوت میں ملاحظہ ہو:

شعور خود کو ذہین آدمی سمجھتے ہیں — یہ سادگی ہے تو واللہ انتہا کی ہے

اس کے بعد ہماری شاعری میں شعراء کی روایتی ''تعلی'' کے تمام اسالیب پھیکے پھیکے نظر آنے لگتے ہیں یہی نہیں بلکہ روایت سے بغاوت کئے بغیر روایت کو سادہ مگر پرکشش بنانے میں شعور کی تخلیقی برجستگی اور لفظ و معنی کی مکمل ہم آہنگی نے خاص کردار ادا کیا ہے ان کے یہاں فنی محاسن کا ادراک بھی واضح ہے اور ابلاغ کا حسن بھی ملاحظہ ہو:

اُس بے وفا سے داد وفا مل گئی ہمیں — ہم نے بُرائی کی تھی سزا مل گئی ہمیں
گیسوئے شب کھلے تو ہمیں نیند آگئی — سو کر اٹھے تو باد صبا مل گئی ہمیں
اڑنے لگا دماغ ہواؤں میں دفعتاً — خوشبو جو اس پری کی ذرا مل گئی ہمیں
زمین و آسماں ہوتے ہوئے بھی — میں بے گھر ہوں مکاں ہوتے ہوئے بھی
محبت کی کہانی دلنشیں ہے — دکھوں کی داستاں ہوتے ہوئے بھی
ہزاروں خوبیاں ہیں آدمی میں — ہزاروں خامیاں ہوتے ہوئے بھی

اہل علم و دانش نے اچھے شعر کی تعریف میں مختلف نقطہ ہائے نظر بیان کئے ہین لیکن زیر نظر مجموعۂ شعری کے مطالعہ کے بعد الطاف حسین حالی کی رائے حافظہ میں گردش کرنے لگی جو کچھ اس طرح ہے کہ ''شعر سن کر یا پڑھ کر آدمی محسوس کرے کہ یہ بات تو وہ بھی کہہ سکتا ہے مگر جب کہنا چاہے تو نہ کہہ سکے۔'' یہ طلسم انور شعور کی شاعری کا جزو اعظم دکھائی دیتا ہے، ان کی فکر کی ندرت آفرینی جب سہل و سادہ لفظوں میں ڈھلتی ہے تو فلسفہ ہو یا نظریہ۔ تلمیح ہو یا تشبیب ابہام ہو یا ایہام شعر میں دل کو چھو لینے کی کیفیت ولذت پیدا کردیتی ہے۔ چند اشعار:

حرم کو دیر خدا کو صنم سمجھتے رہے
مگر غلط بھی نہیں تھا جو ہم سمجھتے رہے

ہے دماغ آسمان پر میرا
گو مری دسترس میں خاک نہیں

ہوس بلا کی محبت ہمیں بلا کی ہے
کبھی بتوں کی خوشامد کبھی خدا کی ہے

بے سیاق و سباق ہوتا ہے
عشق اک اتفاق ہوتا ہے

اُترتی ہی نہیں گندم کی مستی
یہ دانہ دام ہو کر رہ گیا ہے

لمحہ لمحہ ہے انقلاب انگیز
اور آثارِ انقلاب نہیں

تعاقب خمستاں خمستاں مرا
غم و رنج و آلام کرتے رہے

مرے ساتھ ساتھ آپ کا انتظار
ستون و درو بام کرتے رہے

رہتی ہے کشمکش ہی دونوں میں
ذہن پُرکار اور دل سادہ

بولنا چاہتے ہیں سچ لیکن
ہم نہیں خود کشی پہ آمادہ

سادگی ُسلاست ٗروانی اور برجستگی شعور کے کلام میں ایک شفاف ولطیف بہتی ندی کا روپ دھار لیتے ہیں جو ہر مدو جزر سے بے نیاز پُرسکون بھی ہے اور روح پرور بھی ان کا کمالِ فن یہ ہے کہ وہ ہر تفصیل کو نہایت خوبصورتی سے اجمال میں ڈھال دیتے ہیں جو یقیناً ایک مشکل کام ہے جس کے لیے وہ انتخاب بھی ایسی بحروں کا کرتے ہیں جو بالعموم مختصر ہوتی ہیں اس میدان میں اُن کی کامیابی اظہر من الشمس ہے عصری موضوعات کا شعور ان کی شاعری میں نمایاں ہے جب کہ داخلی واردات کے اظہار کے لیے اُن کا اسلوب شگفتہ انداز میں احترامِ روایت سے مملو نظر آتا ہے ُثبوت کے طور پر:

یہ جانتے ہوئے بھی گزاری ہے زندگی
ہم زندگی کے ہیں نہ ہماری ہے زندگی

دریافت ہو رہے ہیں ستارے نئے نئے
شاید یہی ستارہ شماری ہے زندگی

بہتی ہوئی ندی پہ کسے اختیار ہے
میری ہے زندگی نہ تمہاری ہے زندگی

پچھتاؤ نہیں لغزش پا ہو گئی ہو گی
انسان سے ہوتی ہے خطا ہو گئی ہو گی

میں رات گئے نیند میں نکلا تھا اکیلا ہمراہ مرے باد صبا ہو گئی ہو گی
یہ خاک یہ افلاک مرا گھر ہے یہی کچھ تکیہ ہے اسی پر کہ میسر ہے یہی کچھ
رہ رہ کے زمیں دیکھتے رہتے ہیں فلک سے افتادِ مزاج مہ و اختر ہے یہی کچھ
پیمانہ تو بھرتا ہے طبیعت نہیں بھرتی انسان کا دنیا میں مقدر ہے یہی کچھ

''می رقصم'' کا شاعر محتاج تعارف نہیں تاہم کلام کے بین السطور اُس کے فکر ونظر کا سراپا واضح طور پر دکھائی دیتا ہے، اُس کی شخصیت جو خارجیت و داخلیت کا متوازن امتزاج ہے لفظ و معنی کی تہوں سے کریدی جاسکتی ہے۔ ذات وصفات کا اندازہ کرنا ہو تو لب ولہجہ ہی نہیں بلکہ جذبہ و احساس کا ہر زاویہ شعور کی شاعری میں منعکس دکھائی دیتا ہے، چنانچہ یہی انفرادیت ہے زیر نظر مجموعہ کی بھی اور پیش نظر مصنف کی بھی۔

شاہانہ بھی کٹتی ہے فقیرانہ بھی لیکن ناچیز کو زیبا نہ فقیری ہے نہ شاہی
وفا ہو پیار ہو ایثار ہو مروت ہو انہیں صفات سے تشکیل ذات ہوتی ہے
زندہ رہتے ہیں خود آگاہ دل آزاروں میں مسکراتے ہوئے پھولوں کی طرح خاروں میں
میں صرف دل کی حفاظت پہ زور دیتا ہوں کہ دل نہ ہو تو سراسر فضول ہے دنیا

(جولائی۔ستمبر ۲۰۰۶ء)

دل کی باتیں

ثاقبہ رحیم الدین

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی تصنیف یا تالیف پر تبصرہ و تجزیہ کا عمل مصنف و مولف کی کثیر الجہت شخصیت کے سبب پس منظر میں چلا جاتا ہے اور وہ توجہ جو کتاب کے مندرجات پر مرکوز ذہنی چاہیئے وہ لکھنے والے کے معروف و معلوم اوصاف کی طرف منتقل ہو جاتی ہے چنانچہ یہی دشواری زیر نظر کتاب کا انتقادی جائزہ لیتے وقت پیش آ رہی ہے کہ مصنفہ کی شخصیت اور ان کے فکر و فن کے متعدد ایسے حوالے ہیں جن سے صرف نظر کرنا انہیں موخر کرنا اس لیے ممکن نہیں کہ کتاب کا سرنامہ ہی یعنی ''دل کی باتیں'' مصنفہ کی داخلی شخصیت کی طرف واضح رہنمائی کرتا ہے اس اعتبار سے کتاب کی منفرد حیثیت متقاضی ہے کہ مصنفہ کی شخصیت کے اُن پہلوؤں کا جائزہ بتقدیم لیا جائے جو کتاب کے عنوان اور موضوع دونوں کو توجیہہ فراہم کرتے ہیں۔

ثاقبہ رحیم الدین کا تعارف کرانا اس لیے بے جواز ہوگا کہ نہ تو زیر تبصرہ تصنیف ان کی اولین قلمی کاوش ہے اور نہ علم و ادب سے اُن کی وابستگی غیر معروف، دو درجن سے متجاوز کتب ان کا ورشۂ تحریر ہیں جو موضوعات کے اعتبار سے متنوع بھی ہیں اور ان کے مخصوص زاویہ ہائے نظر کے آئینہ دار بھی۔ ان تصانیف میں 'محفل تنہائی' (ادبی تحریریں)' تہذیب کے زخم' (مضامین اور افسانے) 'درد ہی درد'، 'محبت' اور 'گلہائے رنگ رنگ' جیسی تخلیقات جن میں انشائیے بھی شامل ہیں سر فہرست ہیں یہ سب اہلِ علم و خبر میں پذیرائی حاصل کر چکی ہیں ان کے علاوہ بیگم صاحبہ کے نمایاں ترین رجحان اور اُن کی فکری ترجیحات کی متعدد دیگر کتب جو غماز ہیں وہ تمام تر بچوں کے ادب سے متعلق ہیں اور یہی ان کی شخصیت کا دلنواز پہلو بھی ہے۔ تعلیم و تہذیب اور نونہالوں میں کردار کی تشکیل و تعمیر کا جو غالب رجحان بیگم صاحبہ کا اثاثۂ فکر و فن بن گیا ہے وہ ان کے جلیل القدر خانوادے کے بزرگوں کا فیضان ہے۔ والد ڈاکٹر محمود حسین مرحوم معروف

مورخ و مصنف، کراچی اور ڈھاکہ کی جامعات کے وائس چانسلر اور پاکستان کے وزیرِ معارف۔ چچا ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم عظیم ماہرِ تعلیم اور بھارت کے صدرِ مملکت اور دوسرے چچا ڈاکٹر یوسف حسین مرحوم جن کی تصانیف نے اردو ادب میں تحقیق و تنقید کے نئے در وا کیے اور جنھیں دیوانِ غالب کا انگریزی ترجمہ کرنے پر بھارت کے عظیم ترین ادبی اعزاز ''پدم بھوشن'' سے نوازا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ فیضانِ نسبی زیرِ تبصرہ تصنیف کی مصنفہ کا سرمایۂ افتخار ہے۔

''دل کی باتیں'' کم و بیش پونے پانچ سو صفحات پر مشتمل تصنیف ہے جو مصنفہ کے معارفِ قلبی اور وجدان کی گوناں گوں کیفیات کا مرقع ہے جس کا اُسلوب اس لیے منفرد ہے کہ کتاب کا مطالعہ قاری پر خود کلامی جیسی واردات منکشف کرتا ہے۔ روحانی طہارت اور تخئیلی رفعت کا جذب و کیف سے مملو ایک ایسا ماحول پڑھنے والے کے حواس کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے جہاں عبد و معبود کے درمیان تمام حجابات تحلیل ہو جاتے ہیں گویا کتاب کے منتشر و متنوع موضوعاتِ فکر خالق و مخلوق کے درمیان ایک مکالمے کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں یہ موضوعات سائل و مسئول کے درمیان براہ راست ترسیل و ابلاغ کا روحانی عمل ہیں جن سے سائل کے دل و دماغ کی وہ تمام کیفیات واضح ہو جاتی ہیں جن کی جڑیں اس دنیائے رنگ و بو میں پیوست ہیں۔ اس حقیقت کا ثبوت درج ذیل اقتباس سے فراہم ہوا ہے جو مصنفہ کے خود تحریر کردہ کتاب کے ''ابتدائیہ'' سے لیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

> ''ہم اپنے آپ میں اور اپنی سوچوں میں گم ہیں کہ یہ دنیا کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ پر اب وقت نہیں رہ گیا ہے کہ ہم اسے جانیں اور سمجھیں۔ بس میرے اللہ بس! تم جانو اور تم سمجھو۔ یہ دنیا تمہاری زمین و آسمان تمہارے اور یہاں کے سب لوگ تمہارے، ہم ٹھہرے ایک فقیر ایک مسافر بس۔ نیم تلے رین بنا کر اپنی راہ لیں گے۔''

یہی اُسلوب تمام کتاب کا احاطہ کیے ہوئے ہے جس کا مطالعہ استغراق و محویت پیدا کرتا ہے کہ یہ وہ موضوعات ہیں جن کی تہہ تک بقول اقبال ''من میں ڈوب کر'' ہی پہنچا جا سکتا ہے۔

کتاب مطالعہ کے لیے سکون اور تنہائی چاہتی ہے کیونکہ اس میں باطنی تجربات کا برملا بے تکلف اور بے محابا اظہار موجود ہے جو عبد اور معبود کے والہانہ تعلق کو استوار کرتا ہے بس ایک مزید اقتباس پر اختتامِ کلام:

''ہماری فضاؤں اور ہماری ہواؤں میں ہوس اور حسد کا زہر گھلا ہے کہ سانس لینا دشوار ہے یہ ایسا حبس ہے کہ لوگ لُو کی چاہت کرنے لگتے ہیں۔ ہماری آنکھوں میں خاک سی اڑتی رہتی ہے جانے کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں۔ یہ آنکھیں ہر دم' کچھ زمانے سے ہمارے سامنے انجانے راستے، بے نشان گلیاں، نیا آسمان، بیگانی زمین اور اجنبی ہوائیں ہیں، ہم جائیں تو کدھر جائیں اور کدھر جا رُکیں۔ اب تک جیون کا سفر کچھ اور تھا اور اب جیون کے بعد کا سفر کچھ اور ہوگا۔ ہوگا کیوں۔۔۔ یہ تو شاید شروع ہے اور ہم پہلا قدم دھر چلے ہیں، دل کے بند دریچے کھلے اور تازہ ہوا آئی ہے، گھڑی دو گھڑی کی بات ہے سامنے نئی زندگی ہے اور ہمیشہ رہنے والی زندگی۔''

(اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۶ء)

کیفِ دوام

محمد حسن زیدی

حسن زیدی خوش نصیب ہیں کہ ان کے فکرِ سخن کا پہلا نقشِ تخلیق نعتیہ مجموعے کی صورت میں اُفق ادب پر طلوع ہوا ہے یہ وجہ سعادت بھی ہے اور باعث تکریم بھی کہ نعت اب ایک دل آویز اور دل پذیر صنف سخن ہی نہیں بلکہ حُب رسولؐ سے سرشار اہل ارادت کے لیے جزو ایمان بھی ہے۔ خدا شناسی کا وسیلہ ہی نہیں خدارسی کا ذریعہ بھی ہے بقول اقبالؒ:

بہ مصطفٰےؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست ‏ ‏ اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی ست

چنانچہ ''کیف دوام'' جو شاعر کی باطنی بلکہ روحانی کیفیات کا مرقع ہے ایک مخصوص جذباتی شیفتگی اور طہارت فکر کا غماز ہے۔ مجموعے کی یہ جہت اس قدر اظہر من الشمس ہے کہ شاعر بعض نشیب وفراز کے ایسے مراحل سے بھی عالمِ سرخوشی میں بے نیازانہ گزر گیا ہے جہاں ہوسکتا ہے کہ سطح بیں ناقدان فن ابلاغ واظہار کے اس انداز کو محل نظر قرار دیں لیکن یہ ہرگز ممکن نہیں کہ شاعر کے اخلاص فکر سے صرفِ نظر کیا جاسکے حسن زیدی کا ایمان وایقان ملاحظہ ہو:

شرف ملا یہ مجھے ان کی خاک پا ہوکر ‏ ‏ رہے زمانے میں اکسیر و کیمیا ہوکر
نبیؐ کو دیکھ کے ہم نے خدا کو پہچانا ‏ ‏ حق آشنا ہوئے آگاہِ مصطفٰےؐ ہوکر
اٹھا یہاں سے نہ اے گردشِ زمانہ مجھے ‏ ‏ در حبیب پہ آیا ہوں جا بجا ہوکر

''کیف دوام'' کے مصنف کی اس ذہنی ساخت میں مکتب کی کرامت سے کہیں زیادہ نظر کا فیضان کارفرما دکھائی دیتا ہے کہ ان کی تربیت و پرورش کے نقوش ان کے کردار اور فکر ونظر میں ڈھلتے چلے گئے چنانچہ زیر تبصرہ مجموعہ کو مصنف نے اپنے گرامی منزلت والدین سے معنون کیا ہے اور عنوانِ کلام خود ان کے ایک نعتیہ شعر سے ماخوذ ہے۔ تقاریظ میں نعیم فاطمہ علوی کا درج ذیل

مختصر مگر جامع تاثر خلاصۂ کلام کی حیثیت رکھتا ہے۔

''حسن زیدی صاحب کی غزلیہ نعتیں تمام بیقراریوں، بے چینیوں اور اضطرابوں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں اور فنی محاسن سے بھی مُزین نظر آتی ہیں۔''

''غزلیہ نعتیں'' کہہ کر تقریظ نگار نے شاعر کے محبوب و مرغوب اسلوب شعری کی طرف واضح اشارہ کیا ہے جس کا ثبوت کلام کا مطالعہ مہیا کرتا ہے۔ اکثر و بیشتر مقامات پر تغزل آمیز اُسلوب نگارش نے کلام کو تازگی عطا کی ہے مثلاً

چہرہ دکھا کے خلق کو حیران کر گئے — خوبانِ دو جہاں کو پشیمان کر گئے
اللہ رے تجلیٔ سرکارؐ دو جہاں — جان اپنی مہر و ماہ بھی قربان کر گئے

غمِ رسولؐ میں زار و نزار بیٹھے ہیں — قرار دل کو نہیں بیقرار بیٹھے ہیں
خوشا طریقۂ عشاق راہِ طیبہ میں — کبھی چلے کبھی شکلِ غبار بیٹھے ہیں

اے صلی اعلیٰ جب دل کی طرف وہ آنکھ اٹھائی جاتی ہے
اک دل ہی نہیں ساری دنیا مخمور سی پائی جاتی ہے
اُس بزمِ مقدس و عالی کے آداب جدا ہیں، رسم جدا
ساغر کا حسن یاں ذکر ہی کیا نظروں سے پلائی جاتی ہے

رہا سوال فنی محاسن کا تو کتاب کے مطالعہ سے شاعر کے فکر و فن کا ارتقا واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ احساس پختہ ہونے لگتا ہے کہ ''کیفِ دوام'' کے مصنف کا شعری سفر جب آئندہ مجموعہ کے ''نقش ثانی'' تک پہنچے گا تو انتقاد و تجزیہ کی کوئی بھی میزان کلام کو سند اعتبار عطا کر دے گی یہ آثار زیر نظر مجموعہ میں عروض و لسانیات کے قدر شناسوں کو صاف نظر آ رہے ہیں مثلاً

روح شاداں ہے مدینے کی طرف جاتے ہیں ہم — خوبیٔ قسمت پہ کیا کیا آج اتراتے ہیں ہم
سنگِ اسود تیرے بوسے کی تمنا ہے مگر — یاد آتی ہے سیہ کاری تو شرماتے ہیں ہم

وادیٔ غربت میں کوئی پوچھنے والا نہیں — ہم کو سمجھتا ہے دل یا دل کو سمجھاتے ہیں ہم
مثل ان کا آج تک نادیدہ ہے — ان کی صورت کا تو رب گرویدہ ہے
جامِ ما زاغ البصر کا ہے سُرور — آنکھ ہے یا نرگس خوابیدہ ہے
کس قدر ہے تابع فرمانِ سرور آفتاب — اک اشارے میں نکل آیا مکرّر آفتاب
ہر سحر کے وقت لے لے کر گہرہائے نجوم — روضہ اقدس پہ کرتا ہے نچھاور آفتاب
دن کو کرتا ہے طوافِ روضہ خیرالوریٰ — قبر پر مشعل بکف رہتا ہے شب بھر آفتاب
دیکھا جو نور روئے رسالت مآبؐ کا — غیرت سے رنگ زرد ہوا آفتاب کا
شہید تیغِ ابروئے نبیؐ ہیں — کھلے گا حشر میں جوہر ہمارا
پوچھو نہ دل آویزیٔ صحرائے مدینہ — کانٹا بھی مجھے پھول سے خوش تر نظر آیا

زیرِ نظر مجموعہ میں تمام روایتی تقاضوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ چنانچہ آغازِ کلام کے طور پر حمد کا درج ذیل دعائیہ شعر حسن زیدی کی والہانہ آرزوؤں کا مظہر ہے۔

حسن بھی پیروِ حسّان ابنِ ثابت ہے — جہانِ شعر میں تُو اس کو مستند کرنا

مجموعہ میں سو سے زیادہ نعتیں شامل کی گئی ہیں اور پہلی نعت کا آغاز جس خوبصورت مطلع سے کیا گیا ہے وہ یہ ہے:

مجھ کو مولاؐ نے مقدر کا سکندر رکھا — دل کو یادِ شہہ بطحیٰ سے منور رکھا

اس ضمن میں جو بات خاص طور پر جاذب توجہ ہے وہ صاحب کتاب کا اساتذۂ شعر کے تتبع کا رجحان ہے چنانچہ انہوں نے متقدمین و متوسطین اور موخرین و معاصرین کے مطالعہ کو اپنی فکر شعر کا رہنما بنایا ہے غالب کی زمین مین حسن کے دو شعر ملاحظہ کیجئے:

اے کاش پڑھوں نعت میں دربار نبیؐ میں — سرکار بھی خوش ہو کے یہ فرمائیں کہ "ہاں اور"
ایک علم وعمل کا ہے سمندر تہہ سیرت — سمجھو گے تو کھل جائیں گے کچھ رازِ نہاں اور

روایتی تقاضوں ہی کے سلسلہ میں اپنے مجموعہ کو اختتامی قطعاتِ تاریخ سے مزین کرنے کی سعی بھی کی گئی ہے چنانچہ اس باب میں صنعتِ تضارَب میں کہی ہوئی صابر براری (جن کا انتقال حال ہی میں کراچی میں ہوا ہے اللہ ان کی مغفرت فرمائے) کی تاریخ جس سے کتاب کا ہجری سنِ اشاعت ۱۴۲۶ برآمد ہوتا ہے نہایت برجستہ و برمحل ہے۔

''کیفِ دوام ایک کتاب جمیل ہے''

آخر میں بے محل نہ ہوگا اگر کتاب میں شامل مصنف کی تحریر بعنوان ''سفر نعت'' سے ایک ایسا اقتباس پیش کر دیا جائے جوان کے فکری والہانہ پن اور عمیق جذباتِ ارادت وعقیدت پر مبنی ہے اور جس سے قارئین ان کے اشعار میں ایک اضطراب پیہم کی تیزی سے کروٹیں بدلتی ہوئی پرچھائیاں دیکھ سکتے ہیں۔ حسن لکھتے ہیں:

''دنیا میں خوشی وسرخوشی'' طمانیت اور قلبی سکون کے جتنے مواقع اور سامان موجود ہیں ان میں سب سے زیادہ خوبصورت اور لطیف لمحہ وہ ہوتا ہے جب مدحت مصطفےٰ کے مضامین میرے قلب وزبان پر نعتیہ اشعار کی شکل میں اتارے جارہے ہوں۔ ایسے عالم میں مجھے تو کم ازکم یہ احساس نہیں ہوتا کہ میں ماڈی اور خود غرض دنیا میں موجود ہوں لگتا یوں ہے کہ وہاں سے نکل کر کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گیا ہوں۔ یہیں کچھ دیر کے لیے خیمہ زن ہو گیا ہوں''

اِدھر دیکھئے یا اُدھر دیکھئے — انہیں کا ہے جلوہ جدھر دیکھئے
فلک دیکھئے بحر و بر دیکھئے — ہیں انوار آقاؐ جدھر دیکھئے
نہ امت کو بھولے کسی حال میں — عنایات خیر البشرؐ دیکھئے
حسن آپ کے جان نثاروں میں ہے — اسے بھی ذرا اک نظر دیکھئے
دل غریب کو بے انتہا خوشی ہوگی — جو بارگاہِ رسالتؐ میں حاضری ہوگی
زباں پہ ہوگا صلوٰۃ و سلام کا نعرہ — جبیں شوق ادب سے جھکی ہوئی ہوگی
کبھی نظارۂ گنبد کبھی طوافِ حرم — وہ زندگی بڑی راحت کی زندگی ہوگی

ہر گھڑی کھنچتا ہے نفسِ سیہ کار مجھے
ہاں بچا لیجئے اب احمدؐ مختار مجھے

کاش وہ پوچھیں کسے شوق ہے پابوسی کا
میں کہوں دوڑ کے یا سیّدِ ابرارؐ مجھے

دے کے اغیار کی زنجیر غلامی سے نجات
کیجئے حلقہ گیسو میں گرفتار مجھے

ہر چند روکتی رہی در مانگی مجھے
موج ہوائے شوق اڑا لے گئی مجھے

میں جوش واضطراب میں بڑھتا چلا گیا
منزل نگاہ شوق سے تکتی رہی مجھے

درودوں کے سہرے میں نعتوں کی لڑیاں
بڑی شان سے ہم مدینے سدھارے

سرورِ سروراں نبیؐ رہبر رہبراں نبیؐ
عرصہ کائنات میں آرزوئے جہاں نبیؐ

رشکِ ریاض خلد ہے کوئے مدینۂ نبیؐ
کوثر و سلسبیل ہیں جوئے مدینۂ نبیؐ

خلاؤں میں آج اڑنے والو تمہیں یہ شاید خبر نہیں ہے
کہ سیکڑوں سال پہلے تم سے حضورؐ پہنچے ہیں لامکاں تک

حسن زیدی جو حسنِ صورت اور حسنِ سیرت سے متصف ہیں شعری محفلوں میں اپنے حسنِ ترنم کی بھی داد پاتے ہیں:

حسن کو لیتے ہیں قدسی حصار رحمت میں
سنانے بزم میں جس دم کلام آتے ہیں

(اکتوبر۔دسمبر ۲۰۰۶ء)

قائداعظم جناح۔ برصغیر کا مردِ حُرّیّت

شریف فاروق (تمغۂ امتیاز)

''پاکستان آج بھی باطل قوتوں کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتا ہے اور کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا جب اس کی عظمت اور قوم کی سالمیت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی سازشیں نہ کی جا رہی ہوں اس کے باوجود اگر یہ ایٹمی قوت بن سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ قوم اپنے عظیم قائد کی تعلیمات اور جدوجہد حیات کو اپنا لے تو پاکستان ناقابل تسخیر قلعہ نہ بن سکے۔ صرف عزم ویقین کی قوت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔''

پانچ سو سے متجاوز صفحات پر مشتمل فکر انگیز اور عمل افروز زیر تبصرہ صحیفے کا یہ اقتباس جو صحافی شریف فاروق کی تازہ ترین تصنیف کا حرفِ آغاز کہا جا سکتا ہے اپنی معنوی کثیر الجہتی کے اعتبار سے چشم کشا بھی ہے اور دل گداز بھی۔ پاکستان جو عالمی نقشے پر جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ بن کر طلوع ہوا روزِ اول ہی سے سازش وشر کا ہدف بنا رہا اور آج بھی قوت و استقامت سے بہرہ مند ہونے کے باوصف اپنی بقاء اور استحکام کے چیلنج سے نبرد آزما ہے۔ یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے جو حُب وطن کے قالب میں ڈھل کر کتاب کے قارئین سے اُس ایقان وعمل کا متقاضی نظر آتا ہے جسے اس ملک کا موسس وعظیم قائد اپنی قوم کو مقدس ورثہ کے طور پر سپرد کر گیا ہے۔

کتاب جس کا سرِ ورق برصغیر کے مردِ حُرّیّت حضرت قائداعظم جناح کی وجیہہ ومحتشم شبیہ سے آراستہ ہے جہانِ معنی کا ایک گنجینہ ہے جس میں قائد کے حیات وافکار اور برطانوی سامراج ہی نہیں بلکہ ان تمام حریف قوتوں کے خلاف منفرد جدوجہد کی ایک داستان محفوظ ہے جسے متعدد تاریخ نویسوں اور سوانح نگاروں نے اپنا موضوع بنایا ہے لیکن شریف فاروق نے جن نامعلوم یا کم معلوم گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے انہوں نے مصنف کی اس تاریخ ساز کاوش کو اور بھی وقیع ومعتبر بنا دیا ہے اس حقیقت کا اعتراف کتاب کے جن تقریظ نگار حضرات نے کیا ہے ان میں

جناب شریف الدین پیرزادہ ۔ ڈاکٹر جاوید اقبال ۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد الغزالی ۔ پروفیسر پریشان خٹک ۔ جناب مجید نظامی اور ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف جیسی صاحب علم و بصیرت شخصیات شامل ہیں مصنف کی اس کاوش کی پروفیسر خٹک نے جس انداز سے پذیرائی کی ہے وہ بھی منفرد ہے فرماتے ہیں:

''سینے میں بہت سی چنگاریاں سنبھالے ہوئے ہوں اگر لکھنے پر آجاؤں تو کئی کتابیں اس کی متحمل نہیں ہوسکیں گی، میں نے اپنی کتاب نہیں لکھی صرف جناب شریف فاروق کی کتاب پر دیباچہ لکھا ہے. جی چاہتا ہے کہ کتاب کی بجائے یہ دیباچہ صرف شریف فاروق کی ذات پر لکھ دوں''

مصنف کو یہ خراج تحسین بلا جواز اس لیے نہیں ہے کہ گزشتہ نصف صدی سے بھی زیادہ مدت پر محیط شریف فاروق کی وہ صحافتی و ملی خدمات ہمارے پیش نظر ہیں جو انہوں نے ایک درد مند مسلمان صحافی اور حُب وطن سے سرشار اہل قلم کی حیثیت سے انجام دیں اور اب تاریخ کی امانت بن چکی ہیں انہیں مہر و سالک جیسے نابغۂ روزگار صحافیوں کا شرفِ رفاقت روزنامہ انقلاب میں میسر آیا بعد ازاں ملک احسان الٰہی کے تاریخ صحافت میں سنگِ میل روزنامہ احسان اور جناب حمید نظامی و جناب مجید نظامی کے نظریاتی استقامت کے علمبردار نوائے وقت سے طویل وابستگی نے ان کے تجربہ و مشاہدہ کی صلاحیتوں کو صیقل کیا ان کا قلم تصنیف و تالیف کے مسلسل عمل سے ہمیشہ گُہر بار رہا چنانچہ ان کی متنوع تخلیقات میں ایسے جواہر پارے بھی شامل ہیں جو نہ صرف اُن کی بلاغتِ فکر و نظر کے مظہر ہیں بلکہ حُب وطن و ملت کے شاہکار بھی ہیں جناب شریف الدین پیرزادہ اسی تاثر کو اپنے الفاظ میں یوں منتقل فرماتے ہیں:

''مجھے خوشی ہے کہ جناب شریف فاروق نے اپنی تصنیف میں انتہائی محنت توجہ اور عرق ریزی سے مستند انداز میں حقائق بیان کردیئے ہیں اور یوں انہوں نے ایک اہم قومی فریضہ کو ادا کیا ہے انہوں نے متعدد مصنفین اور بالخصوص ہندوستانی سیاسی مورخوں کی کتب کے حوالوں سے اُن تمام مخالفانہ بے بنیاد الزامات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے۔''

جناب شریف فاروق کی گراں بہا کاوش کو فرزندِ اقبال جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال بھی خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ جسے یقیناً مصنف کے لیے سند کی حیثیت حاصل ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

''اس کتاب کے مطالعہ سے قائداعظم کی زندگی کے ان گوشوں سے بھی پردہ اٹھتا ہے جن کا تعلق برطانوی سامراج سے تھا۔ یقیناً اس کتاب کے مطالعہ سے قائداعظم پاکستان، مسلمانانِ ہند اور تعلیمات اسلام کے خلاف جن غلط بیانیوں سے کام لیا گیا ہے۔ مصنف نے پوری کوشش کی ہے کہ انہیں Expose کر دیا جائے۔''

فاضل مصنف کی محققانہ کاوش کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ انہوں نے زیرِ نظر کتاب کی ترتیب و تدوین میں اسّی سے زیادہ جن مآخذ سے استفادہ کیا ہے ان میں بیشتر کتب و مقالات واقعی بڑے نادر التحقیق مواد پر مبنی ہیں قائداعظم پر سب سے معتبر و مقبول سوانح بھی جس امریکن مورخ سٹینلے ولپرٹ نے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نیویارک سے شائع کی انہیں میں شامل ہے لیکن مصنف نے انڈیا آفس لائبریری لندن کی جانب سے ہندوستانی سیاسی مدوجزر اور عوامی رہنماؤں کے بارے میں ۱۹۴۲ سے ۱۹۴۷ء تک کے طوفان پرور دور سے متعلق جو برطانوی ہند کی خفیہ دستاویزات (Transfer of Power) شائع کی ہیں ان کو خصوصی طور پر ہدفِ توجہ بنایا ہے کہ ان سے سیاسی جماعتوں اور سیاسی شخصیات کے بارے میں چونکا دینے والے حقائق سامنے آتے ہیں مصنف کا کہنا ہے کہ ''قائداعظم جناح اور پاکستان کی تشکیل کے حوالے سے مستند حقائق سامنے آنا شروع ہو گئے۔ ان دستاویزات کی روشنی میں بھارت سمیت عالمی سطح کے دانشوروں، مورخین اور ریسرچ سکالرز نے منظّم بھارتی سازشی پروپیگنڈہ کا تاروپود بکھیر کر رکھ دیا۔''

چنانچہ صاحب تصنیف نے دہلی یونیورسٹی میں پولیٹیکل سائنس ڈیپارٹمنٹ کی ریڈر اور معروف بھارتی سکالر ڈاکٹر اجیت کی کتاب "Jinnah--Secular and Nationalist" کو بالخصوص مرکز توجہ بنایا ہے جس میں مصنفہ نے جہاں قائداعظم کے خلاف ان کی کردارکشی کی مہم کو بے نقاب کیا ہے وہیں انہیں سیکولر ثابت کرنے کی بھی کوشش کی ہے جس سے مصنف نے

مدلل اختلاف کرتے ہوئے زیرِنظر تصنیف ہی میں ثابت کیا ہے کہ قائداعظم کے ذہن میں قیام پاکستان کی بنیاد اور جواز صرف اسلامی اقدارِ حیات کا نفاذ تھا۔ مصنف کا یہ مخصوص ذہنی رجحان اور حُب وطن کی قیمت پر کسی بھی تحریص و ترغیب کو خاطر میں نہ لانا ان کے ذاتی اور صحافتی کردار کا نشان امتیاز بن گیا ہے گذشتہ تیس برس سے بھی زیادہ مدت سے وہ پشاور سے اپنے روزنامہ 'جہاد' کے ذریعہ صحت مند صحافت کے علم کو پورے عزم واستقلال سے تھامے ہوئے ہیں اسی شہر میں رہ کر وہ روزنامہ شہباز کے ادارتی عہد کو یادگار بنا چکے ہیں کم وبیش چھ دہائیوں پر مشتمل فاضل مصنف کی صحافتی زندگی کا بیشتر عہد ہمارے بھی حافظہ وتصور کی امانت ہے چنانچہ ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں باقیات الصالحات میں ایسی ہستیاں ہمارا سرمایہ ہیں کہ جن کے دل اگر دھڑکتے ہیں تو پاکستان کے لیے اور آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں تو پاکستان کے لیے۔

ہم جناب شریف فاروق کی اس مہتمم بالشان تصنیف کو نئی نسل کے لیے ایک ارمغانِ عظیم سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ ورثہ جو قائدِ اعظم ہمارے سپرد کر گئے ہیں چراغ در چراغ روشنی بن کر آنے والی نسلوں کے اذہان کو منور کرتا رہے گا۔

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

(جنوری۔ مارچ ۲۰۰۷ء)

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا مجاہد شاعر میر محمد اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی

ڈاکٹر توصیف تبسم

ثقہ و متین اور سلیم و حلیم ڈاکٹر توصیف تبسم جو بحیثیت شاعر محتاج تعارف نہیں اور جنہیں دیکھتے ہی ان کے نجیب الطرفین بلکہ ذوقافتین ہونے پر ایمان لانا پڑتا ہے بڑے علیم و خبیر بھی نکلے کہ منیر شکوہ آبادی جیسے قدیم و نسبتاً کم معلوم شاعر پر ایسی بھرپور اور بے لاگ تحقیق کی کہ ہمارے حافظہ کے اُفق پر غالب کا یہ شعر یک لخت طلوع ہو گیا۔

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگنِ عشق　　　ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

زیر تبصرہ تحقیق (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا مجاہد شاعر میر محمد اسمعیل حسین منیر شکوہ آبادی) کے حوالہ جات و حواشی پر نظر ڈالی اور عالمِ استعجاب میں کم و بیش دو درجن صفحات کا مطالعہ کیا اور دیکھا کہ مصنف کے ممدوح کی 'حیات' سے متعلق مستند حوالوں کی تعداد ۲۳۶ ہے۔ 'حبسیہ شاعری' کے زیر عنوان ۵۹ نادر التحقیق مندرجات ہیں اور قلمی و غیر مطبوعہ کتب نیز مقالات اور اخبار و رسائل بشمول انگریزی مآخذ میں Webster Dictionary or Pears Cyclopaedia شامل ہیں۔ یکصد سے متجاوز ان موقر حوالوں میں، تکرار مآخذ سے قطع نظر، کم و بیش ایک درجن مطبوعہ و غیر مطبوعہ جو مضامین و کتب براہ راست منیر شکوہ آبادی کے فکر و فن اور احوال و کوائف سے تعلق رکھتے ہیں ان کے مولفین و مصنفین میں فضل حسین اٹاوی، لالہ مادھو رام تاثیر اٹاوی، حسن افضل بدر، ڈاکٹر زہرہ بیگم یاسمین، آغا حیدر قلی خاں، دلدار نصریؔ، پروفیسر ضیاء احمد بدایونی اور قاضی معراج دھولپوری شامل ہیں جن کی نگارشات 'ہماری زبان' علی گڑھ، 'مخزن' لاہور۔ علی گڑھ میگزین۔ 'ناظم' رامپور۔ اردوئے معلیٰ علی گڑھ۔ 'آج کل' دہلی۔ جیسے بلند پایہ علمی و ادبی جرائد و رسائل میں شائع ہوئیں۔ فاضل مصنف نے زیر تبصرہ کتاب کی تدوین و تشکیل میں آغا حیدر قلی خاں کے

پنجاب یونیورسٹی ایم۔اے کے مقالے ''منیر شکوہ آبادی'' سے استفادہ کے علاوہ خود اپنے غیر مطبوعہ پی۔ایچ۔ڈی کے مقالے بعنوان ''منیر شکوہ آبادی۔۔۔احوال و آثار'' سے اخذ و تلخیص پر مبنی وسیع تر کام لیا ہے البتہ فاضل مصنف سے ایک 'سہو کبیر' بھی سرزد ہوا ہے کہ انہوں نے اپنی اس علمی کاوش کی طباعت و اشاعت کا کام جس سرکاری ادارہ کو تفویض کیا اس نے حد درجہ فنی و علمی بے بضاعتی کا مظاہرہ کیا ہے خود صاحب تصنیف کے ساتھ جو ستم ظریفی روا رکھی گئی ہے وہ ناقابل معافی ہے یعنی کتاب کی پشت پر تلخیصی تعارف تو منیر شکوہ آبادی کا دیا گیا ہے لیکن اسے مزین کیا گیا ہے پروفیسر ڈاکٹر توصیف تبسم کی بے تعارف شبیہ سے جسے کوئی بھی اجنبی ناظر صرف منیر شکوہ آبادی ہی کی تصویر پر محمول کر سکتا ہے یہی نہیں بلکہ ایسے مخبوط المعانی الفاظ و تراکیب کتاب کے متن میں در آئے ہیں جنہیں کسی طرح بھی فاضل مصنف سے جن کا شین قاف ہی نہیں املا و انشاء بھی قابل رشک ہے منسوب نہیں کیا جا سکتا ہمیں یقین نہیں آتا کہ ''مشاہیر شعراء'' اور ''دوران میں'' ''جیسی لاعینی تراکیب پر تاسف کا اظہار کس سے کیا جائے! جہاں تک کتاب کے تحقیقی معیار کا تعلق ہے اس کی برملا تصدیق پروفیسر توصیف تبسم کی دقیق کاوش اور علمی بصیرت سے ہوتی ہے۔ان کا مدعا و مقصد درجِ ذیل اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے:

''میر محمد اسمعیل منیر شکوہ آبادی (۱۸۱۸۔۱۸۸۰ء) کا شمار انیسویں صدی کے ان باکمال شاعروں میں ہوتا ہے جن کی قوت ایجاد و اختراع اور قدرتِ زبان سے انکار ممکن نہیں ہے ان کی ضخیم کلیات کم و بیش تمام اصناف سخن پر محیط ہے لیکن افسوس ہے کہ جہاں ان کے شاعرانہ رتبہ کے تعین میں بعض اہل نقد و نظر افراط و تفریط کا شکار رہے ہیں وہیں ان کی زندگی کے اہم گوشوں کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جو ان کا حق تھا''

چنانچہ محترم محقق منیر کے نسبی۔فکری اور شعری احوال و آثار کی پُر وضاحت تصویر کشی کرتے ہوئے اُن حالات و کوائف کا بھی احاطہ کرتے ہیں جن سے منیر کو ریاست باندھ۔فرخ آباد۔الہ آباد۔کانپور اور رامپور وغیرہ میں دوچار ہونا پڑا۔منیر شکوہ آبادی ۱۱۰ کتوبر ۱۸۱۸ء کو پیدا ہوئے۔

آگرہ اور لکھنو سے اُن کا قریبی تعلق رہا ان کے والد سید احمد حسین نقوی سودا کے تلامذہ میں شامل تھے اور وہ خود بذریعہ مراسلت شیخ امام بخش ناسخ کی شاگردی میں رہے ایک جگہ کہتے ہیں:

حضرتِ ناسخ کی اصلاح اس غزل پر ہے منیر　　　آج رتبہ میری فکر پست کا بالا ہوا

ہمیں ایک بار پھر یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے کہ پروفیسر تبسم اپنے ممدوح کی جس ''قوت ایجاد و اختراع اور قدرتِ زبان'' کی توصیف و مداحی کا حق ادا کر رہے ہیں ان کے شعر میں اصلاح کی 'ح' حشو کی 'ح' بن کر خارج از وزن ہو رہی ہے اس میں بھی کہیں ناشر کی ''قوتِ ایجاد واختراع'' کو تو دخل نہیں ! یعنی:

''ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں''

۱۸۵۷ء میں منیر شکوہ آبادی ریاست باندھ میں نواب علی بہادر کے ملازم تھے۔ جنگ آزادی کے ہنگامے میں عملی طور پر شریک رہے۔ گرفتار ہوئے مقدمہ چلا۔ کالے پانی کی سزا بھگتنا پڑی۔ باندھ ہی کے دوران قیام انہوں نے اپنا دیوانِ اول ''منتخب العالم'' مرتب کیا۔ نواب علی بہادر نے جن کے کلام کی اصلاح منیر کیا کرتے تھے اس دیوان کی درج ذیل تاریخ کہی۔

استاد کے دیوان کی ہے مدح محال　　　برج معنی کا نیّرِ اعظم لکھ

تھی فکر علی کو نامِ تاریخی کی　　　ہاتف نے کہا 'منتخب العالم' لکھ

رُباعی کا دوسرا مصرعہ خارج از بحر ہے۔ لگتا ہے استاد کی اصلاح سے محروم رہ گیا۔ بہر حال پروفیسر تبسم اپنی تحقیق میں مزید ایک ایسے پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو تاریخ میں منیر کی رسوائی کا سبب بن گیا۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''جن دنوں منیر فرخ آباد میں تھے (۱۸۵۹۔۱۸۶۰ء) ایک طوائف نواب جان کا قتل ہو گیا۔ قاتل مصطفے بیگ نامی ایک مکار شخص تھا۔ اس نے دیکھا کہ حکومت منشی منیر کی طرف سے بدظن ہے تو اس نے کچھ ایسے جھوٹے شواہد بہم پہنچائے کہ منیر کو قتل کے الزام میں موت کی سزا ہو جائے اور وہ صاف بچ کر نکل جائے''

آ گے چل کر مزید لکھتے ہیں:

''منیر کو کالے پانی کی سزا کیوں ملی یہ الجھن دراصل خود منیر کے اپنے بیان سے پیدا ہوئی ہے وہ قطعہ تاریخ مصائب قید وحالاتِ زنداں میں لکھتے ہیں:

پر کہوں کیا کاوش اہل نفاق | تھے وہ خوں ریزی میں بڑھ کے تیر سے
مصطفےٰ بیگ ایک صاحب ان میں ہیں | کج روی میں بڑھ کے چرخ پیر سے
کر کے خونِ ناحقِ نواب جان | مجھ کو بھی پھنسوا دیا تزویر سے

چنانچہ اس ضمن میں صاحبِ تصنیف کا خیال ہے کہ منیر پر طوائف نواب جان کے قتل کا الزام ان کی کردار کشی کے مترادف ہے وہ انگریزوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''دراصل یہ اسی کردار کشی کا حصہ تھا جو انہوں نے ہمارے حریت پسندوں کے سلسلہ میں روا رکھا۔ افسوس تو یہ ہے کہ بعض تذکرہ نگار اصل حقائق جانے بغیر اسی رو میں بہہ گئے ہیں یہ مقالہ داخلی اور خارجی شہادتوں کی روشنی میں اس داغ کو دھونے کی ایک حقیر سی کوشش ہے۔''

لہٰذا انہوں نے اپنے زیر نظر مقالے میں اس الزام پر مبنی شواہد پیش کرنے کی سعی کی ہے اور ادبی مورخین و ناقدین جن میں حسن افضل بدر، ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی، ضیاء احمد بدایونی اور پروفیسر حامد حسن قادری شامل ہیں ان کی آراء پیش کی ہیں لیکن پروفیسر توصیف تبسم خود جو نتیجہ اخذ فرماتے ہیں وہ یہ ہے:

''یہ قتل کن حالات میں رونما ہوا۔ مصطفےٰ بیگ کون تھا۔ مصطفےٰ بیگ اور منیر کے روابط کی نوعیت کیا تھی ان امور کے بارے میں کچھ وثوق سے کہنا دشوار ہے۔''

گویا صاحب تصنیف کے لیے بھی اس الزام کی قطعی تردید ممکن نہیں خصوصاً اس صورت میں کہ وہ ایک جگہ بیان کر چکے ہیں کہ منیر ایک حسین طوائف کی محبت میں گرفتار تھے جس کے ۱۸۴۸ء میں انتقال سے انہیں شدید صدمہ پہنچا تھا اور یہ کہ منیر افیون خوری کے بھی عادی تھے چنانچہ اس تناظر میں ہم خود بھی محسوس کرتے ہیں منیر کو مکمل طور پر بری الذمہ قرار دینے سے قبل مزید ٹھوس

شواہد کی ضرورت ہے خاص طور پر جب کہ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ۔ علامہ کیفی چڑیا کوٹی، ڈاکٹر زہرہ بیگم یاسمین اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جیسے محققین ادب منیر کی سزا کا سبب نواب جان ہی کے قتل کو قرار دے چکے ہیں یہ الگ بات ہے کہ کوئی الزام نہ ہونے کے باوجود سفاک انگریز حکمرانوں کے نزدیک منیر شکوہ آبادی کا صرف مسلمان ہونا ہی اُن کے گردن زدنی قرار دیئے جانے کے لیے کافی تھا۔

مفتی بجق منصور بنوشت عجب فتویٰ　　　کافی ست پئے قتلش ایں جرم کہ سردارد

(جگر)

کتاب کا دوسرا اہم پہلو مصنف کے الفاظ میں ''ان (منیر) کی شاعری کا ایک خاص رخ جس کو حبسیہ کہنا مناسب ہوگا خاص توجہ چاہتا ہے کیونکہ اس میدان میں ان کو جو اولیت حاصل ہے اس میں اور کوئی دوسرا شاعران کا مدِ مقابل نہیں ہے۔''۔ ڈاکٹر توصیف کا یہ خراج تحسین واقعی زبردست بلکہ غیر معمولی ہے۔ ''حبسیہ'' کے لفظ نے ہمیں چونکا دیا ہے کیونکہ یہ لفظ مقالے میں ہر جگہ اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے اس کے جواز وتوضیح میں صاحب کتاب لکھتے ہیں:

''حبس سے حبسیہ کا لفظ مشتق ہے جس کا مطلب گھٹن یا انقباض ہے جس کا متضاد 'انشراح' ہے جس کے معنی کشادہ ہونے یا کھلے کے ہیں۔ حبس یا گھٹن جسمانی بھی ہوسکتی ہے اور ذہنی بھی شاعری میں جو گھٹن کی کیفیت انشراح یا کشادگی سے دوچار ہوتی ہے اس کی نوعیت جسمانی سے زیادہ نفسی اور ذہنی ہے۔ ذہنی حبس کی ایک شدید صورت احساس تنہائی ہے جس کو روحانی جلاوطنی (Nostalgia) کہنا زیادہ مناسب ہوگا''

اس کے بعد صاحب تصنیف اس بحث کو تین خانوں میں منتقل کر دیتے ہیں یعنی (۱) قید تنہائی کا نظریۂ جبر (۲) صوفیاء کا نظریۂ فراق اور (۳) قید و تنہائی کا رومانی نظریہ اور فرماتے ہیں کہ ''اگر ذہنی حبس کی ان ممکنہ صورتوں کو پیش نظر رکھا جائے تو حبسیہ شاعری کا دائرہ اس قدر وسیع ہو جاتا ہے کہ کم وبیش ساری شاعری اس میں سما سکتی ہے۔ یہاں حبسیہ شاعری سے مراد ایسی شاعری

ہے جو جسمانی قید کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔''

ہمیں افسوس ہے کہ فاضل مصنف کے اس نقطہ نظر سے ہم خود کو متفق نہیں پاتے کیونکہ جو اولین تاثر حبس یا حبسیہ کے لفظ سے ذہن قبول کرتا ہے اس میں موسم کا حوالہ ناگزیر ہے۔ جیسا کہ جوش نے کہا

اب بوئے گل نہ بادِ صبا مانگتے ہیں لوگ — وہ حبس ہے کہ لُو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

ایسی شاعری کے لیے جس کی وجہ تخلیق زنداں ہوا سے ہمیشہ ہی زندانی شاعری کہا گیا ہے چنانچہ 'حبسیہ' جیسی وضع اصلاح کے باوجود فاضل مصنف نے بھی زندانی شاعری کی اصطلاح جگہ جگہ استعمال کی ہے ہمیں خوشی ہے کہ فاضل مصنف زندانی شاعری کے لیے حبسیہ شاعری کی تہمت اختراع سے بچ گئے ہیں کیونکہ غلام حسن پنجاب یونیورسٹی کو پیش کیے جانے والے اپنے مقالے کا عنوان 'اردو کی حبسیہ شاعری' قرار دے چکے ہیں جس سے پہلے اور بعد اس مہتمم بذات اصطلاح کا وجود کہیں نظر نہیں آتا۔

پروفیسر ڈاکٹر توصیف تبسم نے ابتدائی زندانی شاعری کے موضوع پر سیر حاصل اور نہایت پُر مغز گفتگو کی ہے جو نہایت اہم حوالوں سے مزین ہے ان کے مطابق دنیا کی بعض بہترین کتابیں قید خانوں ہی میں لکھی گئی ہیں مثلاً فارسی شعراء میں مسعود سعد سلمان اور خاقانی کا زندانی کلام۔ ملک الشعراء بہار۔ عشقی۔ ابوالقاسم لاہوتی اور فرخی یزدی وغیرہ کے علاوہ یورپ کے قدیم و جدید اہلِ قلم میں سکاٹ لینڈ کے شاہ جیمز اول۔ اطالوی شاعر ٹاسر۔ جان بنین۔ سر وائٹ سکاٹ۔ روس کے مشہور ناول نگار دوستوسکی۔ فرانسیسی شاعر۔ مفکر اور ڈرامہ نگار ژاں پال سارترے۔ برصغیر میں حضرت مجدد الف ثانی۔ مولانا فضل حق خیر آبادی جن کے دورِ اسیری میں منیر شکوہ آبادی بھی جزائر انڈمان ہی میں تھے نیز مولانا مودودی وغیرہ۔ ڈاکٹر توصیف واجد علی شاہ اختر والئی اودھ۔ مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر اور منیر شکوہ آبادی کو زندانی شاعری کے نمائندہ شعراء میں شمار کرتے ہیں۔ البتہ ان کے خیال میں ۱۸۵۷ء سے پہلے کے زندانی شعراء کا تعین مشکل ہے تاہم پہلا نام آصف الدولہ کے جانشیں وزیر علی خاں وزیری کا ہے ایک قدیم شاعر میر جہانگیر لکھنوی

نے قید میں انتقال کیا۔ سلطان ٹیپو کے حقیقی پوتے بشیرالدین توفیق جو دکن میں ویلور کے قلعہ میں نظر بندر ہے۔ اکبر شاہ ثانی کے فرزند مرزا جہانگیر نے قید و بند کی حالت میں انتقال کیا۔ ۱۸۴۷ء میں مرزا غالب پر بھی اسیری کی بلا نازل ہوئی اوران کا یہ شعر:

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرپا موئے آتش دیدہ سے حلقہ مری زنجیر کا

غالب نے اپنی اسیری کے دوران ۱۸۴ اشعار کا ایک ترکیب بند بھی لکھا جوان کی بہترین نظموں میں شمار ہوتا ہے زندانی شعراء میں واجد علی شاہ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کا پورا کلام محفوظ ہے۔ بہادر شاہ ظفر اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ جنہیں ۱۸۵۷ء میں سزا تو سات سال کی سنائی گئی تھی لیکن دو تین ہفتے بعد ہی رہائی مل گئی۔ غالب نے بھی یہ کہہ کر اپنی جان چھڑالی تھی کہ:

''حضور میں آدھا مسلمان ہوں کیونکہ شراب تو پیتا ہوں مگر سُور نہیں کھاتا''

ڈاکٹر توصیف تبسم نے بہت بعد تک زندانی شاعری کا جائزہ لیا ہے جس سے ان کے موضوع کو مزید وسعت ملی ہے ان کے خیال میں زنداں کے ماحول کو عکاسی زیادہ فن کارانہ انداز میں گوپی ناتھ امن کی نظموں ''جیل میں بسنت'' اور ''کوئل'' ظہیر کاشمیری کی نظم ''شب زنداں'' اور فیض احمد فیض کے مجموعہ ہائے کلام ''زنداں نامہ'' اور ''دستِ صبا'' کی بعض نظموں میں دکھائی دیتی ہے۔

ہماری خواہش تھی کہ توصیف تبسم صاحب منیر شکوہ آبادی پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا اپنا پورا مقالہ ہی زیور طباعت سے آراستہ کرتے لیکن اچھا ہوا ورنہ سرکار کا ادارہ نہ جانے اور کیا کیا گل کھلاتا۔ آخر میں منیر مرحوم کا ایک خوبصورت شعر:

غربت میں کس سے چشمِ کرم کی امید ہو آنکھیں چرا رہا ہے زمانہ غریب سے

(جنوری۔ مارچ ۲۰۰۷ء)

خواب سرا

پروفیسر صدیق شاہد

''خواب سرا'' کیا ہے غزل کی دلگداز و دلپذیر جہتوں کا ایسا ''تعبیر کدہ'' ہے جسے شاعر نے لہوترنگ احساس سے رنگ اور شمع خیالات سے نور عطا کیا ہے غزلیات پر مشتمل پروفیسر صدیق شاہد کا یہ شعری مجموعہ نہ صرف ان کے تصور شعر کا آئینہ دار ہے بلکہ ان کے فکر و فن کے ارتقاء کا سنگِ میل بھی۔ ''تقدیم'' کے زیرعنوان وہ اس مجموعۂ کلام کا تعارف کراتے ہیں۔

''خواب سرا'' میرا چوتھا غزلیہ مجموعہ ہے اس سے پہلے ''صحرا میں سمندر'' (۱۹۸۵ء) ''رنجِ سفر'' (۱۹۹۰) اور ''اک سخن اور'' (۱۹۹۴ء) شائع ہو چکے ہیں۔ ۲۰۰۱ء میں ایک نعتیہ مجموعہ ''باریابی'' بھی زیور طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے۔ میرا زیادہ تر رجحان غزل کی طرف ہے کہ مجھے اسی قتالۂ سخن نے ہمیشہ اپنا اسیر بنائے رکھا''

چنانچہ غزل کی اسی ''قتالۂ سخن'' کے ہاتھوں جو جامِ شہادت وہ نوش فرماتے ہیں اس میں کلاسیکی غزل کا پیکان سفاک پیوستۂ جاں نظر آتا ہے جس کا اعتراف کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں ''کہ میرا تعلق کلاسیکی روایت کے حامل غزل سراؤں سے ہے'' اور اختتام کلام اس شعر پر کرتے ہیں:

ماحالِ خویش بے سروبے پا نوشتہ ایم   روزِ فراق را شب یلدا نوشتہ ایم

صدیق شاہد کے قبل ازیں شائع ہونے والے مجموعہ ہائے کلام تو ہماری نظر سے نہیں گزرے البتہ زیرتبصرہ مجموعہ ترکیب و تشکیل اور ہئیت و آہنگ کے اعتبار سے جہاں فکر و فن کے کلاسیکی وقار کا غماز ہے وہیں موضوعاتی ارتقا کے حوالے سے ''تنگنائے غزل'' کو فکر کی وسعتوں سے ہمکنار کرتا دکھائی دیتا ہے شاعر اپنے مخصوص نقطہ نظر ہی پر قانع و قادر نہیں بلکہ اسلوب کی شگفتگی و تازہ کاری کو بھی درخورِ اعتنا سمجھتا ہے جس کا اظہار ''خواب سرا'' کا نشانِ امتیاز ہے۔

شوقِ آوارہ یونہی خاک بسر جائے گا | چاند چپکے سے کسی گھر میں اُتر جائے گا
وقت ہر زخم کا مرہم ہے یہ لازم تو نہیں | زخم جو اُس نے دیا ہے کبھی بھر جائے گا
شوقِ دیدار میں اُس سروِ رواں کے شاہد | موسمِ گل مرے آنگن میں ٹھہر جائے گا

مضمون آفرینی جو کلاسیکی غزل کی روایت ہی نہیں بلکہ پہچان بھی ہے وہ صدیق شاہد کی جدید فکر کے تنوعاتی قالب میں ڈھلتی نظر آتی ہے لیکن نفسِ مضمون کی پاکیزگی و طہارت ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتی ہے چنانچہ یہ التزام اُن کے کلام کو نجابت فن کا مقام و مرتبہ عطا کرتا ہے جو کلاسیکی غزل کی بعض اخلاقی ناہمواریوں اور جدید رنگِ شاعری کی بے اعتدالیوں سے مبرا ہے ملاحظہ ہو:

سرشک بار رہی چشمِ انتظار بہت | مگر دہکتا رہا دل کا ریگ زار بہت
تُو مثلِ قطرۂ نیساں تو زندگی کی نوید | میں دشتِ خشک ہوں اور تیرا انتظار بہت
آنسو کمزوری کی پہچان ہوا کرتے ہیں | فرطِ غم میں انہیں آنکھوں میں چھپائے رکھا
کونسا دن تھا کہ جب سنگِ حریفاں نہ لگا | ہم نے آئینہ دل ڈھال بنائے رکھا
شبنم کی لطافت ہے کہ تو نکہتِ گل ہے | جس رنگ میں تو ہے تجھے پہچان گئے ہیں

شبنم کی لطافت اور نکہت گل جیسے استعارے صدیق شاہد کے تصور محبوب کی علامت ہیں جو ان کے کلام میں جا بجا ملتے ہیں یہی علامتیں جب تشبیہہ کا روپ دھارتی ہیں تو اسلوب مجلّٰی و مصفّٰی ہی نہیں، بلکہ دلنشیں بھی ہو جاتا ہے:

فصیلِ شعر پر روشن اگر ہوں حسن کی شمعیں | تو ایک اک لفظ شاہد روشنی کا استعارہ ہو
ایسے کچھ لوگ بھی ہوتے ہیں کہ جب یاد آئیں | وادیٔ جاں میں نئی شمعیں جلا دیتے ہیں

ایک انگریز شاعر کے بقول ''ہمارے شیریں ترین نغمات وہ ہیں جو انتہائی غم واندوہ کے ترجمان ہیں'' "Our sweetest songe are those that tell us of the saddest thonghts"

چنانچہ ''خواب سرا'' کے اشعار میں بھی یہ سحر آگیں کیفیات موجود ہیں لیکن اس اختصاص کیساتھ کہ حُزنیہ مضمون کہیں بھی قنوطی جذبوں کو محیط نہیں ہونے دیتا بلکہ رجائیتِ فکر زیر تبصرہ مجموعے کی واضح

خوبی ہے مثلاً

یہ آرزو کا سفر گرچہ رائیگاں بھی ہے
اسی میں جادۂ فتح وظفر نہاں بھی ہے

شب سیاہ تری ظلمتیں روا کب تک
ترے عقب میں کوئی روزِ ضوفشاں بھی ہے

یہیں کہیں ہیں ہوائیں لطیف موسم کی
ضعیف تر ہی سہی مجھ کو یہ گماں بھی ہے

نہ دیکھا جامۂ خودرفتگی اُتار کے بھی
چلی گئیں تری یادیں مجھے پکار کے بھی

یہ زندگی ہے اسے تلخ وتُرش ہونا ہے
صعوبتوں کے ذرا دیکھ دن گزار کے بھی

حبابِ زیست نہ دستِ قضا سے ٹوٹ سکا
حیات باقی رہی قبر میں اتار کے بھی

صدیق شاہد کا ذہنی خاکہ جوان کے کلام سے ابھرتا ہے اس میں داخلی کرب بھی ہے اور حسنِ اعتماد بھی کہ یہی اسلوب حیات ان کی فکر شعر میں ڈھل گیا ہے وہ شکست در یخت کے عمل سے دو چار ہوتے ہیں لیکن بیک وقت عزم واستقامت سے مزاحمت بھی کرتے ہیں۔ یہی نکتہ ان کی شاعری کا محور ہے۔

تزدیر کے ہاتھوں جو میں زنجیر ہوا ہوں
قرطاسِ پذیرائی پہ تحریر ہوا ہوں

زمیں سے اُٹھ نہ سکا میں کہ خاک زادہ تھا
میں رہروں کے قدم سے بھی پائمال ہوا

جاں کی زنجیر سے باندھی ہے تری یاد کی ڈور
اب مری ٹوٹتی سانسوں کا یہ سرمایہ ہے

حیات ولفظ کے سنجوگ کا ہے نام ادب
یہ ایسا سچ ہے کہ تسلیم کر لیا جائے

(جنوری۔ مارچ ۲۰۰۷ء)

گنبدِ خضریٰ کے سائے

محمد اخلاق قریشی سعیدی

ارادت وعقیدت جب والہانہ جذبات میں ڈھل جاتے ہیں تو لفظ و معنی کے محتاج نہیں رہتے بلکہ محسوسات کے عالمِ بیکراں میں ابلاغ کی راہیں خود بخود تراش لیتے ہیں لہٰذا نقد و نظر کا کوئی معیار یا اُسلوب نفس موضوع تک تو رسائی حاصل کرسکتا ہے لیکن ان نزاکتوں اور لطافتوں کا احاطہ کرنے سے قاصر رہتا ہے جو صرف باطنی تجزیہ یا تحلیل نفسی (Introspection) ہی کے عمل کے ذریعہ ممکن ہے ہمیں یہ احساس زیرِ نظر کتاب کے سرسری مطالعہ ہی سے ہوگیا جو مصنف کے رب العالمین اور رحمت اللعالمینؐ سے بے پناہ تعلق و محبت کی تفسیر ہے۔ محمد اخلاق قریشی کے قلم سے بیساختہ سرزد ہونے والے ذیل کے یہ دو نثر پارے ملاحظہ ہوں۔

۱۔ ''مکہ مکرمہ شہر جلال ہے جہاں اللہ تبارک وتعالیٰ کے جاہ و جلال کو محسوس کیا جاتا ہے مگر بیان نہیں کیا جاسکتا بے ساختہ آنسو بہہ نکلتے ہیں زبان پر حمد و ثنا جاری ہو جاتی ہے دل سجدہ ریز ہونے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے:

نہ اس میں گھاس اُگتی ہے نہ اس میں پھول کھلتے ہیں
مگر اس سرزمیں سے آسماں بھی جھک کے ملتے ہیں

۲۔ ''مدینہ منورہ شہر جمال ہے جہاں آپ کی شفقت، محبت اور اپنائیت محسوس کی جاتی ہے یوں لگتا ہے کہ جیسے عاصی تھک ہار کر گوشۂ عافیت میں آگیا ہے۔''

کتاب جو حرمین شریفین کا زیارت نامہ اور حجاز مقدسہ کا سفرنامہ ہے اہل بینش کے لیے عہد نبویؐ کی ایسی نظرافروز جھلکیاں بھی اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے جو روح کو بالیدگی اور ذہن کو رخشندگی عطا کرتی ہیں اس سے قبل بھی مصنف ''رحمت کی برکھا' کے زیر عنوان عمرہ کا ایک سفرنامہ

شائع کر چکے ہیں جو ہماری نظر سے نہیں گزرا لیکن ہمیں یقین ہے کہ بین السطور جس شیفتگی اور سپردگی کا احساس زیرِ نظر کتاب سے ہوتا ہے وہی پیشرو تصنیف کا بھی طرۂ امتیاز ہوگا زیرِ تبصرہ تصنیف کے تقریظ نگاروں میں پروفیسر ڈاکٹر سید عارف اور قاضی محمد غوث شامل ہیں جنھوں نے مصنف کے تکریم دین اور حُب رسولؐ کے جذبات کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے خصوصاً موخرالذکر کے یہ الفاظ:

''محترم محمد اخلاق قریشی صاحب ان بندگانِ خدا میں سے ہیں جن کی زبان ہر وقت ذکر درود سے تروتازہ رہتی ہے اور دل ہر لمحے خانہ خدا اور بارگاہِ مصطفیٰؐ کے لیے دھڑکتا ہے۔''

محمد اخلاق قریشی محکمہ حسابات ۔ سے مدۃ العمر تک وابستہ رہے ہیں اور فیضانِ خداوندی دیکھئے کہ وہ سرشاری جو انہیں حُب رسولؐ کی شکل میں ودیعت ہوئی وہ بے حساب ہے سچ ہے کہ:

این سعادت بزورِ باز و نیست　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

کتاب جو کم و بیش پونے تین سو صفحات پر مشتمل ہے دس ابواب کا ارمغانِ جمیل ہے صاحب تحریر کے اخلاص وصداقت کا آئینہ ہے تحریر ہر نوع کے تصنع و تکلف سے ماورا اور تزئین و نمائش کی کسی بھی کوشش سے بے نیاز کہ یہی محمد اخلاق قریشی کا توشۂ عقیدت ہے جس کا اظہار انہوں نے کتاب کے آغاز میں اس شعر کے ذریعہ کیا ہے

میرے بچوں کو وراثت میں ملے حُب رسولؐ　　یہ اثاثہ بعد میرے بھی تو گھر میں چاہیئے

(جنوری۔ مارچ ۲۰۰۷ء)

نگہداشت (شعری مجموعہ)

مشکور حسین یاد

روشِ عام سے انحراف ایثار بھی چاہتا ہے اور ہمت وحوصلہ بھی کہ یہ اندازِ فکر ونظر ہر ایک کو میسر نہیں ہوتا۔ ادب میں جدت واختراع کے رجحانات ہیئت واسلوب ہی نہیں بلکہ موضوع ومتن میں بھی انقلاب وارتقاء کی ضمانت فراہم کرتے ہیں، لیکن یہ تمام عمل ایک پختہ فنی شعور، علمی بصیرت اور وجدانی صلاحیتوں کا متقاضی ہے۔ اردو ادب میں صرف غزل ہی ایک ایسی صنف ہے جو ہمیشہ ہر مبتدی ومنتہی کا موضوع فکر رہی اور جو ہر دوسری صنف کی نسبت پسندیدہ تر ٹھہری اور آج بھی ''فکر ہر کس بقدر ہمت اُوست'' کے مصداق نت نئے تجربات کا مقبول ترین ہدف بنی ہوئی ہے۔ غزل کی نشوونما میں لسانی ارتقاء کا حصّہ سب سے زیادہ ہے خصوصاً ہیئت واسلوب کی تازہ کاری بڑی حد تک فارسی زبان کی مرہون منت ہے اس ضمن میں لفظی ومعنوی ہمہ جہتی کے باوجود اپنی وسعت بیاں کے لیے غزل کے سر ''تنگنائے'' کا پُر کارانہ الزام دھر کے غالب نے فکری، لسانی اور فنی اجتہاد کے در وا کر دیے چنانچہ اس صنف میں بیکراں تجربات کے تسلسل نے غزل کو اُس نقطۂ عروج پر پہنچا دیا جہاں اس کا کوئی ہمسر ہے نہ ہم پایہ۔

مشکور حسین یاد بھی جن کی فکرِ شعر کے نقوش نصف صدی سے بھی زیادہ مُدت سے لوحِ ادب پر مرتسم چلے آ رہے ہیں۔ اپنی تازہ کاری اور جدت طرازی کے سبب ایک اختصاص حاصل کر چکے ہیں۔ اختصاص اس لیے کہ وہ ایک وسیع المطالعہ اور زبان وکلام کی لطافتوں، نزاکتوں اور باریکیوں کے رمز شناس بھی ہیں اور محقق بھی۔ بالخصوص فارسی زبان وادب پر اُن کی گرفت قابلِ رشک ہے جب کہ ان کے معاصرین نیز بعد کی پود کے لوگوں کی خاصی تعداد ایسی ہے جو ادب وشعر میں اجتہاد پر تو کمر بستہ ہیں مگر علم وآگہی اور شعور ووجدان کی نعمتوں سے پوری طرح بہرہ مند نہیں، چنانچہ اس طبقہ کے نتائج تخلیق نے شعر کا حلیہ بگاڑ کے رکھ دیا ہے اور وہ

لطافت وغنائیت جو غزل کا اصل اصول رہی ہے بری طرح مسخ ومجروح نظر آتی ہے دیگر اسباب کے علاوہ فارسی زبان وادب سے بے خبری غزل میں لفظیات کے حسن کے زوال پر منتج ہوئی ہے۔ یاد صاحب کی لفظی اختراعات اور مفہوم ومعانی میں فلسفیانہ فکر کی وسعت پذیری انفرادیت کا ایک مخصوص رنگ اختیار کر چکی ہے جس کی تفہیم پر ان کے معاصرین نے وہ توجہ نہیں دی جس کا ایسے تجربات تقاضا کرتے ہیں بلکہ ان کے ناقدین ومبصرین بھی سنجیدہ نظر نہیں آتے ہیں جیسا کہ ان کے زیر نظر تیسرے شعری مجموعہ سے ظاہر ہے مشکور حسین یاد سادہ بھی ہیں اور پُر خلوص بھی غالباً یہی وجہ ہوسکتی ہے کہ انہوں نے اپنے زیر تبصرہ شعری مجموعہ کو ایک ایسی شخصیت کے توسط سے متعارف کرایا ہے جس کی واحد شناخت افسانہ نگاری ہے۔ چنانچہ کتاب کے فلیپ میں جس انداز سے اظہار رائے کیا گیا ہے وہ ملاحظہ ہو:

> ''کمال ہے مشکور حسین یاد کسی میدان میں بند نہیں ہیں۔ زبان وبیان کی پختگی ایسی کہ استادان غزل ان کے سامنے پانی بھریں۔۔۔ نثر میں انہوں نے گشتوں کے پشتے لگائے تھے شعر میں آسمان سے تارے توڑ کر لائے ہیں۔''

ہمیں اپنی اس ناکامی کا اعتراف ہے کہ ہم اس ''فلیپی رائے'' میں کوئی سنجیدہ نقطۂ نظر نہ دیکھ سکے کاش توصیف کے اس مبالغہ آمیز انداز میں اہل نظر استہزا کا کوئی پہلو بر آمد نہ کر سکیں! بہر حال ہم سمجھتے ہی کہ شاعر نے ''نگہداشت'' میں جس اُسلوب نگارش کو اپنایا ہے اس میں لفظیات کے معنی خیز تجربے بھی شامل ہیں اور موضوعاتی تنوع بھی۔ غزل کے روایتی فن اور کلاسیکی لوازم سے نہ تو کہیں اغماض برتا گیا ہے اور نہ ماضی وحال کو مستقبل سے متصادم کرنے کی کوئی سعی نظر آتی ہے۔ شعری مجموعہ کے آغاز میں جو حمدیہ ونعتیہ اشعار پیش کیے گئے ہیں ان میں تازہ کاری تو ہے لیکن روایت سے بغاوت کا کہیں شائبہ تک نہیں۔ ملاحظہ ہو:

حمدیہ:

شعورِ حمد تو ہے شد ومد کے دائرے میں　　　ہے اعتدال مگر سب کی حد کے دائرے میں

کہیں نہیں ہوئے ہم تیرے ذکر سے باہر　　حدوں کو توڑتے ہیں اور حد کے دائرے میں
تری مدد ہے کہ اک خطِ مستقیم جمال　　ہمیشہ ہم رہے تیری مدد کے دائرے میں
ملی ہے نام سے تیرے فضائے نورِ بسیط　　ابھی تلک تو تھے ہم خال و خد کے دائرے میں

نعتیہ:

حرفِ نعت کے ساتھ سرورِ طاعت کی شہنائی لاؤ　　صلی علیٰ کا شور اٹھے وہ ذوقِ جہاں آرائی لاؤ
یادِ حضورؐ کے آئینہ میں کونسی صبح امید نہیں　　جھولی میں ایک ایک نظر کی جلوۂ صد سینائی لاؤ

شعری مجموعہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر نے اپنی اختراعی فکر کو ردیف و قوامی اور بعض الفاظ و تراکیب کی تخلیقی جدّت پر مرکوز کیا ہے جو اب ان کے اسلوب کا تشخص قرار پاتی ہے۔ ان کے اس مخصوص رویے کا اشارہ درج ذیل اشعار میں ملتا ہے۔

ہر حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے ہر حقیقت سے آگے کا ہنگامہ ہیں
کیا بتائیں کہ کیسی قیامت ہیں ہم، کس قیامت سے آگے کا ہنگامہ ہیں

ہم نہ پھیلے ہوئے ہیں نہ سمٹے ہوئے، ہم ہیں اپنی ہی وسعت میں لپٹے ہوئے
کیا خلاصہ کریگا ہمارا کوئی ہم وضاحت سے آگے کا ہنگامہ ہیں

لوح پہ آئیں یا ہم قلم میں رہیں، اپنے دم میں رہیں یا قدم میں رہیں
ہم کو لکھتے رہو ہم کو پڑھتے رہو ہم عبارت سے آگے کا ہنگامہ ہیں

کوئی سقراط ہو کوئی بقراط ہو ہم کو سمجھے تو شاید کوئی بات ہو
پھر بھی عقل و خرد میں نہ لانا ہمیں ہم فراست سے آگے کا ہنگامہ ہیں

یاد کے یہاں تراکیب و الفاظ تراشی، کا رجحان غالب نظر آتا ہے۔ مثلاً

بلند کیوں نہو طبع عموم تنہائی　　ہے فرد فرد شہنشاہ روم تنہائی

پتہ چلے کہ یہ حسن معاشرت کیا ہے   جبین وقت پہ ٹانکو نجوم تنہائی

البتہ لسانی پیکر تراشی کا یہ انداز کہیں کہیں ایسے رُوپ بھی دھارتا ہے جو ممکن ہے کہ بعض اہل ذوق کی طبائع پر گراں گزرے۔ مثلاً اسم سے فعل بنانے کے یہ مظاہر:

تماشنے کے لیے۔ معاشنے کے لیے۔ تلاشنے کے لئے۔ قاشنے کے لئے

اسی طرح بھنورنے والے ہیں۔ ہنرنے والے ہیں وغیرہ وغیرہ

بہر حال ان لسانی اختراعات، ردیف وقوانی میں جدت طرازی اور ہیئت ومتن کے متنوع تجربات کے ساتھ ساتھ ''نگہداشت'' میں فکروفن کے نئے زاویے شعری ادب کے وسیع مطالعاتی پس منظر اور صوت وآہنگ کے حسن کو جلو میں لیے طلوع ہوتے نظر آتے ہیں جب کہ مشکور کے تمام کلام پر فارسی غزل کی روایت کا انعکاس ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ اس فکری وفنی منظر نامے میں ایک خاص بات جو قاری کو متوجہ کرتی ہے وہ شاعر کا پُراعتماد لہجہ ہے۔ رجائیت شاعر کے ذہن کا طرۂ امتیاز ہے اور وہ بھی اس طرح کہ کہیں کہیں اگر احساسِ محرومی نے شاعر کے دل ودماغ کو اپنی گرفت میں لیا بھی ہے تو اس پر جارحانہ شعری اسلوب غالب آجاتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

میری ہر شب کا چراغاں مجھے واپس کردو   وہ مرا خواب پریشاں مجھے واپس کردو
جس سے ہر لمحہ گواہی کی کرن پھوٹتی ہے   وہ مرا چاکِ گریباں مجھے واپس کردو
میں کہ پھر اپنی بشارت کے سفر پر نکلوں   مشعلِ قرأت دوراں مجھے واپس کردو
لوحِ محفوظ تمنا مری تحویل میں ہے   فرصت لمحۂ پنہاں مجھے واپس کردو
وہ خیالوں کی تگ وتازہ وہ کھلتے ہوئے راز   وہ مرا دشت غزالاں مجھے واپس کردو
میں کہ بیٹھا ہوں سر راہ جمالِ امروز   میرا مستقبل حیراں مجھے واپس کر دو
خاک پر اپنا جتاتے ہوئے حق آتے ہیں   خشک پتے ہیں کہ سونے کے ورق آتے ہیں
تازہ تازہ ہمیں ملتے ہیں ہوا کے پیغام   جھونکے آتے ہیں کہ اوراق سبق آتے ہیں

زلفیں کھلتی ہیں تو کھلتی ہی چلی جاتی ہیں
شادمانی کے یہ منظر لق دوق آتے ہیں

کیا پوچھتے ہو دل کی پریشانیوں کا حال
عہد بہار میں ہے گلستان ورق ورق

پیش نظر ہے ایک کتاب جمال و نور
بکھرے ہوئے ہیں شوق کے عنواں ورق ورق

تاروں کی بستیاں کہیں پھولوں کے قافلے
یہ کس نے کر دیا مرادیواں ورق ورق

روشنی بن کے ہر اک راہ پہ چلنا ہوگا
اب تو سورج کی طرح ہم کو نکلنا ہوگا

اس طرح اُتریں گے ہم وقت کی گہرائیوں میں
معدن دہر کو ہر لعل اگلنا ہوگا

کونسا نقشۂ امید نہیں پاس اپنے
ایک اک خواب کو تعبیر میں ڈھلنا ہوگا

ہم محبت کے ہیں پیاسے تو ہماری خاطر
قلبِ ہر صحرا سے چشموں کو اُبلنا ہوگا

فلسفیانہ فکر زیر نظر شعری مجموعہ کا عنوان جلی ہے اور ایک مسلسل کاوش جواز اول تا آخر دامن کش دل ہے وہ غزل کی کلاسیکی ہیئت کو حسنِ معنی سے مرصع کرنے کی ''سعی مشکور'' ہے۔

ملاحظہ ہو:

میں تیر بن کے جو قوس ممات سے نکلا
زمانہ سمجھا حدودِ حیات سے نکلا

تھا میرا عزم مری روح ارتقاء کا امیں
میں بے ثبات درونِ ثبات سے نکلا

وہ حشر تھا کہ انا کی تمازتوں کو لیے
مرا غرور مری بات بات سے نکلا

وہ آگیا جو رگِ جاں سے بھی قریب مرے
میں خود کو لے کے غبارِ صفات سے نکلا

ہر ایک چشم تماشا تھی غزنوی کی طرح
میں اپنا بُت جو لیے سومنات سے نکلا

ہم لوگ ہیں اس شان کے رسوائے زمانہ
سمجھے جو ہمیں وجد میں آجائے زمانہ

جب دیکھو ہیں سرشار کسی نشۂ مے سے
کیسے نہ ہمیں دیکھ کے اترائے زمانہ

ہر شکل کو بس اک نگہِ شوق ہے درکار
ہر شکل ہے اک صورتِ زیبائے زمانہ

یاد کے یہاں یہی نہیں کہ فنی وفکری دقیقہ رسی کا پُر شکوہ ماحول ملتا ہے بلکہ عصری شعور بھی اپنی

تمام جہتوں کے ساتھ اظہر من الشّمس ہے۔ استدلال و تعقل نے اُن کے کلام کو دانش و رانہ وجاہت عطا کی ہے وہ اپنے فکری و نظری تشخص کی حفاظت بھرپور عصبیت کے ساتھ کرتے ہیں۔ چنانچہ ''صلہ وستائش'' سے بے پروایعنی ''گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی''

ہے اپنا جنون اصل میں سرخیلِ معانی　　گھیر ہوئے رہتا ہے ہمیں سیلِ معانی
ہر شے ہے بڑے فخر سے لبریز مطالب　　اک ہم ہیں کہ آتے نہیں در ذیلِ معانی
ہم رہتے ہیں آغوشِ معانی میں ہمہ وقت　　والفجرِ معانی ہوں کہ واللیلِ معانی
ایک پل کے لیے شب بھر نہ ہمیں نیند آئی　　کوئی شعلہ سحر آثار ہے سر کے نیچے
دیکھیے جہل کا عمامہ کدھر جاتا ہے　　عقلِ کُل فہم کی بیزار ہے سر کے نیچے
کیا جگائے گا ہمیں شورِ قیامت مشکور　　غفلتوں کا بڑا انبار ہے سر کے نیچے

''نگہداشت'' اہل علم و خبر اور صاحبان جدت پسند سے مقتضی ہے کہ اس کا مطالعہ مستقبل شکار نظر سے کیا جائے اور تخلیقی عمل کے 'نا آفریدہ' جہانوں کی سیر کی جائے۔ بقول مشکور:

دنیا حقیقتوں کی چکا چوند کا ہے نام　　اس داستاں میں سب ہے مگر داستاں نہیں

(اپریل۔جون ۲۰۰۷)

غالب کے منتخب فارسی خطوط (اردو ترجمہ)

پرتو روہیلہ

پرتو روہیلہ نے خود کو امر بنالیا ہے اس لیے نہیں کہ اُن کی شخصیت اور فکر و فن سے متعلق بعض مطبوعات منصۂ شہود پر آچکی ہیں، بلکہ اس لیے کہ انھوں نے وہ علمی کارنامہ انجام دیا ہے جس سے نہ کوئی محقق یا نقاد صرفِ نظر کرسکتا ہے اور نہ یہ جسارت کوئی مورخ کر سکے گا۔ ان کا یہ علمی کارنامہ غالب جیسی غیر معمولی بلکہ عظیم شخصیت کے اسلوب فن اور فکری محرکات کے وسیع و بسیط تناظر سے منسوب و معنون ہے۔ غالب خود امر بن چکا ہے اور اُس کے نام سے عالمی ادب کا مطالعہ کرنے والا کوئی شخص بھی ناآشنا نہیں اہل وطن کے لیے غالب کی اردو و فارسی نگارشات میں وجہ شہرت اول الذکر ہی کو حاصل سہی لیکن فارسی نثر و شعر کو عالمی سطح پر جو پذیرائی حاصل ہوئی اُس نے غالب کو ''منتخب روزگار'' بنا دیا۔ غالب کو خود بھی بجا طور پر اپنی فارسی تخلیقات پر فخر تھا ورنہ وہ یہ ہرگز نہ کہتا کہ:

''فارسی بین تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ''

تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ برصغیر میں قبول عام کی سند اگر غالب کو ملی تو وہ صرف اردو تخلیقات بالخصوص مختصر سے اردو دیوان کے حوالے سے۔ اسی لیے یہ ذمہ داری اہل علم اور محققین ادب پر آپڑی کہ وہ فارسی میں غالب کے ''گنجینۂ معنی'' کے طلسم کی گرہ کشائی کریں اور اُس کی فکری و فنی عظمتوں سے عام قارئین کو بھی روشناس کرائیں اس ضمن میں پرتو روہیلہ تحقیق و تراجم کے جس سلسلہ کا گذشتہ ایک دہائی سے بھی متجاوز مدت سے آغاز کر چکے ہیں وہ اُن کی علمی منزلت کی دلیل بھی ہے اور اُن کی ہر تالیف تفہیم غالب کی رہگزر پر سنگ میل بھی۔ ''الاقرباء'' کے شمارے برائے اپریل۔ جون ۲۰۰۶ء میں اُن کی کتاب ''متفرقاتِ غالب'' شائع کردہ ادارۂ یادگار غالب، کراچی پر راقم الحروف اظہار رائے کر چکا ہے اور اب زیر تبصرہ کتاب کو یہ اختصاص حاصل

ہے کہ اس کی طباعت واشاعت کا اہتمام بیرونِ ملک سے کیا گیا ہے جو خود پرتو روہیلہ کی علمی کاوش کے لیے شایانِ شان خراج تحسین کی حیثیت رکھتا ہے۔ ناشر ادارے یعنی غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کی جانب سے صدیق الرحمٰن قدوائی نے ''پیش لفظ'' میں مترجم کے اس سے قبل پاکستان میں شائع ہونے والے نثری فارسی کے پانچ مجموعوں کا حوالہ دیا ہے اور ہندوستان میں قارئین کے استفادہ کے لیے انھیں زیرِ نظر کتاب میں شامل بھی کیا ہے۔ مترجم نثرِ فارسی کے جن پانچ مجموعوں کا ترجمہ مکمل کر چکے ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) نامہ ہائے فارسی غالب (۲) مآثر غالب (۳) باغِ دودر

(۴) آہنگ پنجم (۵) متفرقات غالب

ان پانچ نثری مجموعوں کے جن خطوط کے تراجم کیئے گئے اُن کی کل تعداد ۳۴۱ ہے۔ مزید برآں بقول مترجم ۳۶ خطوط ایسے بھی ہیں جو اُن کی دسترس میں ہیں اور جن کا ترجمہ وہ کر بھی چکے ہیں۔ تاہم وہ کتابی شکل میں موجود نہیں۔ ''واحد متکلم'' کے عنوان سے مترجم زیرِ تبصرہ کتب کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یہ وہ خطوط ہیں جن میں اظہار و بیان کا طنطنہ ہے، عالمانہ شان وشوکت ہے اور اندازِ سخن انتہائی پیچیدہ و پر تکلف ہے۔ اپنی موجودہ صورت میں جہاں یہ مکتوبات انشاء نگاری کے لازوال نمونے ہیں وہیں خیال آرائی، نکتہ آفرینی، جزئیات نگاری، حسِ مزاح، منظر کشی، رنگین بیانی و بلند خیالی کے بھی بے مثال شاہکار ہیں۔ یہی نہیں ان مکتوبات کا منظر نامہ اتنا وسیع و بسیط ہے کہ ان میں پوری انیسویں صدی کا ہندوستان اپنے سیاسی، سماجی، معاشرتی، فکری وطبقاتی، علمی وادبی رنگوں میں جیتا جاگتا اور کروٹیں لیتا نظر آتا ہے۔ ساتھ ہی ان تمام خطوط کا دورانیہ اتنا وسیع وطویل ہے کہ غالب کی جوانی سے لے کر تقریباً ان کی عمر کے آخری سالوں تک محیط ہے۔ چنانچہ ان کی شخصیت کے اکثر گوشے اپنے صلی رنگ

میں صاف وشفاف نظر آتے ہیں۔ موضوعات کے تنوع اوران کی غیر معمولی وسعت نے بھی اس ترجمانی میں اہم کردار ادا کیا۔"

تراجم کا مطالعہ قاری کو ایک مخصوص وجدانی کیفیت سے دوچار کر دیتا ہے اور وہ ذہنی یا تصوراتی اعتبار سے اُس تہذیب و معاشرت سے ہم آہنگ و ہم کنار محسوس کرتا ہے جس کی سرسراہٹ غالب کے مخصوص لب ولہجہ سے مترشح ہے اور یہی کمال ہے مترجم کا۔ تاہم فارسی زبان کی نسبت کم آشنا بعض قارئین لسانی ثقالت کی گرانی محسوس کرتے ہیں لیکن جو لوگ غالب کے اُسلوب نگارش اور فارسی زبان کی معنوی کثیر الجہتی سے متعارف ہیں وہ اس انداز کے ترجمہ کی ناگزیریت سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔ مترجم نے بھی اپنی تقریظی تحریر میں اس جانب اشارہ کیا ہے کہ معاصر ادبیات سے وابستہ لوگ روز بروز فارسی زبان کے معارف سے دور ہوتے جا رہے ہیں جس کا اثر خاص طور پر ہماری شاعری پر پڑا ہے۔ جو بیشتر حسین و دلکش الفاظ و تراکیب سے محروم نظر آتی ہے جہاں جہاں شعر سے غنائیت ناپید نظر آتی ہے وہ فارسی زبان کی نسبت بے بضاعتی کا شاخسانہ ہے بہر حال اس تناظر میں ہم پرتو روہیلہ کو اُن کے لازوال کارنامے پر تہنیت پیش کرتے ہوئے مشورۃً یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ اگر ممکن ہو تو آئندہ اشاعتوں میں فارسی متن کو بھی شامل کر دیا جائے تاکہ وہ اہل علم سے مزید داد و توصیف پا سکیں۔ اسی طرح تراجم میں انھوں نے جس علمی بصیرت اور ژرف نگاہی سے کام لیا ہے اُس کا برملا اعتراف کیا جا سکے گا نیز مرزا کے وہ فارسی خطوط جو امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں معدوم ہوتے جا رہے ہیں ہمارے ادبی سرمایہ کا بیش بہا حصہ بن کر محفوظ ہو جائیں گے اسی سبب ہم سمجھتے ہیں کہ مترجم نے اس عظیم علمی مہم کو سر کر کے خود کو امر بنا لیا ہے۔۔

(اپریل۔ جون ۲۰۰۷ء)

ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی۔ احوال و آثار (تحقیقی مقالہ)

نویدہ

زیرِ تبصرہ کتاب مصنّفہ کا مبسوط و ضخیم تحقیقی مقالہ ہے جس پر انہیں جامعہ پشاور نے ایم فل کی ڈگری عطا کی ہے یہ مقالہ اپنے مواد اور معیار و مقدار کے اعتبار سے ایک بلند پایہ عملی کاوش ہے نیز جس کثیر الجہت شخصیت کے افکار، نظریات، حکمت و دانش اور مدۃ العمر کا محیط اردو ادب سے متعلق مہتمم بالشان قلمی خدمات اور تحقیقی کارہائے نمایاں کو حیطۂ تحریر میں لانے کی سعی بلیغ کی گئی ہے اُس کا برملا اعتراف جامعہ کے ذی علم اساتذۂ کرام نے نہایت فراخ دلی سے کیا ہے جو عزیزہ نویدہ کے لیے سندِ توثیق بھی ہے اور پروانۂ افتخار بھی۔ پروفیسر ڈاکٹر ظہور احمد اعوان جو اس تحقیقی کام کے نگران تھے درج ذیل الفاظ میں اپنے تاثرات بیان فرماتے ہیں:

”نویدہ اپنی اس پہلی کتاب میں ایک خوبصورت اسلوب اور مؤثر طرز تحقیق کے ساتھ بطور مصنف مطلع ادب پر نمودار ہوئی ہیں انہوں نے اس کتاب کے ذریعہ ایک بڑے سکالر کو زندۂ جاوید کر دیا ہے۔ ان کی تحریر اور تحقیق کی مہارت قابل داد ہے۔“

اس میں شک نہیں کہ اس نوع کا تحقیقی کام فکر و عمل کا انہماک ہی نہیں مکمل ارتکاز بھی چاہتا ہے یہی نہیں بلکہ موضوع کو احاطہ کرنے کے لیے ایک خاص سیلقہ درکار ہوتا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں مقالہ نگار نے اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ انہوں نے ایک نہایت اہم اور دشوار علمی فریضہ کو پوری جانکاہی اور ذمہ داری سے انجام دیا ہے تحریر میں از اوّل تا آخر ایک محققانہ وقار کار فرما نظر آتا ہے اور تمام کتاب روایتی حشو و زواید سے مبرّا و پاک ایک دلپذیر مرقع ادب ہے۔ کم و بیش ساڑھے چار سو صفحات پر محیط کتاب نصف درجن ابواب پر مشتمل ہے جن میں مقالہ نگار نے اپنے ممدوح پروفیسر ڈاکٹر شمس الدین صدیقی کی شخصیت اور فکر و فن پر مستند مواد کچھ اس طرح ترتیب دیا ہے۔

☆ باب اوّل: صدیقی صاحب کی سوانح اور شخصیت نیز ان کے دوستوں، شاگردوں، احباب اور رفقائے کار کے تاثرات پر مشتمل ہے۔ ہم نے بھر پور توجہ سے ان تاثرات کا بھی مطالعہ کیا چنانچہ یہاں ہم ایک ایسے جامع اور فکر انگیز تاثر کا حوالہ دینا چاہیں گے جو مقالہ کے نگران پروفیسر ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کے تجربہ و مشاہدہ کا ایک نہایت معروضی اور متوازن شاہکار ہے فرماتے ہیں: ''ڈاکٹر شمس الدین صدیقی صدر شعبہ کہنہ مشق استاد، جید نقاد، اور بے مثل قلم کار ہیں۔ سنجیدہ، باوقار اور صاحب کردار انسان ہیں۔ تحقیق، تدقیق اور تاریخ کا درک رکھتے ہیں، حق استادی کما حقہ ادا کرتے ہیں۔ تدریس کی تقدیس کے قائل ہیں، گفتگو میں گہرائی اور صفائی ہے۔ بات ناپ تول کر کرتے ہیں۔ تعلیم کی چلتی پھرتی تفسیر ہیں۔ متانت، ذہانت اور دیانت کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ مہذب و معقول غیر جذباتی انسان ہیں۔ تفکر و تعقل و تدبر ان کے مزاج کے گہرے رنگ ہیں، اخلاص اور دردمندی سے پوری زندگی عبارت ہے تکمیل پسند اور کاملیت کے متلاشی ہیں۔ ستائش و وصلہ کے نہ متمنی اور نہ شہرت کے خواہاں۔ پستیوں سے گریزاں، رفعتِ علم کی طرف ہر دم رواں۔''

☆ باب دوم: صدیقی صاحب بحیثیت اقبال شناس۔ اس ضمن میں مقالہ نگار نے ڈاکٹر صاحب کے علّامہ کے افکار و نظریات پر وسیع و عمیق مطالعہ پر انحصار کیا ہے اور مجموعی جائزہ لیتے ہوئے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ یہ ہیں کہ ''آپ (ڈاکٹر صدیقی) کے نزدیک اقبال کا کلام جغرافیائی حد بندیوں سے آزاد ہے اور زندگی کا ایک مربوط، مستقل اور دائمی فلسفہ رکھتا ہے جس کی بنیاد انسان کے احساسِ خودی پر ہے اور عمل یقین اور محبت سے خودی کو تقویت ملتی ہے اور مسلمان اپنی صلاحیتوں اور پوشیدہ قوتوں کو بروئے کار لا کر اب قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی طرح مادی وسائل نہ ہونے کے باوجود زوال کی ان پستیوں سے عروج کی انتہا پر جا سکتے ہیں۔''

☆ باب سوم: ڈاکٹر صاحب کے ادبی نظریات اس عنوان کے تحت ادب اور اس کا اسلامی نظریہ، ادبی تنقید، ادب میں ہئیت اور اسلوب کی اہمیت وغیرہ کے حوالے سے ڈاکٹر شمس الدین

صدیقی کی نگارشات کے تناظر میں اُن کے ذاتی نظریات کی جستجو کی گئی ہے۔ یہاں مقالہ نگار نے اپنے تجزیہ کے حق میں خود ڈاکٹر صدیقی کے وہ الفاظ نقل کیے ہیں جو ان کے ادبی نظریہ کے مظہر ہیں۔'' ادبی تخلیقات کو پرکھتے ہوئے میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ ادیب کے محرکات و غایات کو سمجھوں اور اس کی روشنی میں اُس تحریر کو پرکھوں''

☆ باب چہارم: اس باب میں ڈاکٹر صدیقی کی ناقدانہ حیثیت کا تعین اُن کی تخلیقات کے حوالے سے کیا گیا ہے جو خسرو، غالب، انیس اور شرر کے عہد کے انتقادی جائزوں کے ساتھ ساتھ قومی، شاعری، پاکستانی تہذیب و ثقافت۔ داغ اور میر کے رنگ سخن کے علاوہ نیاز فتح پوری کی تنقید نگاری نیز دیگر اہم رجحانات کا احاطہ کرتی ہیں۔ چنانچہ مقالہ نگار اس نتیجہ پر پہنچی ہیں کہ ڈاکٹر صاحب ''مغربی تنقید سے اچھی طرح واقف ہیں۔ لیکن اپنے انداز تنقید میں مشرقی ہیں آپ کی تنقید میں توازن نظر آتا ہے۔ مبالغہ اور افراط و تفریط پیدا کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ آپ نے دلیلوں اور مثالوں سے اپنی تنقید کو اصول بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی اور اس طرح اردو تنقید کو عملی بنیادیں فراہم کیں۔''

☆ باب پنجم میں ڈاکٹر صدیقی کی محققانہ کاوشوں کا جائزہ لیا گیا ہے اور بحیثیت محقق ان کے بارے میں مقالہ نگار اس نتیجہ پر پہنچی ہیں کہ ''ڈاکٹر صدیقی کے تحقیقی مقالے تشریحی و توضیحی انداز کے ہوتے ہیں لیکن توضیح کے ساتھ ساتھ تحلیل و تجزیہ کا عنصر بھی شامل رہتا ہے۔ آپ رائے دیتے ہیں بے تعصبی و غیر جانبداری اور اعتدال و توازن کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ دلائل اور مثالوں سے کام لے کر اپنی تحریروں میں وزن اور عالمانہ شان پیدا کر دیتے ہیں۔''

یہ باب دراصل ڈاکٹر صاحب کے اپنے تحقیقی مقالے کے نمایاں خد و خال سے بحث کرتا ہے جس کا تعلق کلام سودا کی تدوین و اشاعت میں ڈاکٹر صاحب کی کاوشوں سے ہے۔

☆ باب ششم: دو حصوں پر مشتمل ہے حصہ اوّل میں دیگر وقیع متفرق نگارشات کے علاوہ معاصر اہل قلم پر انتقادی و تجزیاتی تحریریں شامل ہیں ان معاصرین میں مرزا محمود سرحدی، سید ضیاء

جعفری اور پروفیسر طاہر فاروقی نمایاں ہیں۔ حصہ دوم میں ڈاکٹر صدیقی کے بعض مضامین کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ہمیں ڈاکٹر اعوان کی اس رائے سے پورا اتفاق ہے کہ مصنفہ نے اس کتاب کے ذریعہ ایک بڑے سکالر کو زندۂ جاوید کر دیا ہے ڈاکٹر صدیقی کے بڑے سکالر ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں اُن کا خمیر حیدر آباد دکن کی معارف پرور مٹی سے اٹھا ہے، وہ بارہ سال تک جامعہ پشاور میں صدر شعبۂ رہے ان کی علمی و ادبی تخلیقات ادب عالیہ کی آغوش امانت میں محفوظ ہو چکی ہیں جب کہ سودا پر اُن کا کثیر الجہت پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ادب وتنقید کی تاریخ کا سنگ میل بن چکا ہے جو مستقبل میں ادبی ریسرچ کی مساعی کو رہنمائی فراہم کرتا رہے گا۔

اختتام کلام سے پہلے میاں سعید الرحمٰن کی ذاتِ گرامی سے کتاب کے انتساب اور اس کے پس منظر کے بارے میں مصنفہ کے کلمات سپاس نے اس عہدِ ناپُرساں کی نسبت ہماری مایوسی و ناامیدی کو یقینِ تازہ میں بدل دیا ہے کہ ''ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں'' ملاحظہ ہو:

''میاں سعید الرحمٰن صاحب نے اس کی تکمیل کے لیے مجھ سے بڑھ کر کوششیں اور محنت کی۔ اور ہر جگہ میرے ساتھ گئے۔ اس سارے عرصے میں اپنے شفیق ہاتھوں میں مشعل تعاون وخلوص اٹھائے میری تاریک راہوں کو روشن کرتے رہے۔ میں اُن کے تعاون اور محبتوں کی مقروض رہونگی اور ساری زندگی یہ قرض نہ اتار سکوں گی۔''

اپریل۔ جون۔ ۲۰۰۷ء

نسب نامہ سادات ڈاسنہ ضلع میرٹھ

سیّد ناصر الدین

زیرِ نظر کتاب سیّد ناصر الدین کی محنتِ شاقہ کا ثمر ہے۔ فی زمانہ نسب نامے اور شجرے لکھنے کی روایت نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ اس لیے کہ ایسے اَدق موضوع پر محنت کے باوجود حاصل حصول کچھ بھی نہیں ہوتا، جب کہ زمانہ موجود میں مالی منفعت زیادہ سے زیادہ پیشِ نظر رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشہور قلمکار بھی اس کوچہ میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کرتے۔ اسلاف اور اکابر کی سوانح اور سلسلہ ہائے نسب کو محفوظ رکھنے کی ہمت وہی لوگ کرتے ہیں جو اپنے آبا وَ اجداد اور عزیز و اقارب کے نام نامی اور قابل ذکر وراثتی سرمایہ کو اپنی آئندہ نسل کو منتقل کرنے کا جذبہ اپنے اندر پاتے ہیں بعض لوگ اپنی خاندانی وجاہت اور جاہ وجلال کی دھاک قائم رکھنے کے لیے اپنے نسب ناموں کا ریکارڈ محفوظ رکھتے ہیں۔ یا پھر اہل تاج وتخت کو ان کی ضرورت پیش آتی ہے۔۔۔صوفیائے کرام کے عقیدت منداور پیروکار اپنے اپنے سلسلہ ہائے طریقت کے شجروں کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں اہل ہنر اور فنکاروں کے ہاں بھی اپنے اساتذہ کرام سے اپنے نسبتی سلسلوں کو جوڑنے کا رواج عام ہے۔ خصوصاً اہل شعر ونغمہ ایسے نسب ناموں کو باعثِ صد افتخار جانتے ہیں۔

زمانہ جاریہ میں ایسے نسب ناموں کی اہمیت کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے۔ تقسیمِ برصغیر کے بعد اکثر اہلِ ثروت اور باعزت گھرانے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئے۔ پہلے تو ایک خاندان تین جگہ تقسیم ہوا، جن کے اقرباء بھارت، بنگالہ دیش اور پاکستان میں اپنوں سے بچھڑ کر رہ گئے۔ بعد ازاں پاکستان اور بنگلہ دیش کے ہر شہر و ہر قصبہ میں آب ودانہ کی تلاش میں ٹوٹی تسبیح کے دانوں کی طرح اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ ایسے میں ناصر الدین صاحب نے اپنی امکان بھر کدّ وکاوش سے ان

بکھرے دانوں کو بارِ دیگر ایک رشتہ میں پرونے کی کوشش کی ہے تاکہ عزیز و اقارب میں اپنی رشتہ داری کی پہچان قائم رہے۔

اُمید ہے کہ موصوف نے ایک مورِ بے مایہ کی طرح معلومات کے اِن ذرّوں کو تلاشِ بسیار کے بعد جس پُرخلوص جذبہ اور لگن سے یکجا سمیٹا ہے اسے اہل علم کے ہاں سراہا جائے گا۔

(جنوری۔مارچ ۲۰۰۷)

ردِعمل (تنقیدی مضامین)

امین راحت چغتائی

بعض تحریریں صاحب التحریر کے فکروفن اور شخصیت ہی کا آئینہ نہیں ہوتیں۔ بلکہ جزئیات کی حد تک رجحانات اور رویّوں کی اس طرح غماز ہوتی ہیں ہیں کہ مصنف کی شبیہِ معنوی قاری کے جریدۂ تصور پر ثبت ہوکر رہ جاتی ہے۔ چنانچہ زیرِ نظر تصنیف ''ردعمل'' کا بالاستیعاب مطالعہ جناب امین راحت چغتائی کی علمی بصیرت اور دقیقہ شناسی کو سند بھی فراہم کرتا ہے اور اُن مختلف النوع موضوعات پر جو اس شاہکار تصنیف کا دوقیع اثاثہ ہیں اور مصنف کی محققانہ کاوش کا برملا اظہار بھی۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر جمیل جالبی کے تقریظی کلمات ملاحظہ ہوں۔

''زیرِ نظر کتاب جو ''ردِعمل'' کے نام سے شائع ہورہی ہے۔ چغتائی صاحب کے تنقیدی، تحقیقی اور علمی مضامین کا ایسا مجموعہ ہے جس میں فکرونظر کا ایک جہاں آباد ہے۔ موضوعات کی رنگارنگی نے اُسے ایک ایسا، خوبصورت گلدستہ بنادیا ہے جو جاذبِ نظر بھی ہے اور سدابہار بھی۔۔۔ جسے جم کر توجہ سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔ اس مجموعہ کے مضامین پڑھ کر آپ فکرونظر کے نئے گوشوں سے مستفیض ہوں گے۔ امین راحت چغتائی جو بات کہتے ہیں وہ سند کے بغیر نہیں کہتے جس سے ان مضامین کی وقعت اور بڑھ جاتی ہے۔''

چغتائی صاحب کا چارسو سے متجاوز صفحات پر مشتمل یہ ارمغان علم وتحقیق ہمارے ادبی سرمایہ میں بلاشبہ ایک بیش بہا اضافے کی حیثیت رکھتا ہے اس میں صرف ادبی موضوعات ہی کو احاطہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ معروف شخصیات کے فکروفن پر تعارفی تحریروں کے علاوہ بعض معاصرین کی تخلیقی نگارشات پر تنقیدی جائزے اور سیاسیات جیسی وادیٔ پُرخار کے رہروانِ آبلہ پا پر تشخیصی و تحقیقی مواد کی فراہمی اس تصنیف کا تنوعاتی اختصاص ہے چنانچہ ''ندرتِ فکر'' کے زیرِعنوان ڈاکٹر اسلم فرخی علمی ورثہ کے امین، راحت چغتائی کا حق توصیف ان الفاظ میں ادا فرماتے ہیں:

''امین راحت چغتائی صرف منفرد انداز کے شاعر ہی نہیں اردو نثر میں بھی ایک نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ انہیں اسلامی فن تعمیر اور مغل مصوری پر بھی غیر معمولی درک حاصل ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین اصابتِ رائے، ندرتِ فکر اور دل پذیر انداز کی وجہ سے اہل فکر و نظر میں مقبول ہیں۔ چغتائی صاحب کے تنقیدی مضامین کا یہ دوسرا مجموعہ ہے جو اعلیٰ سطح کے تنقیدی و تحقیقی مضامین پر مشتمل ہے اس مجموعہ میں ان کا معرکہ آرا مضمون ''تفسیری تنقید'' بھی شامل ہے۔ ایسے مضامین مستند مآخذ سے مکمل استفادے۔ بھرپور مطالعے اور ذاتی دید و دریافت کے بغیر نہیں لکھے جا سکتے۔ اس مضمون سے اردو تنقید مین ایک نئے اور مثبت اندازِ فکر کا آغاز ہوا ہے۔''

ڈاکٹر اسلم فرخی کا یہ جامع اور برملا اظہار تحسین چغتائی صاحب کے دیگر رشحاتِ قلم کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے وہ کم و بیش نصف درجن علمی و ادبی تصانیف کا ''پر افتخار'' اپنی کلاہ دانش میں سجائے ہوئے ہیں جن میں ان کا انتخاب کلام عبدالرحمٰن چغتائی مرحوم کی توضیحی تصاویر کے ساتھ ''بھید بھنور'' کے نام سے جو ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا، علمی و ادبی، تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ بعنوان ''دلائل'' ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا، تفسیری مضامین کا مجموعہ ''قرآن اور نظام کائنات'' جو ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا، تحقیقی مقالہ ''مغل مکتب مصوری سولہویں صدی عیسوی میں'' جو ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا اور جس پر آثار قدیمہ کے معروف دانائے راز جناب ولی اللہ نے تبّرکی کلماتِ تقریظ تحریر فرمائے نیز تازہ ترین تصنیف ''ردِ عمل'' شامل ہیں اس تصنیف کے حرفِ آغاز کو مصنف نے ''نشاطِ سپاس'' کا عنوان عطا کیا ہے اور انکشاف کیا ہے کہ زیرِ نظر کتاب کا سرورق بھی مصورِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی کے ایک انمول اور غیر مطبوعہ شاہکار سے آراستہ ہے جو مرحوم کے فرزند جناب عارف رحمٰن چغتائی کی عطائے کریمانہ کا رہین منت ہے۔

منجملہ دیگر اہم تحقیقی و تنقیدی مقالات و مضامین جو جناب امین راحت چغتائی کی بصیرتِ علمی اور نہایت ذمہ دارانہ انتقادی روّیوں کے مظہر ہیں ہماری نظر میں نازک و لطیف نکات پر

مشتمل ایک ایسے خیال افروز مضمون بعنوان ''مشکلاتِ نعت'' پر بھی پڑی جو مصنف کی بلاغت فکر اور نبی کریمؐ کی تکریم و عقیدت کے تقاضوں کا عکاس ہے اور معاصر نعت گو حضرات کے لیے لمحۂ فکریہ بھی فاضل مصنف اس موضوع پر اپنے ذہنی کرب کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ ''بیشتر ادبی رسائل اور مجموعہ ہائے نعت اٹھا کر دیکھیں تو توحید و رسالت کے نازک فرق کا عدم احساس پریشان کر دیتا ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اکثر نعت گو شعراء قرآن و حدیث کے حوالے سے مقامِ توحید اور منصب رسالت کا مطالعہ کم کم کرتے ہیں'' اور اس کے بعد وہ قرآنِ کریم کی مشہور آیات کا حوالہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''بنظرِ غائر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے ارشادات کے ذریعہ نعت رسولؐ کے قرآنی خطوط متعین فرما دیئے ان کے بحرِ معانی کی غواصی نعت گو کا کام ہے'' چنانچہ احادیث نبویؐ کے حوالے سے بھی مصنف کی رائے یہی ہے کہ ''جب تک احادیث کی روشنی میں سیرتِ طیبہ کا براہ راست مطالعہ نہیں کیا جائے گا نعت تخلیقی نہیں ہو سکے گی اور شاعر مسالک و عقائد میں الجھا رہے گا۔''

ہم زیرِ نظر تصنیف کو معاصر علمی و ادبی منظر نامے میں ایک آیۂ منزلت سمجھتے ہیں اور جو تحقیق و انتقاد کی جہتیں مدلل انداز میں سامنے آئی ہیں انہیں آئندہ اس بحرِ ذخار کی شناوری پر آمادہ و بستہ اہلِ قلم کے لیے ایک نیک فال کہ تخلیق و تحقیق کا یہی ایک انداز ہمارے ادب کی ثروت و عظمت میں اضافہ کا باعث ہو سکتا ہے۔

(اپریل۔ جون ۲۰۰۷ء)

نشید تاریخ (فنِ تاریخ گوئی)

خواجہ منظر حسن منظر

زیرنظر تصنیف نہ ضخیم ہے نہ دقیق لیکن اپنے مواد اور موضوع کے لحاظ سے معیار و اعتبار کا مرقع کہی جاسکتی ہے۔ تاریخ گوئی کا فن ذہانت اور علم کا مرہون منت ہے جس کا ارتقا حال سے ماضی کے تناظر میں تو دیکھا جاسکتا ہے لیکن اس کے برعکس یہ فن روبہ انحطاط نظر آتا ہے مرحوم مشفق خواجہ کے الفاظ میں:

''ایک زمانہ تھا کہ تاریخ گوئی کی ہمارے معاشرے میں بڑی اہمیت تھی واقعات و حوادث کی صحیح تاریخیں اسی فن کے ذریعہ محفوظ کی جاتی تھیں اور ان کے استناد پر کسی کو شک نہیں ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کا رواج کم ہوتا گیا مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی دور اچھے تاریخ گو شاعروں سے خالی رہا ہو۔ آج بھی تاریخ گوئی سے محدود پیمانے پر سہی، دلچسپی لینے والے موجود ہیں جن میں خواجہ منظر حسن کا نام سرفہرست ہے۔''

فاضل مصنف نظم اور غزل کے شاعر کی حیثیت سے معروف مقام رکھتے ہیں پیش نظر تصنیف سے قبل ان کے تین شاعری کے مجموعے ''ضرب گل''، ''ضرب شیشہ'' اور ''زیر زبر پیش'' منظر عام پر آچکے ہیں فن تاریخ گوئی کے تناظر میں انکی تازہ تصنیف خصوصی توجہ کی اس لئے متقاضی ہے کہ اس کے ذریعہ مصنف نے اس فن کے غروب ہوتے ہوئے آفتاب سے اکتسابِ نور کیا ہے۔ اور عہد حاضر کے ذہین و ذی علم شعراء کو اس صنف سخن میں طبع آزمائی کی ترغیب مہیا کی نیز مستقبل کے لئے ارتقاء کی راہ ہموار کرنے کی سعی کی ہے۔ انہوں نے ''حرفے چند'' کے زیر عنوان جہاں اس فن سے متعلق معاملات و مسائل پر اظہار خیال کیا ہے وہاں ''ہمزہ'' کی علامت اور اس کے اعداد کے بارے میں متنازعہ آراء کے تاریخی پس منظر میں اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے فرماتے ہیں:

''اردو تاریخ گوئی میں ہمزہ کے اعداد پر فن تاریخ گوئی پر نظر رکھنے والے حضرات اور

اکابرین مختلف الخیال ہیں قارئین کی توجہ کے لئے عرض ہے کہ میں ''ہمزہ'' کو حرف نہیں مانتا اس لئے کہ ہمزہ حروف ابجد میں شامل نہیں''

حسن اتفاق ہے کہ اس موضوع پر سہ ماہی الاقربا کے رواں شمارے (جولائی۔ستمبر ۲۰۰۷) میں صاحب نظر محقق اور سکالر سید انتخاب علی کمال کا مقالہ اشاعت پذیر ہو رہا ہے موصوف کا اس سے قبل بھی ایک اور مبسوط مقالہ فن تاریخ گوئی پر یک صد مطبوعات و مخطوطات کا ایک اشاریہ جو بارہویں صدی ہجری سے پندرہویں صدی ہجری کے طویل عہد پر محیط ہے۔سہ ماہی الاقربا کی اشاعت اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۶ء میں شائع ہو چکا ہے۔ہمیں یقین ہے کہ ان مقالات کا مطالعہ بھی اس ضمن میں قارئین کے لئے خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔اور جہاں تک خواجہ منظر حسن منظر کے اس فن پر گرفت اور نادر المثال شگفتگی و برجستگی کا تعلق ہے قارئین اس کا بھی اندازہ کر سکیں گے چنانچہ ان کی اس قادر الکلامی کا برملا اظہار کتاب کے منظوم (قطعہ) انتساب سے ہوتا ہے۔جس کے ہر مصرع سے بسم اللہ کے اعداد (۷۸۶) برآمد ہوتے ہیں ملاحظہ ہو!

سجی علم الاعداد کی جو کتاب　　بااین کہربائی بااین آب و تاب
ہے اللہ کے نام سے انتساب　　ہے اللہ کے اسم سے ابتسام

مشفق خواجہ مرحوم کے علاوہ جن دیگر اکابر ادب نے تقاریظ تحریر کی ہیں ان میں ڈاکٹر ابوالخیر کشفی اور ڈاکٹر جمیل جالبی شامل ہیں موخر الذکر کا ارشاد ہے:

''نشید تاریخ خواجہ منظر کی کم و بیش گزشتہ دس سالوں میں کہی جانے والی تاریخوں کا دلچسپ مجموعہ ہے منظر صاحب تاریخ گوئی کا اچھا شعور رکھتے ہیں اور وہ عام طور پر ایسے مصرعوں سے تاریخ نکالتے ہیں کہ ان کے مصرعے ذہن ہیں محفوظ رہ جاتے ہیں۔منظر صاحب ہمزہ کو حروف تہجی میں شمار نہیں کرتے۔مجھے ان کی رائے سے اتفاق ہے۔''

خواجہ صاحب کی تاریخ گوئی سلاست و برجستگی کی مظہر ہے اور یہی اہتمام اس فن کا مشکل ترین پہلو ہے اس وادی پُر خار میں صرف اساتذہ کرام ہی قدم رنجہ فرما سکے ہیں اس کے باوجود سلاست و برجستگی کی مثالیں بہت زیادہ نہیں جبکہ خواجہ صاحب کا زیر نظر مجموعہ ان اوصاف

سے مملو نظر آتا ہے انہوں نے ایک اور اہم نکتہ کی طرف اپنے قارئین کی توجہ مبذول کرائی ہے جس میں انہیں اختصاص حاصل ہے اور وہ یہ کہ،

''میں نے اپنے ہم عصروں میں تاریخ گوئی کا جو رجحان دیکھا ہے وہ دو اشعار کے قطعہ میں چوتھے مصرع سے تاریخ نکالنے تک محدود ہے اشعار کے مصرعوں سے تاریخ نکالتے ہوئے شعری حسن برقرار رکھنا بھی ضروری ہے کوشش تو میں نے کی ہے کہ یہ حُسن برقرار رہے اب یہ قارئین پر منحصر ہے کہ وہ اسے کس نظر سے دیکھتے ہیں۔''

اس فنِ دشوار میں دلچسپی رکھنے والے قارئین زیرِ نظر مجموعے میں دیکھ سکتے ہیں کہ شاعر نے اپنی فنی مہارت اور اسلوب و معانی کا برجستہ استعمال اور اظہار پر کس قدرت و ندرت کا ثبوت مہیا کیا ہے اور ہر مصرعہ سے جو رواں و برجستہ ہی نہیں بلکہ حسن کلام اور فنی اوصاف کا مرقع ہے تاریخ برآمد کی ہے زیرِ نظر مجموعہ اولاً ۲۰۰۴ء میں منصہٴ شہود پر آیا جبکہ اشاعت ثانی تازہ ترین نسخہ ہے قطعہٴ تاریخ اشاعت (۲۰۰۴ مطابق ۱۴۲۵ھج) چار اشعار پر مشتمل ہے جس کے ہر مرصّع مصرع سے تاریخ برآمد ہوتی ہے سبحان اللہ! ملاحظہ ہو:

حروف و اعداد کا نگینہ جو ہے محیط سروش پیکر
(۱۴۲۵ھ)
جمال اقرا باسم ربک، جلال رب بزرگ و برتر
(۲۰۰۴ء)

ادب کا اک لاجواب فن ہے کہ اک سبک دست شاعری ہے
(۱۴۲۵ھ)
کہ ہے یہ ربط حروف و اعداد کی کہانی کا ایک منظر
(۲۰۰۴ء)

نہ اپنی کاوش نہ اپنی کوشش جو ہے اک اللہ کی عطا ہے
(۱۴۲۵ھ)
میں اپنی کم آگہی سے واقف، وہ علم و فہم و جلا کا مظہر
(۲۰۰۴ء)

یہ ہے تمنا ہر ایک قاری کے لب سے نکلے بنام ایزد
(۱۴۲۵ھ)
دعا کہ پازیب ہو ادب کی ''نشید تاریخ'' کا یہ زیور
(۲۰۰۴ء)

''نشید تاریخ'' کی اشاعت ثانی میں جن موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے ان میں دو درجن سے متجاوز معاصر شعراء کے مجموعہ ہائے کلام پر کہے گئے قطعات تاریخ بالخصوص حضرت قائد اعظمؒ اور علامہ اقبالؒ پر منظومات جن کا ہر مصرع ممدوحین کی ولادت و رحلت کی تاریخوں کا حسین منبع و

مخرج ہے نیز دیگر متفرقات پر مشتمل ہے جن میں نظمیں اور قطعاتِ شادی وغیرہ شامل ہیں ان کے علاوہ کتاب کا نمایاں ترین پہلو چالیس سے متجاوز اشعار پر مشتمل ہماری ملی تاریخ کی وہ پر وقار نظم ہے جس کا ہر مصرع یا تو ہمارے اکابر کی تاریخ ہائے ولادت و رحلت سے متعلق ہے یا ایسے اہم واقعات کا عددی ترجمان ہے جنہیں برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کے سنگ ہائے میل کہا جاسکتا ہے اس نظم کے بین السطور شاعر کے ملیّ جذبات کی سرسراہٹ کو بھی محسوس کیا جاسکتا ہے ہم خواجہ منظر حسن منظر کی اس عظیم ادبی کاوش پر انہیں ہدیہ تبریک پیش کرتے ہوئے مذکورہ بالا عنوانات کے تحت جمال فکر و نظر اور حرف و صوت کے آہنگ سے تراشے ہوئے چند خوبصورت تاریخی اشعار اور مصرعے نمونتہً نذر قارئین کرنا چاہیں گے۔

ہو سدا اپنی زباں پہ کیوں نہ بن قاسم کا نام

(۷۱۲ء)

شیر کا صرف ایک دن گیدڑ کے اسفل سو برس	اس نکو تربات سے اونچی ہے ٹیپو کی کُلاہ
۱۷۴۹ء	۱۷۹۹ء

زندہ جاوید سر سید کی نیک افعال ذات

(۱۸۱۷ء)

اک اساس داستاں ہے قائدِ اعظم کا قول	اتحاد و نظم وایقاں ہی ہے اصل زاد راہ
۱۹۴۷ء	۱۹۴۷ء
یک قلم ضرب کلیمی کا جرس بانگ درا	مستقل اقبالؔ نے ہم کو بتائی تھی جو راہ
۱۸۷۴ء	۱۹۳۸ء
یاد ہے بے باک حسرتؔ کا تھا حق گوئی شعار	مہر تاباں اس کا تقویٰ، مشعل قلب و نگاہ
۱۸۷۵ء	۱۹۵۱ء

صدر محفل وہ مقرر تھا بہادر یار جنگ — پاک جوہر منزل اس کی فرض کی قربان گاہ

۱۹۰۵ء — ۱۹۴۴ء

ایک مہدی صفی شبیر عثمانی بھی تھے — جس کے طور نیک پر ہر اک کی پڑتی تھی نگاہ

۱۸۸۵ء — ۱۹۴۹ء

ہم میں نشتر سا بھی تھا اک صادق و والا نہاد — زینت آفاق تھا جو روز و شب شام و پگاہ

۱۸۹۹ء — ۱۹۶۰ء

مرد نیک اہل قلم بے باک مولانا ظفرؔ — جس کا یکتا تھا قلم جس کی بصیرت بے پناہ

۱۸۷۳ء — ۱۹۵۶ء

قائداعظمؒ: تو موج کف لطف و عطا قائداعظم — تو اوج مہ صدق و صفا قائداعظم

۱۸۷۶ء — ۱۹۴۸ء

اقبالؒ: خودی کی راہ تجلی کا تیز پا اقبالؔ — رہِ خودی کی عزیمت سے آشنا اقبالؔ

۱۸۷۴ء — ۱۹۳۸ء

(جولائی۔ستمبر ۲۰۰۷ء)

نعت گویانِ سرگودھا

شاکر کنڈان

زیرِ نظر کتاب کی ترتیب و تدوین کا سہرا جناب شاکر کنڈان کے سر ہے۔ ۷۶۰ سے متجاوز صفحات پر مشتمل دراصل یہ ایک ایسا ارمغانِ تبریک وعقیدت ہے جو ایک وقیع تالیف بھی ہے اور تحقیقی و تخلیقی اوصاف سے متصف بھی، فاضل مرتب کا علمی سلیقہ جسے حب رسول ﷺ کی سرشاری نے جلا بخشی ہے از اول تا آخر اظہر من الشمس ہے۔ نعت کا قرآنِ حکیم سے تاسیسی رشتہ اور اس کا صنفی ارتقا جو نظم ونثر کی مختلف النوع اشکال پر مشتمل ہے، کتاب کا محققانہ پیش نامہ کہا جا سکتا ہے۔ جسے خود فاضل مُرتّب نے ''بسم اللہ'' کے زیرِ عنوان تحریر کیا ہے اور جو مبسوط بھی ہے اور خزینۂ خیر وخبر بھی۔ کلامِ الٰہی کے نعتیہ اسالیب سے لے کر نعت کے لغوی معانی اور مشاہیر شعر وادب کے وضع کردہ مفاہیم تک احاطہ کئے گئے ہیں جن میں مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ کی تحریر کا درج ذیل اقتباس بھی شامل ہے۔

''حقیقتاً نعت لکھنا بہت مشکل کام ہے جس کو لوگ آسان سمجھتے ہیں اس میں تلوار کی دھار پر چلنا پڑتا ہے اگر شاعر بڑھتا ہے تو الو ہیت میں پہنچ جاتا ہے اور کمی کرتا ہے تو تنقیص ہوتی ہے''۔

نعت کی ہیئت و ماہیت پر اظہار خیال کرنے والے دیگر مفکرین، ادبا اور شعراء میں جن حضرات کی تحریروں سے اقتباسات پیش کیے گئے ہیں ان میں مرزا مقبول بیگ بدخشانی، ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ڈاکٹر عاصی کرنالی، ڈاکٹر ریاض مجید کے علاوہ (شعراء میں) راغب مرادآبادی، حافظ لدھیانوی، شیر افضل جعفری اور سید سجاد رضوی وغیرہ شامل ہیں یہاں ہم عرفی کا منقولہ ایک شعر پیش کرنا چاہیں گے:

عرفی مشتاب ایں رہ نعت است نہ صحرا است   آہستہ کہ رہ بردمِ تیغ است قدم را

اور حضرت مولانا حسن مثنیٰ ندوی کا یہ قول کہ نعتِ شہ کونین ؐ شیفتگی چاہتی ہے، آشفتگی نہیں، سپردگی چاہتی ہے شوریدہ سری نہیں، ہوش چاہتی ہے، بے ہوشی نہیں، تہذیب چاہتی ہے وحشت نہیں'' نعتِ رسول مقبول ؐ کی کثیر الجہتی نزاکتوں اور باریکیوں کا بلیغ خلاصہ ہے اور مرتب کے ذوقِ سلیم کا آئینہ دار۔

جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے مرتب نے اپنی اس بصیرت افروز علمی کاوش کو ''سرگودھا'' پر مرتکز کیا ہے اور اس نسبت سے اس علاقے کا تاریخی، تہذیبی اور معاشرتی پس منظر کا نہایت جامع احاطہ کیا ہے ایک مختصر سا اقتباس ملاحظہ ہو:

''نعت گویانِ سرگودھا میں سرگودھا ایک شہر یا ضلع تک محدود نہیں رہا بلکہ یہ ایک علاقے کا نام ہے جس میں بے شمار تاریخی اور جغرافیائی تبدیلیاں رو پذیر ہوئیں۔ سرگودھا شہر کی آبادی تو کل کی بات ہے آج سے ایک سو اور چند سال پہلے یہاں انگریز کا آباد کردہ ایک چک (دیہہ) تھا جسے چک ۴۵ شمالی کہا جاتا تھا جہاں ایک تالاب تھا جس کے کنارے ایک سادھو نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ تالاب کو ہندی زبان میں ''سر'' کہتے ہیں اور اس ''سر'' کے کنارے جھونپڑی میں جو سادھو رہتا تھا اس کا نام ''گودھا'' بتایا جاتا ہے''۔

تو یہ ہے سرگودھا کی اسمی توجیہہ جو کتاب کی تحقیقی نوعیت کی مظہر ہے یہی نہیں بلکہ فاضل مرتب نے تاریخ کو دقیقہ رسی کی حد تک کھنگالا ہے اور نثر میں نعت گوئی کے سلسلے میں مولوی احمد الدین بگوی کو اولین حوالہ قرار دیا ہے۔ شاکر کنڈان لکھتے ہیں:

''مولوی احمد الدین بگوی کا نام علمائے دین کی فہرست میں جہاں آتا ہے وہاں آپ کا نام مصنفین میں بھی عزت سے لیا جاتا ہے آپ ۱۲۲۳ھ میں حافظ نور حیات کے ہاں بگہ نزد بھیرہ میں پیدا ہوئے۔ عمر کا کافی حصہ لاہور میں گزارا، ۱۲۶۲ھ میں مستقلاً بھیرہ منتقل ہو گئے آپ نے تدریس کے ساتھ ساتھ درسی کتب کی تصانیف اور کئی کتب کے حواشی لکھ کر طلباء کی بڑی خدمت کی۔''

نثر میں نبی آخر الزماں ؐ کی مداحی کرنے والوں میں مزید جو نام دیئے گئے ہیں ان میں

مفتی محمد یار خلیق، مولانا غلام مرتضیٰ، مولانا فقیر اللہ خوشابی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولوی کرم الدین، احمد بلوچ، مولانا سید محبوب علی شاہ، ایم۔اے۔لطیف، مفتی سید عبدالکریم، کرنل ملک عطا رسول، پیر محمد کرم شاہ، سید اعجاز سرور گیلانی، کرنل شیر محمد ملک، پروفیسر صاحبزادہ عبدالرسول، ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، غلام محمد ملک، خورشید عالم گوہر رقم اور عبدالقدوس ترمذی وغیرہ نہ صرف شامل ہیں بلکہ ان مدح سرایان نبیؐ کا مختصر مگر جامع تعارف بھی کتاب کی زینت ہے۔ یہی اہتمام فاضل مرتب نے نعت گو شعراء کی نسبت بھی برقرار رکھا ہے جو تحقیق و جستجو کا نہایت مدبرانہ اظہار ہے۔ یہ انتخاب ۳۵۰ سے زائد نعت گویانِ سرورِ کونینؐ پر مشتمل ہے جو سرزمین سرگودھا سے منسوب ہوئے ان میں ایک مختصر تعداد (۳۲) اُن شعرائے کرام کی بھی ہے جو کسی نہ کسی عنوان مختصراً یا تادیر سرگودھا میں قیام پذیر رہے۔ اس شعبہ کا آغاز صاحبِ کتاب نے شاہ ابو المعالی غربتیؒ (۱۶۱۶۔۱۵۵۳ء) سے کیا ہے جن کے بارے میں وہ یوں رقمطراز ہیں۔

"تاریخِ بھیرہ، سکینۃ الاولیاء، دربار ملی، ماہانہ شام وسحر اور روزنامہ مشرق اس وقت میرے سامنے ہیں جن کے مطابق شاہ ابوالمعالیؒ بھیرہ (حال ضلع سرگودھا) میں پیدا ہوئے۔آپ کے نام میں یہاں معمولی سا اختلاف پایا جاتا ہے۔تذکرہ شعرائے پنجاب (فارسی) کے مطابق اسد الدین نام تھا لیکن مزید وہ تسلیم کرتے ہیں کہ کچھ نے خیر الدین نام لکھا ہے۔خالد محی الدین بھی اپنے ایک مضمون مطبوعہ اردو ڈائجسٹ میں اصل نام شاہ خیر الدین محمد لکھتے ہیں"

نیز صاحبِ کتاب "خفتگانِ خاکِ لاہور" کے مصنف پروفیسر محمد اسلام کے حوالے سے لاہور میں مدفون حضرت شاہ ابو المعالیؒ کی لوحِ تربت پر کندہ الفاظ یعنی "حضرت شاہ ابو المعالی قادری الکرمانی حنفی رحمۃ اللہ تعالےٰ لقب اسد الدین وشاہ خیر الدین" کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شاہ ابوالمعالیؒ عربی اور فارسی میں شعر کہتے تھے ایک فارسی نعت بھی نقل کی گئی ہے جسکا مطلع ہے:

اے بذاتِ تو مزین مسندِ پیغمبری اے خجل گشتہ زرویت آفتاب خاوری

صاحبِ کتاب نے حضرت سلطان باہوؒ (۱۶۹۰۔۱۶۲۹ء) کو بھی اسی فہرست میں شامل کیا ہے آپکی جائے پیدائش کے بارے میں متعدد تحقیقی حوالوں کے بعد صاحبِ کتاب نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ''حضرت سلطان باہوؒ کا وطن اصلی موضع انگہ وادیٔ سون ضلع خوشاب ہے آپ کے والدین نقل مکانی فرما کر شورکوٹ جھنگ تشریف لے گئے'' آپکی کتابوں کی تعداد ایک سو چالیس بتائی جاتی ہے جو عربی، فارسی اور پنجابی میں ہیں۔ بیشتر شعراء کا نمونہ کلام انکے تعارف کا حصہ ہے تاہم بعض شعراء کے تعارف میں نمونۂ کلام شامل نہیں ہمیں احساس ہے کہ مستند مواد کے حصول میں مرتب کو یقیناً دشواریوں کا سامنا رہا ہوگا اس کے باوجود زیرِ نظر ضخیم کتاب کی محققانہ ترتیب و تدوین شاکر کنڈان کی علمی بصیرت کا شاہکار ہے اور سرگودھا جیسے مردم خیز خطۂ ارض کو دنیائے علم و ادب میں متعارف کرانے کی نہایت قابل قدر کاوش جسکا اندازہ شعراء کی طویل فہرست میں جن چند ناموں سے لگایا جاسکتا ہے وہ ہیں خواجہ قمر الدین سیالوی، سردار بشن سنگھ بیکل۔ جوہر نظامی، ڈاکٹر کشور سین حقیر، فیض لدھیانوی، خواجہ فخر الدین سیالوی، الطاف مشہدی شمیم بھیروی، مرزا محمد منور، احمد ندیم قاسمی، پروفیسر غلام جیلانی اصغر اور ڈاکٹر انور سدید وغیرہ، فہرست مضامین کے آخر میں ''کچھ خواب سے چہرے'' کے ذیلی عنوان کے تحت چند ایسے حضرات کے اسمائے گرامی ہیں جو بوجوہ سرگودھا میں قیام پذیر رہے اور وہاں کی ادبی تاریخ کا حصہ بن گئے ان میں شامل ہیں حضرت پیر مہر علی شاہؒ، جسٹس ایس۔ اے۔ رحمان، سید ظفر ہاشمی، فیض احمد فیض، رحمان کیانی، ڈاکٹر صفدر حسین، چوہدری فضلِ حق، الطاف پرواز، صاحبزادہ رفعت سلطان، غلام رسول ازہر، مرتضٰی برلاس اور جمیل یوسف وغیرہ۔

شاکر کنڈان کو ہم انکی اس وقیع کاوش پر ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں اور اس اندازِ تحقیق و معارف گستری کو بنظرِ تحسین دیکھتے ہیں جسکا برملا اظہار انکے مآخذ کی طویل فرست سے ہوتا ہے جس میں مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتب، مقالات، مجلّات و رسائل، اخبارات و مکاتیب اور اہم شخصیات سے ذاتی رابطے شامل ہیں۔

(جولائی۔ستمبر ۲۰۰۷ء)

غالب کا جمالیاتی شعور

سید مشکور حسین یاد

مشکور حسین یاد انشائیہ وغزل کا تو استعارہ بن ہی چکے ہیں، گزشتہ چند برسوں سے تشبیہات فلسفہ وحکمت پر اپنی گرفت مضبوط کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں یہی نہیں بلکہ مذہبی افکار ونظائر اور قرآنی موضوعات پر بھی مخصوص ومنفرد تجزیہ نگاری کے بعد مولانا مشکور حسین یاد کہلانے کا بھی استحقاق حاصل کر چکے ہیں۔ بہر حال ان کی تخلیق وتحقیق یا تنقید ومعارف نگاری کی جہتوں کے اہداف کچھ بھی ہوں موضوعات کے تفاوت سے قطع نظر ان کا لطیف ومتبسم اور جمیل ومترنّم طرز نگارش ان کی شناخت بن گیا ہے یہ الگ بات ہے کہ غزل میں جولسانی اور جمالیاتی تجربات وہ کر رہے ہیں ان کی تفہیم معاصر ادبی نقادوں ہی کے لئے نہیں بلکہ مستقبل کے تجزیہ نگاروں کے لئے بھی غالب کے اس شعر کی تفہیم پر موقوف ہو کر رہ گئی ہے کہ

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

یاد صاحب نے تو غالب کی تفہیم کا بھی حق ادا کر دیا ہے خود زیر نظر تصنیف میں (از رہ تالیف قلب) لکھتے ہیں کہ

’’میں غالب کو جس طرح بہت بڑا شاعر مانتا ہوں اسی طرح اسے بہت بڑا حقیقت پسند بھی قرار دیتا ہوں، غالب کے یہاں شاعری اور حقیقت پسندی دو مختلف چیزیں نہیں ہیں یہ دونوں لازم وملزم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسی لئے میں نے ’’غالب بوطبقا‘‘ میں خاص طور پر غالب کی شعریات کے حوالے سے اس کی حقیقت پسندی کا اظہار کیا۔ ’’غالب کا ذوق الٰہیات‘‘ میں الٰہیات کے حوالے سے غالب کی حقیقت پسندی پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی اور ’’غالب کی طبع نکتہ جُو‘‘ میں یہ بتایا ہے کہ غالب اپنے حقیقت پسندانہ رویہ کے پیش نظر کس طرح دوسرے شعراء کے خیالات کو آگے بڑھاتا ہے اور چراغ سے چراغ

نہیں جلاتا آفتاب طلوع کرتا ہے۔''

یاد صاحب نے ان چند سطور میں غالب سے متعلق اپنی جن تین تصانیف کا ذکر کیا ہے زیر نظر تصنیف بھی انہیں کا تسلسل ہے یعنی غالب کی فکر شعر، موضوعات شعر اور اسالیب شعر پر دقیقہ رسی اور نکتہ آفرینی کی حد تک خامہ فرسائی البتہ مرکزی خیال غالب کا جمالیاتی شعور ہی ہے، چنانچہ اپنی تصنیف کو فلسفیانہ آہنگ عطا کرتے ہوئے انہوں نے مشرق و مغرب کے متعدد مفکرین ہی کے حوالوں پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آنحضورؐ کی حدیث مبارکہ یعنی ''ان اللہ جمیل'' ویحب الجمال'' کی نسبت سے اسلام کا نقطہ نظر بھی پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''اسلام میں اخلاقیات حقیقت عظمیٰ کی طرف سے انسان پر عائد ہوتی ہے اور اسی لئے وہ باعث مسرت ہوتی ہے اسی طرح آئیڈیالوجی اگر خوبی کے ساتھ عمل آرا ہو تو پھر وہ خوش کن بھی ہوتی ہے وجدان آفریں بھی جس کیلئے ایک لفظ جمالیات ہے یعنی اخلاقیات جمالیات کا روپ دھار لیتی ہے''۔

فاضل مصنف نقطہ نظر کے اعتبار سے راغب اصفہانی کے ہمنوا دکھائی دیتے یعنی یہ کہ جمال کا آغاز جسم سے ہوتا ہے اور نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جمالیات کے بارے میں جتنے جدید نظریات ہیں ان سب کو متذکرہ حدیث مبارکہ ''اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے۔''

یاد صاحب مارکس، نطشے اور فرائیڈ کا حوالہ دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ کانٹ کے قول کے مطابق جمالیات انسان اور فطرت میں جو ایک طرح کی دوری اور مغائرت ہے اسے دور کرتی ہے جبکہ شیلر کے مطابق ہمارے تجربات میں اغلاط سے پاک اک حس جمال ہوتی ہے جو ہمارے اندر کے ذوق اخلاقیات کے ایک نظم و ضبط کو واضح کرتی ہے البتہ یاد صاحب ہیگل کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس نے آرٹ کو تو کوئی خاص مرتبہ نہیں دیا البتہ ''جمالیات پر ایک رسالہ لکھ مارا'' اتنے بہت سے فلسفیوں کا ذکر کر دینے سے ہمارے خیال میں فاضل مصنف کو اردو سائنس بورڈ کا

''ناشرانہ التفات'' میسر آ گیا جس کا اظہار ''عرض ناشر'' میں اس طرح کیا گیا ہے۔

''ادب براہ راست بورڈ کے دائرہ کار میں شامل نہیں تاہم کسی بھی معاشرے کے ادب میں ہر طرح کے علوم اور ثقافت رچی بسی ہوتی ہے جمالیات سوشل سائنسز میں سے ایک اہم سائنس ہے۔''

اب کہیں ایسا نہ ہو کہ اردو سائنس بورڈ والوں کے لینے کے دینے پڑ جائیں اور ادبی موضوعات پر مسودات کتب کا سیلاب انہیں ''سوشل سائنسز'' کے بحر ذخار میں جا غرق کرے بہر حال یہ تو جملہ معترضہ تھا اہم بات یہ ہے کہ یاد صاحب نے زیر نظر کتاب کا آغاز ہی اپنے مبسوط دیباچے کے بعد غالب کے ایک مشہور فارسی شعر سے کیا ہے یعنی:

''فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است''

اور ارشاد فرمایا ہے کہ یہ ''شعر آج تک نقادوں اور محققین کو بیوقوف بنائے چلا جا رہا ہے'' خود غالب کے ہم عصر حکیم آغا جان عیش دہلوی سے لے کر جنہوں نے غالب پر پھبتی کسی تھی کہ ''مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے'' عہد موجود تک کے نقادوں اور محققین کا ''بیوقوف بن جانا'' ہمارے نزدیک محل نظر ہے تاہم اپنے دعوی کے ثبوت میں یاد صاحب نے یہ کہہ کر ہمیں مزید چونکا دیا ہے کہ ''میں نے اپنے اس مضمون میں غالب کے ایک شاگرد کا حوالہ بھی دیا ہے جس کو غالب نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ'' میاں اب تم فارسی وارسی میں شعر کہہ لیا کرو، ریختہ میں شعر کہنا تمہارے بس کا روگ نہیں'' جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ غالب کو اپنی اردو شاعری پر ناز تھا یہ الگ بحث ہے کہ وہ اپنے اس ناز کا اظہار کھل کر نہیں کرتے تھے۔''

ہمارے خیال میں غالب اپنے اس ناز کا اظہار کھلم کھلا بھی کرتے تھے مثلاً

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا
جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ گفتۂ غالب ایکبار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

فارسی شاعری بھی ان کے لئے وجہ تفاخر تھی، ان کا متذکرہ فارسی شعر ہرگز ہرگز نقادوں اور محققین کو بیوقوف بنانے کے لئے نہیں تھا البتہ یاد صاحب نے شاگرد کے نام خط کا بار ثبوت گوپی چند نارنگ پر ڈال دیا ہے بہتر ہوتا کہ وہ یہ بات خود اپنی تحقیق کے حوالے سے لکھتے:

یاد صاحب کی وارداتِ تازہ یعنی زیر تبصرہ کتاب بھی تازہ نہیں رہی بلکہ سنا ہے کہ مزید ایک تصنیف منظر عام پر آ چکی ہے جو ہم تک نہیں پہنچی لگتا ہے کہ ان کے قارئین ان کے یکے بعد دیگرے آنے والی ان کی مطبوعات کو اس تیزی سے نہیں پڑھ پاتے جس سرعت اور برق رفتاری سے وہ اپنی تصانیف کے ڈھیر لگائے جا رہے ہیں۔ بقول انیس

لگا رہاں ہوں مضامین نو کے پھر انبار　　　خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

مصنف کی اس قلمکارانہ یورش میں ان کے ''مغلوب الغالب'' ہوجانے کا اظہار از حد برملا ہے وہ شارحین غالب کی ''صف ناتمام'' میں تو ضرور شامل ہو گئے ہیں مگر تفہیم غالب کے سلسلہ میں ان کی توجیہات و استدلال سب سے جدا ہیں یہی نہیں بلکہ وہ حالی و طباطبائی سے لے کر آسی، غلام رسول مہر، بیخود، حسرت، آغا باقر اور خود اپنے ہم عصر پر تو روہیلہ کی شرح نگاری کو درخور استناد نہیں سمجھتے۔ غالب کے اس شعر کے حوالے سے کہ

قمری کف خاکستر و بلبل قفسِ رنگ　　　اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

حالی کی 'فہم نارسا' اور غالب کی ''طبع نکتہ جو'' کے اظہار کے لئے لکھتے ہیں:

''حالی نے اس شعر کی تشریح خود غالب سے پوچھی تھی جس پر غالب نے جواب دیا تھا کہ دوسرے مصرع کے پہلے لفظ ''اے'' کی جگہ ''جز'' لگا دو شعر کے معنی سمجھ میں آ جائیں گے''

لیکن دو سو پچاس سے متجاویز صفحات پر مشتمل زیر تبصرہ تصنیف ''غالب کا جمالیاتی شعور'' کے ایک باب بعنوان ''انسان کا افق حماقت'' میں یاد صاحب کا بدلتا ہوا یہ رنگ دیکھ کر میں ہمیں حیرت ہوئی کہ

''عنوان میں جو میں نے انسان کا افق حماقت کہا ہے آپ اسے نہایت آسانی کے ساتھ

غالب کا افق حماقت بھی قرار دے دیں تو کم از کم مجھے کوئی اعتراض نہیں"

بہر حال ایک انداز فکر کے تحت اسے مصنف کی حقیقت پسندی بھی تو قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایک نہایت ہمت اور حوصلہ کی بات یہ ہے کہ مشکور حسین یاد کا رہوار قلم شاہراہ ادب پر سرپٹ دوڑے چلا جا رہا ہے اور مشکور حسین یاد ہیں کہ "نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں"۔

(جولائی۔ستمبر ۲۰۰۷ء)

تجدید ہجر (شعری مجموعہ)

حجاب عباسی

شعری مجموعوں کا سیلِ رواں ایک مدت سے قریہ سخن کو جل تھل کیے ہوئے ہے ان تمام اصناف ادب میں جو جدید فکر و احساس کی ترجمانی کا ذریعہ بن رہی ہیں غزل سرفہرست ہے۔ غزل بنیادی طور پر واردات قلبی کے اظہار و ابلاغ کے حوالے سے اپنی مستحکم شناخت کو آج تک قائم رکھے ہوئے ہے لیکن اس کلاسیکی ورثے کے نژادنو تک منتقل ہوتے ہوتے جہاں 'ظرف تنگنائے غزل' میں مضامین و موضوعات کا تنوع اور وسعت پیدا ہوئی ہے وہاں اسلوب اور تازہ کاری کی نو بہ نو جہتوں نے بھی نئے آفاق کو جنم دیا ہے چنانچہ ہمارے پیش نظر شعری مجموعہ اسی فکری وفنی ارتقاء کے شواہد پیش کر رہا ہے شاعرہ حجاب عباسی کو شعری جوہر ان کے والد شعیب حزیں سے بھی منتقل ہوا ہے اور اس ورثہ کی تجدید و ترقیم میں ان کی اکتسابی کاوشیں بھی کارفرما نظر آتی ہیں اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی یہ تازہ تخلیق، فیضان نظر، اور مکتب کی کرامت کا پُر شکوہ امتزاج ہے

''زاویہ ءحرف'' کے زیر عنوان تجدید ہجر پیش کرتے ہوئے شاعرہ نے انکشاف کیا ہے کہ ''میں نے شاعری میں کسی سے باقاعدہ اصلاح نہیں لی، شاعری میری ذات کا اظہار ہے ۔۔۔ہاں فنی لحاظ سے کلام میں کوئی نقص نہ ہو لہٰذا سحر انصاری صاحب کو دکھاتی رہی ہوں وہی آپ کو میری شاعری اور میرے شعری رویے کے بارے میں بہتر طور پر بتا سکتے ہیں'' شاعرہ مزید لکھتی ہیں کہ:

'میں صرف اپنی ذات کے اندر ہی نہیں جھانکتی رہی اپنے گرد و پیش کو بھی گہری نظر سے دیکھنے کی کوشش کی اور جو کچھ دیکھا جو محسوس کیا اسے سپرد قلم کیا۔''

حجاب عباسی کی اس مبنی بر حقیقت رائے کا برملا ثبوت خود ان کا شعری مجموعہ ہے البتہ سحر انصاری صاحب کی جانب سے نہ کوئی تقریظ شامل کتاب ہے نہ کوئی فلیپی اظہار خیال حالانکہ حمایت علی شاعر اور

احمد ہمدانی کی جامع و برمحل آراء سے کتاب کا فلیپ مزین ہے حمایت صاحب فرماتے ہیں:

''ان کی غزل ہو یا نظم ۔۔۔۔ دونوں ہی فکر و فن کے اعتبار سے بھرپور داد و تحسین کے متقاضی ہیں خاص طور سے ان کی غزل جدید ہونے کے باوجود کلاسیکی روایت سے بھی سرشار نظر آتی ہے''۔

اور احمد ہمدانی صاحب کے خیال میں

''حجاب کی شاعری جدید حسیّت اور تازہ پیرایۂ اظہار کی قابل قدر مثال ہے ۔۔۔۔ حجاب کی نظموں اور غزلوں میں عصری آگہی پوری توانائی کے ساتھ موجود ہے ان کے لہجے میں خود اعتمادی اور انفرادیت نظر آتی ہے''۔

چنانچہ ہمیں بھی مطالعہ کے بعد حجاب کے کلام سے کم و بیش انہی اوصاف کا ادراک ہوا مجموعہ کے آغاز ہی میں جس ایک شعر کو مکمل صفحہ کی زینت بنایا گیا ہے وہ شاعرہ کے فکر و فن کی مجموعی نمائندگی کرتا ہے اور ہم اس شعر کو ان کی شاعری کے تناظر میں اسقدر برمحل سمجھتے ہیں کہ اس شعر سے کتاب کے لئے نام کا موزوں ترین اکتساب بھی کیا جاسکتا تھا۔ یعنی 'حرف سخن' شعر ملاحظہ ہو:

سارا ہنر سمیٹ کر جادۂ فن میں رکھدیا ذات کا اضطراب بھی حرفِ سخن میں رکھدیا

اسی انداز فکر کی تمثیل کے طور پر یہ اشعار بھی قابل توجہ ہیں:

زمیں کے ساتھ لکھا آسمان کاغذ پر سجائے بیٹھے ہیں دونوں جہان کاغذ پر
ستارے، پھول، دھنک، چاندنی، صبا لکھے بنا کے رنگوں سے اپنا مکان کاغذ پر

حجاب کے کلام کو انتخاب کے آئینے میں دیکھا جائے تو لفظ و معنی اور ہیئت و اسلوب کے محتاط انداز اور شائستہ رویے منعکس نظر آتے ہیں نیز حرف و صوت کی جمال آفریں کیفیات سے ان کا شعر ان کی انفرادیت کا غماز دکھائی دیتا ہے مثلاً

التجا بے اثر، چشم تر رائیگاں یہ جبیں رائیگاں، سنگ در رائیگاں
نہ سخن معتبر نہ نظر دلنشیں اب ترے روبرو سب ہنر رائیگاں

یہ کون گیا رکھ کر گرداب سر مژگاں — کچھ اشک سر مژگان کچھ خواب سر مژگاں

تجھ کو لکھا ہے جب سے بیاض خیال پر — دنیا مہک اٹھی مرے احساس کی طرح

اس قریۂ سخن میں قیامت کی خامشی — ہونٹوں پہ جم گئی ہے مری پیاس کی طرح

رات بھر قریۂ جاں پھول کی صورت مہکا — سو گئے تھے تری تصویر کو دل میں رکھ کے

ہم کہہ سکتے ہیں کہ حجاب کا فن روایات کا امین اور تجربات کا گہوارہ ہے جسے ان کی تازہ کاری اور جدید حسیت نے جلا بخشی ہے وہ اپنے بیشتر معاصرین سے اس لئے مختلف نظر آتی ہیں کہ انہوں نے غزل کے مزاج و آہنگ سے متصادم نہ تو لفضیات کا استعمال کیا ہے اور نہ غیر مانوس محاکات و تشبیہات کا سہارا لیا ہے ان کا تخلیقی ذہن لطیف و شگفتہ اور حسین و مرصع تراکیب کا متلاشی رہتا ہے ان کے یہاں نہ معنوی ابہام ہے نہ لفظی تنافر وہ داخلیت کی ترجمانی میں لہجہ کی نرمی اور کلام کی شستگی کا اہتمام کرتی ہیں ملاحظہ ہو

پہلی بارش میں مہک جاتی ہے مٹی جیسے — بات یوں پھیل گئی جنبش لب سے پہلے

کب تلک راہ میں آنکھوں کو فروزاں رکھتے — بجھ گئے سارے دیئے آخر شب سے پہلے

پہلے اک عمر سر کوئے ملامت رکھا — پھر مجھے کھینچا گیا دار پہ سب سے پہلے

اب مرے شناسا ہیں راستے کے پتھر تک — ایک ہی تو رستہ ہے میرے گھر سے اس در تک

اب دریدہ دامن میں یاد کے خزانے ہیں — بند مٹھیوں میں تھے پتھروں سے گوہر تک

تشنگی نگاہوں کی روح تک تو آ پہنچی — دل کی پیاس پھیلی ہے دشت سے سمندر تک

عالم تمام چپ ہے مرے بولنے تلک — کلیاں چٹک سکیں گی نہ لب کھولنے تلک

تسخیر آسماں کا ارادہ تو تھا مگر — رُت ہی بدل گئی مرے پر کھولنے تلک

چھن جائے نہ آنکھوں کی تپش سے خواب کی دنیا — میں چشم نم کے سائے میں ترا پیکر بناتی ہوں

دھنک رنگوں سے پھر آراستہ کر کے ترا پیکر — کبھی آنکھوں کبھی دل کی جگہ پتھر بناتی ہوں

جدید غزل کا نمایاں وصف وہ عصری شعور ہے جو نت نئے اسالیب کے سانچوں میں ڈھل

کرمتنوع تاثرات مرتب کرتا ہے بعض جدیدیت کے پرستاروں نے اسے تلخ، کرخت اور جارحانہ لب ولہجہ سے ہمکنار کر دیا ہے جبکہ بعض کے انداز اظہار میں توازن اور فنی حسن کو پیش نظر رکھا گیا ہے حجاب کا تعلق موخر الذکر اہل قلم سے ہے۔ چند شعر:

ستم لکھا کبھی آزار لکھا کہ جو لکھا سر دیوار لکھا
کبھی زندان کو گھر لکھا ہے ہم نے کبھی مقتل کو کوئے یار لکھا

ہاتھ جس وقت قلم ہوتے ہیں سچ لکھنے پر چیخ اٹھتا ہے لہو، زخم ہنر بولتے ہیں
جب بھی لگتے ہیں یہاں نطق وزباں پر پہرے کبھی نیزے پہ کبھی دار پہ سر بولتے ہیں

ہر شاعر کا احساس لطیف بھی ہوتا ہے اور شدید بھی، تخئیل وتصور بھی نت نئے خاکوں میں رنگ بھرتے رہتے ہیں لیکن کم ہوتے ہیں ایسے لوگ جو محسوسات اور تخیلات کے خوبصورت پیکر تراش سکیں اور جنہیں اپنی ہنرمندانہ کاوش سے دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والے حسین الفاظ کا لباس فاخرہ عطا کر سکیں شعری تخلیق کی اس جہت میں حجاب عباسی خاصی کامیاب نظر آتی ہیں۔ اوران کے دروبستِ شاعری سے مستقبل کے امکانات اور بھی روشن نظر آتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں تکنیکی اعتبار سے ردیف وقوافی کا باہم دگر معنوی اور صوتی ربط، کلام کے حسن کو دوبالا کر دیتا ہے خصوصاً جبکہ ردیفوں سے ندرت اور قافیوں سے خیال کو نقطہ عروج تک پہنچادینے کی صلاحیت مترشح ہو۔ چند نمونے:

خوابوں کی دہلیز پہ لاکر اپنی آنکھیں رکھدی ہیں آس کے بجھتے دیئے ہٹا کر اپنی آنکھیں رکھدی ہیں
عشق کے کاروبار میں کچھ تو گروی رکھنا پڑتا ہے نیندیں کھو کر خواب بچا کر اپنی آنکھیں رکھدی ہیں
کم بینی کے دام ملیں گے جب سے یہ اعلان ہوا ہراک نے بازار میں لا کر اپنی آنکھیں رکھدی ہیں
آنے کو ہے دید کا موسم لائی صبا پیغام حجاب تم نے ابھی سے بام پہ لا کر اپنی آنکھیں رکھدی ہیں

بس گھڑی دو گھڑی کوئی مہماں رہا جگمگاتے رہے بام و در عمر بھر
گام دو گام تھا ہم سفر وہ مرا پھر مہکتی رہی رہگزر عمر بھر

(جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۷ء)

نقوشِ سیرت

ڈاکٹر شیر محمد زمان چشتی

زیرِ تبصرہ کتاب کے فاضل مصنف جنہیں ۱۹۶۸ء میں ہارورڈ یونیورسٹی (امریکہ) نے جو عالمی سطح کی جامعات میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے اُن کے تحقیقی مقالے بعنوان ''عربی ادب و تاریخ'' پر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری عطا کی۔حکومت پاکستان نے ان کی علمی خدمات جلیلہ کے اعتراف میں ستارۂ امتیاز کے اعزاز سے سرفراز کیا۔جنھیں ''وسام العلوم والفنون'' کے مصری اعزاز کے ذریعہ ان کی عالمانہ کاوشوں کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔جن کی کثیر السانی بلند پایہ تصنیفات و تالیفات ادارۂ تحقیقات اسلامی کے توسط سے منصۂ شہور پر آئیں اور وفاقی دارالحکومت اسلام آباد ہی کے ایک اور معروف تاریخی وثقافتی تحقیق کے ادارے نے قومی اہمیت کے ایک منفرد موضوع یعنی نظام ونصاب تعلیم سے متعلق قائداعظم کے افکار ونظائر کو انگریزی زبان میں مقالے کی اشاعت کے ذریعہ متعارف کیا یہی نہیں بلکہ وہ جن مناصب فاخرہ پر فائز رہ چکے ہیں ان میں چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل (جو ایک آئینی منصب ہے) ڈائریکٹر جنرل ادارۂ تحقیقات اسلامی بین الاقوامی جامعہ اسلامیہ اسلا آباد اور رئیس الجامعہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی نیز دیگر علوم ومعارف سے وابستہ ادارے شامل ہیں لیکن وہ اپنی ایک اہم اور تازہ ترین تصنیف جن الفاظ کے ساتھ پیش کرتے ہیں وہ یہ ہیں:

''کسی نہ کسی جہت سے حضور رسالت مآبؐ کی سیرتِ طاہرہ کے ساتھ کسی نہ کسی درجے کی نسبت رکھنے والی یہ ٹوٹی پھوٹی تحریریں نذر قارئین ہیں۔کیا عجب کہ کوئی حرف اُس دربار رحمت میں بار پا جائے اور ایک بےعمل کے لیے باعث شفاعت سرکارؐ ورحمتِ غفار ہو جائے۔قارئین کرام میں کسی مقبول بندے کے حرف دعا سے ایک خطا کار کی مدعا تک رسائی ہو جائے وہ مدعا جو دل کی کائنات بھی ہے متاع آخرت بھی۔''

عجز وانکسار کا خضوع وخشوع سے مملویہ والہانہ انداز فاضل مصنف کی عالمانہ عظمت اور معارف گسترانہ بصیرت کا غماز ہے۔ بقول صائب:

فروتنی ست دلیلِ رسیدگانِ کمال　　　　که چوں سوار بمنزل رسد پیادہ شود

ہمیں یہ دیکھ کر بھی یک گونہ طمانیت کا احساس ہوا کہ کتاب کے صفحات پیشہ ورتقریظ نگاروں کی ''داد وتحسین'' سے مبّرا ہیں جو بالعوم مطالعہ کیے بغیر ہوسِ خودنمائی کی تسکین اور تشہیر کے حصولِ مدعا کی خاطر اعتدال وتوازن کی حدوں سے بے نیازانہ گزر جاتے ہیں الحمدللہ کہ زیرِنظر مبارک وموقر تصنیف کا جائزہ ایسے ثقہ اور جید سکالرز نے لیا ہے جن کی دقیقہ شناسی مسلم ہے اور جو اہل علم کے حلقوں میں احترام سے دیکھے جاتے ہیں چنانچہ ایسی ہستیوں کی عارفانہ تجزیہ نگاری کے پیش نظر ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے لیے کسی بھی نوع کا نقادی اضافہ کرنا ممکن نہیں۔ خصوصاً پروفیسر عبدالجبار شاکر ڈائریکٹر جنرل دعوۃ اکیڈمی انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد نے جس شرح وبسط سے تصنیف کو نقد ونظر کا موضوع بنایا ہے وہ خود موصوف کی جلالتِ علمی کا مظہر ہے جس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے کیا جاسکتا ہے۔

''نقوشِ سیرتؐ کے دس مضامین میں فاضل مصنف نے اپنے خطبات میں نگارخانۂ بطحیٰ کی جن تصاویر کو پیش کیا ہے واقعات کے لیے جو پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے، عقیدت وواردات کے جو گلدستے سجائے ہیں، حقائق کی جس طرح سے نقاب کشائی کی ہے، مستشرقین کے تعصّبات کا جیسے تجزیہ کیا ہے نبیؐ رحمت کی عظمت وعزیمت کو جس اسلوب میں لکھا، ملتِ اسلامیہ کی زبوں حالی پر جو دکھ محسوس کیا ہے اور اس کے علاج کا جو تریاق تجویز کیا ہے یہ سب ایسے توازن کی مثالیں ہیں جو سیرت نگاری کے لیے ناگریز ہے''۔

سیرت نگاری کا یہی حکیمانہ اسلوب شعبۂ عربی وعلوم اسلامیہ گورنمنٹ کالج لاہور کے سابق صدر پروفیسر خورشید رضوی کی توجہ کا مرکز بنا چنانچہ موصوف پاکیزہ سیرت وپاکیزہ صورت ڈاکٹر زمان کی زیرِ نظر بلیغ تصنیف کے دلپذیر محاسن پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں۔

''ڈاکٹر صاحب کا اسلوب بیان راست اور نقطۂ نظر دوٹوک اور ابہام سے پاک ہوتا ہے۔ وہ جا بجا ایک ایک جملے میں ایک قول فیصل سموتے چلے جاتے ہیں جو نظر کی وسعت اور فکر کی گہرائی، عقیدے کی مضبوطی اور چشمِ بصیرت کو کھلا رکھنے کی طویل ریاضت کا ثمرہ ہے۔ اردو اور انگیریزی پر یکساں قدرت، فارسی کے عمدہ ذوق اور عربی پر ماہرانہ گرفت کے باعث ان مضامین میں ایک ایسا عمق اور تہہ داری پیدا ہوگئی ہے جو دورِ حاضر میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔۔۔ ہم ''نقوش سیرت'' کو نکلتے ہوئے سورج کی اُفق تابی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔''

فاضل مصنف کے ایک اور معاصر اور مفتخر سکالر جو انسٹی ٹیوٹ آف سائنس اینڈ ہیومیٹیز برائے خواتین اسلام آباد میں ڈین کے منصب جلیلہ پر فائز ہیں۔ڈاکٹر خالد علوی ہیں جنہوں نے نہایت جامعیت سے اس بصیرت افروز تصنیف کا جائزہ لیتے ہوئے جن اہم نکات پر ارتکاز توجہ کیا ہے ان میں فاضل مصنف کی ناقدانہ بصیرت، زبان و بیان کی لطافت اور استناد کی پختگی شامل ہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ

''وہ (فاضل مصنف) ایک عام تبصرہ نگار نہیں بلکہ ایک محقق نقاد ہیں جو موضوع کے گہرے ادراک کی بنا پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں اور وہ رائے مستند اور قابلِ اعتماد ہوتی ہے۔''

اس میں شک نہیں کہ محترم ڈاکٹر زمان کی زیر نظر تصنیف جو ان کی ارادت وعقیدت کا وجیہہ الشان شاہکار ہے وہ تدبر اور تعقل کی میزان پر بھی پورا اترتا ہے کتاب کی خرد افروزی اور معارف پروری کا اندازہ ماٰخذ وحوالہ جات کی اس طویل فہرست سے لگایا جا سکتا ہے جو مشرق و مغرب کے مسلم الثبوت مفکرین مفسرین اور مبصرین پر مشتمل ہے بلکہ ایک ایسے یہودی النسل مستشرق (D. S. Margoliouth) کی تصنیف " Muhammad and the Rise of Islam" سے ایک اقتباس پر بھی مشتمل ہے جو اس یہودی مستشرق کے ''متعصّبانہ اور متشددانہ نقطۂ

نظر" کے باوجود ایک ایسے اعترافِ حقیقت کا مظہر ہے جسے وہ اپنے لیے باعثِ اعزاز بھی سمجھتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

" The Blographers of the Prophet Muhammad form a long series which it is impossIble to end, but in which it would be honourable to find a place."

ڈاکٹر صاحب نے اس تازہ تصنیف میں اپنے جن مقالات کو شریک اشاعت کیا ہے ان میں سیرت طیبہ کے مختلف پہلوؤں کو قارئین کے لیے نور ایمان و بصیرت بنانے کی سعادت حاصل کی ہے۔ اس ضمن میں وہ جن موضوعات کو مزید معرضِ تحریر میں لائے ہیں اُن میں اُسوہٗ حسنہ کی روشنی میں اسلامی فلاحی ریاست کا تصور بھی شامل ہے جو موصوف نے قومی سیرت کانفرنس منعقدہ ۱۲ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ بمطابق ۱۰ ستمبر ۱۹۹۲ء میں پیش کیا۔ یہ مقالہ اس اعتبار سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں اسلامی فلاحی مملکت کے خدوخال پوری جامعیت کے ساتھ منعکس کیے گئے ہیں جن کو ہم ساٹھ سال گزر جانے کے باوجود بھی پاکستان میں عملی شکل میں دیکھنے کے متمنی ہیں۔ ایک جگہ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔

"فلاحی ریاست کے جدید سیکولر تصور اور اسلامی نظریہ میں سب سے اہم فرق جو ایک اسلامی ریاست کو ایک عام فلاحی ریاست سے ممیز کرتا ہے انسان کی اخلاقی و روحانی ضروریات کا وہ اہتمام ہے جو فلاحِ آخرت کے ابدی تصور سے وابستہ ہے افراد اور معاشرے کو دنیوی خیر و برکت اور آسودگی کے ساتھ ساتھ فلاحِ آخرت کے راستے پر گامزن رکھنا بھی اسلامی فلاحی ریاست کی ذمہ داری ہے"

کتاب کا ایک اہم حصہ موضوعی وابستگی کے باعث ایسی تصانیف و تالیفات پر مشتمل ہے جو ڈاکٹر صاحب کے ہم عصر و ہم وطن اہل قلم کی مرتب کردہ ہیں اور جن پر ڈاکٹر صاحب نے معروضی تجزیئے رقم کیے ہیں ان میں بریگیڈیر گلزار احمد مرحوم کی تصنیف "ثنائے خواجہؐ" عزیز ملک مرحوم کی تالیف "تذکارِ نبیؐ" اور رفیق ڈوگر کی کتاب "الامینؐ" شامل ہیں آخر الذکر کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا یہ تاثر توجہ طلب ہے کہ "تین ضخیم جلدوں پر مشتمل یہ کتاب اپنے اندر

مخصوص جاذبیت و دلکشی رکھتی ہے اور قاری کے ذہن و قلب پر تسخیری کیفیت پیدا کرنے میں گہری تاثیر کی حامل ہے'' اسی طرح ظفر علی قریشی کی کتاب 'ازواجِ مطہرات اور مستشرقین'' کا مبسوط جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ ''جناب ظفر علی قریشی کی اصل وجہ شہرت رسول کریمؐ کی سیرتِ مبارکہ کے حوالہ سے مستشرقین کی تحریروں کا وہ بے بدل ذخیرہ ہے جسے انکا اثاثۂ حیات سمجھنا چاہیے شاید ہی پاکستان کے کسی مکتبہ میں اس موضوع پر اتنا جامع ذخیرہ موجود ہو۔''

معروف مجلۂ ادبی ''نقوش'' کے رسولؐ نمبر کی دس جلدیں ڈاکٹر صاحب کے تبصرہ تحریر فرمانے سے قبل شائع ہو چکی تھیں جب کہ تین بعد میں شائع ہوئیں۔ دس جلدوں پر ڈاکٹر صاحب کا تجزیاتی مطالعہ ان کی ژرف نگاہی کا شاہکار ہے انہوں نے مرتب جناب محمد طفیل مرحوم کو ان کی اس عظیم کاوش پر خراجِ تحسین بھی پیش کیا ہے اور ادارتی نقائص کی بھی برملا نشان دہی فرمائی ہے جو کسی بھی سنجیدہ قاری کے لیے تشنگی کا باعث بنتے ہیں۔ یہ مدلل معروضیت ڈاکٹر زمان ہی کا حصہ ہے جس کے لیے وسیع العلم ہونا شرط ہے تاہم ذیل کا اقتباس ڈاکٹر صاحب کی جانب سے نقوش کے مدیر کا استحقاق ہے:

''معلومات کی وسعت و جامعیت اور عنوانات کے تنوع کے ساتھ انتخاب کی یہ خوبی بھی داد کی مستحق ہے کہ اکثر مقالات مستند ہیں اور مشاہیر کے قلم سے ہیں ان مضامین کو یکجا کرنے کے لیے جو محنت بروئے کار لائی گئی ہوگی اس کا بہ آسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ خوبیاں اظہر من الشّمس ہیں۔''

ہم سمجھتے ہیں کہ سیرت طیبہ پر تخلیق ہونے والے لٹریچر کے لامتناہی سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کی یہ بصیرت افروز تصنیف اپنے محاسن علمی اور قدیم و جدید افکار کے تناظر میں بھرپور پذیرائی کی یقیناً مستحق قرار پائے گی اور مصنف کے لیے توشۂ آخرت بھی۔ غالب ہی نہیں بلکہ ڈاکٹر صاحب کا بھی یہی ایمان ہے کہ:

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم کاں   کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

(اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۷)

محرابِ توحید

امین راحت چغتائی

جناب امین راحت چغتائی ایک ممتاز دانشور، صاحب بصیرت محقق، وسیع المطالعہ مصنف، زیرک وذہین صحافی اور وجیہہ الفکر شاعر ہیں۔ اخلاق واخلاص کے اوصاف ذاتی سے متصف ہیں ''محراب توحید'' ان کی نصف درجن تصانیف وتالیفات کا نقشِ تازہ (۲۰۰۷ء) ہے جو ان کے نعتیہ کلام پر مشتمل ہے۔ نقش اول بھی ایک شعری مجموعہ تھا جو ۱۹۸۶ء منصۂ شہود پر آیا۔ ''دلائل'' اور ''ردعمل'' کے زیرِ عنوان ان کے علمی، ادبی اور تنقیدی و تحقیقی مضامین کے مجموعے ۱۹۹۳ء اور ۲۰۰۶ء میں علی الترتیب شائع ہو کر اہل دانش سے سندِ پذیرائی حاصل کر چکے ہیں جب کہ درمیانی مدت میں ان کی مزید دو معرکہ آراء تصانیف بعنوان ''قرآن اور نظام کائنات'' (تفسیری مضامین مطبوعہ ۲۰۰۰ء) اور ''مغل مکتب مصوری ۔۔ سولہویں صدی عیسوی میں'' (تحقیقی مقالہ مطبوعہ ۲۰۰۲) منظر عام پر آئیں جو ان کی مسلمہ علمی و تحقیقی صلاحیتوں کا شاہکار ہیں ان مین موخرالذکر مقالہ تفصیلاً ہمارے زیرِ مطالعہ آیا جو نقد ونظر کی ہر اُس میزان پر پورا اُترتا ہے جس کے تحت ملک یا بیرون ملک کی کوئی بھی مقتدر جامعہ انہیں پی۔ ایچ۔ ڈی کا اعزاز عطا کرنے میں تذبذب کا شکار نہیں ہو سکتی لیکن محسوس ہوتا ہے کہ ایسی کسی خواہش سے بے نیازی ان کی درویش صفتی کا نتیجہ ہے۔

''محرابِ توحید'' کے تقریظ نگاروں میں مستند الرائے شعرا کے علاوہ ایک ایسے محقق اور نقاد شامل ہیں جن کی میزان نظر میں تُل کر چغتائی صاحب کے نعتیہ کلام کے تہ در تہہ محاسن اظہر من الشمّس ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی فرماتے ہیں:

''امین راحت چغتائی کی نعتوں میں درد کے کتنے ہی رنگ ہیں، کہیں تکریم کا رنگ ہے، کہیں مدح وثنا کا آہنگ، کہیں علوئے مرجبۂ محمدی کی دعا اور تمنا، کہیں برکت ورحمت کا نغمہ، کہیں وہ صدائے سینہ سوز جو حریمِ ناز میں گونجتی ہے اور جس کے لیے جبریل امین بھی گوش بر آواز نظر

آتے ہیں، کہیں صلوٰۃ وسلام میں محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عظمت کے نشان نظر آتے ہیں، کہیں لبوں پر دائرے بناتے ہوئے صلوٰۃ وسلام کے الفاظ اذن حضوری کی استدعا بن جاتے ہیں اور درود تو وہ جاوداں پھول ہیں جن سے امین راحت چغتائی کا گلستانِ تمنا مہک رہا ہے۔''

امین راحت چغتائی کا ''گلستانِ تمنا'' ان کے زیرِ نظر نعتیہ مجموعے میں سمٹ آیا ہے جس کی تمثیل وتشکیل کا شاہد ''محرابِ توحید'' کا ایک ایک صفحہ ہے۔ ڈاکٹر کشفی نے جن محاسنِ کلام کی نشان دہی کی ان کی جمیل وحلیم عکاسی درجِ ذیل اشعار میں دیکھی جاسکتی ہے۔

نور مصحف کو صبح بہاراں لکھا رنگ پیکر کو حسن گلستاں کہا
تیری توصیف سے پھر بھی قاصر رہے سارے الفاظ صرفِ ہنر ہو گئے
اپنی فردسیہ دیکھ کر سر جھکا تیرے لطف و کرم دیکھ کر دل کھِلا
چشمِ نم نے بھی مجھ کو سہارا دیا پھر ستارے مری رہگزر ہو گئے

تجھے سرازل لکھوں، ابد کا رازداں لکھوں — خدا توفیق دے تو حاصلِ کون ومکاں لکھوں
سفینے ناخدا خود بن کے منزل پر پہنچ جائیں — ترا اسمِ گرامی جب سرِ آبِ رواں لکھوں

اک کیفِ سرمدی مری شام وسحر میں ہے — شہر نبیؐ ہے نورِ مجسم نظر میں ہے
وہ سن رہے ہیں جنبشِ لب کے بغیر بھی — میں کہہ رہا ہوں جو بھی مری چشمِ تر میں ہے
میں جا رہا ہوں جانب محبوب کردگار — میں کیا سفر میں ہوں کہ زمانہ سفر میں ہے

وہ رخِ زیبا ہے یا نورِ سحر آنکھوں میں ہے — ساقی کوثر کے جلوؤں کا اثر آنکھوں میں ہے
خواب میں دیکھا درِ اقدس سے نکلا ہے ابھی — نامہ لیکر آئے گا جو نامہ بر آنکھوں میں ہے
پھول برساتی ہوئی جیسے ستاروں کی روش — ان کی سبز آسماں کی رہگزر آنکھوں میں ہے

''محراب توحید'' تین سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل حمد ونعت کے گلہائے رنگ رنگ سے ترتیب دیا ہوا ایک ایسا گلدستۂ ارادت وعقیدت ہے جسے مصنف نے احتیاط واحترام کے تقاضوں

کوملحوظ رکھتے ہوئے پیش کیا ہے انہیں ان تمام نزاکتوں کا احساس ہے جو رب کائنات کے محبوبؐ گرامی کی عظمت و منزلت کا جزوِ لازم ہیں ان کی نعتیہ فکر جب شعر کے قالب میں ڈھلتی ہے تو وہ ہر اس سہارے سے کام لیتے ہیں جو ان کے شعور و آگہی کا تراشیدہ ہے اور تہذیب نفس کا نمائندہ۔ بہ ایں ہمہ ایک ایمان پرور خوف دامن گیر رہتا ہے جو ان کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں حُبِ رسولؐ کا پتہ دیتا ہے کہتے ہیں:

میں گدائے لفظ و معنی مگر آپ ہی کے در کا — مری نعت آپ سے ہے مجھے کیا پتہ ہنر کا

ہر گھڑی رہتا ہے الفاظ کی حُرمت کا خیال — نعت کہتے ہوئے ہم لوگ تو ڈر جاتے ہیں

دے ہنر کی بھیک ہُنر ورا کہ جمال فن مراکم نہو — میں تو آنسوؤں سے وضو کروں تری نعت پھر بھی رقم نہو

وہ لفظ دے جنہیں نسبت ترے حرم سے ہے — تو جانتا ہے مری آبرو قلم سے ہے

تو روبرو ہے تو اظہار مدعا کیسا — کہ میرا حال عیاں میری چشمِ نم سے ہے

''محراب توحید'' کی ایک سو ستر نعتیں بہت سے برسوں پر مشتمل شاعر کی فکر جمیل کا ماحصل ہیں جناب احمد ندیم قاسمی مرحوم اور قتیل شفائی مرحوم کی تقاریظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ چغتائی صاحب نے اپنے ان معاصرین شہیر سے بھی دادِ سخن پائی، خصوصاً قاسمی صاحب نے ''محراب توحید'' کے شاعر کو جس برجستہ و بے ساختہ انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے وہ ان کی ژرف نگاہی اور شاعر کی ندرت فکر کا بہترین ثبوت ہے۔ قاسمی صاحب لکھتے ہیں کہ ''میں نے جب انکا ایک شعر پڑھا تو کئی روز تک میں اس کی بلاغت اور بے کنار رسائیوں کے حسن کا اسیر رہا۔ وہ غیر فانی شعر یہ ہے:

میری بخشش کے دو وسیلے ہیں — ایک تُو اور دوسرا بھی تُو''

قتیل مرحوم کہتے ہیں کہ ''امین راحت چغتائی میرے ان احباب میں سے ہیں جنہوں نے تقریباً ایک ہی زمانے میں شعر کہنا شروع کیے'' چنانچہ چغتائی صاحب کی نظم و غزل میں معرفت کے ذکر کے بعد انہیں نعت گوئی پر باایں الفاظ ہدیۂ تحسین پیش کرتے ہیں:

''امین راحت چغتائی کا نعتیہ کلام پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک صاحب نظر نعت گو کے مقام سے نعت کہی ہے جس میں توحید و رسالت کی حدود کا مکمل ادراک ہے۔ بیشتر مضامین قرآن وحدیث کا بالواسطہ حوالہ رکھتے ہیں انہوں نے عصری تبدیلیوں کو بھی نعت کا موضوع بنایا ہے اور پورے جمالیاتی رچاؤ کے ساتھ حضور اکرمؐ کے حضور نذرانہ کلام پیش کیا ہے۔''

قتیل شفائی مرحوم کی اس رائے کا برملا ثبوت درج ذیل اشعار مہیا کرتے ہیں:

ان کو دیکھا ہے کہ تنویرِ سحر آنکھوں میں ہے — ایک حسنِ خواب کا ابتک اثر آنکھوں میں ہے
کہکشاں تھی یا کوئی گل پوش وادی زیرِ پا — جو مدینے لے گئی وہ رہگزر آنکھوں میں ہے
وہ جو قرآن بھی قرآن کا عرفان بھی ہیں — جز وِ ایمان بھی اور حاصلِ ایمان بھی ہیں
چشمِ نم لے کے چلے آئے ہیں ان کے در پر — یوں کوئی دیکھے تو ہم بے سروسامان بھی ہیں
عظمتیں ساری انہیں کے آستانے کے لیے — اب زمانہ ان کا ہے اور وہ زمانے کے لیے
ان کا پیغامِ عمل اک انقلابِ خیر تھا — ایک خوابیدہ زمانے کو جگانے کے لیے
وہ آقاؐ نور ایمان و یقیں ہے — کہ سیرت جس کی قرآنِ مبیں ہے
محمدؐ نام ہی دلکش بہت ہے — اُسے جس طرح بھی دیکھو حسیں ہے

جو حضرات ''محرابِ توحید'' کے مصنف کی نظم وغزل پر دسترس سے متعارف ہیں وہ ان کے اس مزاج و آہنگ کا جمال پرور عکس زیرِ نظر تصنیف کے اسلوب میں دیکھ سکتے ہیں جسے مزید شکوہ و تمکنت فارسی و عربی کے ذخیرۂ الفاظ سے ملی۔ یہ ذخیرہ مصنف کا علمی اثاثہ ہے وہ خود علوم دینی و دنیوی کے امتزاج و اتصال کا ایک سنگم ہیں اور حُبِ رسولؐ سے سرشاری کو شعری کیفیات میں سمودینے کے ہنر پر وہ پوری طرح قادر ہیں۔ چند مثالیں:

آسماں کیا ہے زمیں کیسی ہے، سب کچھ راز تھا — ان سے پہلے آدمی تو سازِ بے آواز تھا
اب تلک ہیں کھوج میں تحقیق میں سارے علوم — ان کے الفاظ و معانی میں جہانِ راز تھا

حاصلِ رنگ بھی تو نامۂ تخلیق بھی تو
پھول جب جب بھی کھلیں تیرا سراپا دیکھوں

تو ہی عنوانِ چمن تو ہی گلستانِ جمال
پھول مہکیں تو میں سمجھوں کہ تو آیا، دیکھوں

وہ بھی مقام آئے محبت کی راہ میں
خود سے کروں کلام تو تیری خبر ملے

تو سرِّ کائنات و مدارِ شعور نور
تجھ سے نظر ملے تو نویدِ سحر ملے

ہے خوفِ خطا طاری اور عالمِ بے ہوشی
اے شاہِ شرف پھیلا دامانِ خطا پوشی

اک ہم کہ محبت کا کوئی نہ چلن سیکھا
بخشی ترے قدموں نے ذروں کو ہم آغوشی

امین راحت چغتائی اپنی تصنیف تازہ کا آغاز جن حمدیہ نظموں سے کرتے ہیں ان میں سرِ آغاز بننے والی حمد کا مطلع ایک خاص کیفیت کا غماز ہے جسے تمام مجموعۂ کلام میں بین السطور محسوس کیا جا سکتا ہے۔

مرے لب پہ تیری ثناء رہی، تری عظمتوں کا بیاں رہا
میں جہاں رہا ترے ذکر میں تری رحمتوں کا سماں رہا

(اکتوبر۔دسمبر ۲۰۰۷ء)

جہانِ تخلیق کا شہاب

ڈاکٹر طاہر تونسوی

ڈاکٹر طاہر تونسوی نے جو خود بھی ایک معروف اہلِ قلم ہیں ایک ایسی ہستی پر قلم اٹھایا ہے جس کی فکری وفنی جہتوں کا احاطہ کرنا، تجربہ ومشاہدہ کی وسعتوں اور تنوعات پر کمند افگنی کرنا نیز ایک مخصوص تمدن ومعاشرت اور تہذیب وثقافت کی نمائندہ ونامور شخصیت کے خدوخال کو اجاگر کرنا ایک تحقیقی عمل ہی نہیں بلکہ ایک تخلیقی چیلنج بھی ہے۔ سید مسعود حسن شہاب دہلوی اپنی ذات میں ایک انجمن بھی تھے اور دبستان عصر بھی۔ ان کا عہد نگارش نصف صدی سے بھی متجاوز مدت پر محیط ہے جس میں ادبی صحافت نظریاتی سیاست اور شعری فصاحت نمایاں سنگ ہائے میل کی حیثیت رکھتے ہیں، ادب وسیاست کا سنگم ان کا محبوب جریدہ 'الہام' تھا جس کا آغاز عروس البلاد دہلی میں ۱۹۴۰ء میں ہوا اور ۱۹۹۰ء تک موسس ومدیر اور 'الہام' کے ''دیدۂ معنی نگراں'' کی حیثیت سے جناب شہاب حرف حرف اور سطر سطر کے خالق وامین بنے رہے بایں ہمہ:

'پیغامبری کردو پیمبر نتواں گفت'

قیام پاکستان کے بعد دہلی سے بہاولپور ہجرت کے دوران 'الہام' بھی رفیق سفر رہا اور اپنے نئے جغرافیائی سیاق وسباق میں بہاولپور کے ادب وصحافت کو نئی اقدار اور رجحان ساز نئے زاویہ ہائے فکرونظر سے ہمکنار کر گیا۔ یہی نہیں شہاب دہلوی نے اپنے وطن ثانی کی خدمت کا حق جس طرح ادا کیا اس کا نقشِ دوام شعروادب، تاریخ وثقافت اور بہاولپور کی تہذیب ومعاشرت پر ثبت ہو چکا ہے جس کا بین ثبوت ان کی تخلیقی وتحقیقی نگارشات ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب کے پیش لفظ میں مولف نے اس آرزو کا اظہار کیا ہے کہ شہاب مرحوم کو سرکاری اعزاز سے نوازا جانا چاہیئے تھا لیکن ہماری دانست میں ان کی شخصیت اور فکروفن ایسے تمام مقتضیات سے بے نیاز وماورا تھے ہر چند کہ اس ضمن میں سرکار کی جانب سے انھیں 'تمغۂ خدمت'

کے اعزاز سے نواز نے کا تکلف بھی کیا گیا تھا تاہم جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں ان کے حوالے سے جو تحقیقی کام ہوا ہے وہ نسل نوکوان کے تفویض کردہ ورثے کی تفہیم و تعمیم میں مددگار ثابت ہونا چاہیے ہماری خواہش تھی کہ ڈاکٹر مزمل بھٹی کا پی ایچ ڈی مقالہ بعنوان ''شہاب دہلوی ۔۔۔فن اور شخصیت'' ہمیں مطالعے کے لیے دستیاب ہوتا۔ مولف نے اپنے نصف درجن ایسے مضامین کو شریک اشاعت کیا ہے جو مقامی طور پر بعض اخبارات و رسائل میں شہاب دہلوی کی مختلف تخلیقات پر بطور تبصرہ شائع ہو چکے ہیں انہوں نے اپنے ممدوح کی نظم و نثر کی تخلیقات سے بھی انتخاب پیش کیا ہے اور مشاہیر ادب کی آراء کے بھی حوالے دیئے ہیں جو نہایت اہم ہیں خصوصا نظم و نثر کے بارے میں ڈاکٹر وفا راشدی اور شان الحق حقی (یہ حضرات بھی مرحومین ہو چکے ہیں) کے نقطہ ہائے نظر نہایت جامع اور برمحل ہیں ملاحظہ ہوں:

''شہاب صاحب کی شاعری ان کی زندگی سے پوری طرح ہم آہنگ ہے وہ میر کی طرح زندگی کو کرنے اور غالب کی مانند زندگی کو برتنے کا سلیقہ رکھتے تھے'' (ڈاکٹر وفا راشدی)

''ان کی نثر نگاری عبارت تھی میر امّن غالب، سر سیّد، خواجہ حسن نظامی، مرزا فرحت اللہ بیگ اور شاہد احمد دہلوی کی تحریروں سے۔ میں شہاب صاحب کو اسی زمرے میں خیال کرتا ہوں۔'' (شان الحق حقی)

اس میں شک نہیں کہ شہاب دہلوی کی نظم ہو یا نثر اس میں دلّی کی زبان کی رعنائی اور اردوئے معلّٰی، کی سطوت و عظمت نمایاں تھی غزل میں وہ کلاسیکی روایت کے امین بھی تھے اور اقدارِ نو کے نقیب بھی حضرت حیدر دہلوی سے شرف تلمذ حاصل تھا جنہیں 'دلی کی آبرو' سمجھا جاتا تھا اور 'خیام الہند' کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ ملاحظہ ہوں مولف کے انتخاب سے درج ذیل اشعار:

کتاب دل میں جہاں درد کا حوالہ ہے وہیں سے ملتی ہے کچھ روشنی محبت کی
آتشِ غم کا فضاؤں میں دھواں ہے اب تک سائے آلام کے تاحدِ نظر پھیلے ہیں

اپنے ایک مضمون میں مؤلف نے شہاب دہلوی کے مذہبی جذبات بالخصوص حُب رسولؐ پر

ارتکازِ فکر کیا ہے اس ضمن میں درج ذیل نعتیہ اشعار شاعر کی ادب طراز عقیدتوں کے مظہر نظر آتے ہیں۔

مسافرانِ رہ عشق کے لیے وہ ذاتؐ وفا کے دشت میں ہے میرِ کارواں کی طرح

غلام ہم بھی ہیں انؐ کے بلالؓ کی صورت ہمارے دل کی بھی ہیں دھڑکنیں اذاں کی طرح

حق تو کیا ہوتا ادا مدحِ رسالت کا شہاب نعت گوئی نے مری بخشش کا ساماں کر دیا

زیر تبصرہ کتاب میں جناب شہاب سے متعلق کوائف نامے میں ان کی ایک درجن سے زیادہ تالیفات وتصانیف مندرج ہیں جو ادب وشعر تاریخ وثقافت، سیاحت وسوانح اور تنقید وتحقیق کے موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں، ان کے علاوہ دو تراجم ''لطائف سیریہ'' اور ''تکملۂ، سیر الاولیاء'' بھی شامل ہیں جو صرف موضوعی مواد ہی نہیں بلکہ اپنے قارئین کو ایک وسیع فکری پس منظر مہیا کرنے پر بھی قادر ہیں۔ خطۂ بہاولپور کے لیے مرحوم کی خدمات کے پیش نظر اور خود سرزمین بہاولپور کی تاریخ وثقافت اور معارف ودانش کو مستقبل کی نسلوں سے متعارف کرانے کے لیے ضروری ہے کہ جامعہ اسلامیہ بہاولپور ''شہاب چیئر'' کا اہتمام کرے تاکہ ماضی کے چراغوں کی روشنی مستقبل کو منور کرتی رہے۔

کتاب ہٰذا کی اشاعت کا اہتمام چونکہ شہاب دہلوی اکیڈمی کی جانب سے کیا گیا ہے لہٰذا ہمیں توقع ہے کہ علمی کتب کی تدوین واشاعت علمی تسامحات سے قطعاً مبرا ہوگی۔ یہ احتیاط زیر نظر کتاب میں کماحقہ نہیں برتی گئی اور سالہا سال کی جگہ صرفی ونحوی اعتبار سے ''برس ہا برس'' جیسی غریب المعانی تراکیب متونِ کتاب میں در آئی ہیں جن سے اجتناب لازم تھا۔

(جنوری۔ مارچ ۲۰۰۸ء)

ہنر نازک ہے (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)

عزیز احسن

عزیز احسن ایک صاحبِ بصیرت اہل قلم ، وسیع المطالعہ نقاد اور محتاط و مودّب نعت گو شاعر ہیں۔ زیر نظر تصنیف ان کے تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے جو نعتیہ شاعری کی مختلف الجہت نزاکتوں، لطافتوں اور باریکیوں کا احاطہ کرتی ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مصنف نعتیہ شاعری میں نہ صرف حزم و احتیاط بلکہ صنفِ نعت کی تقدیس و تحریم کے پیش نظر ایمان و ایقان، ارادت و عقیدت اور اعلیٰ شعور و ادراک کے ساتھ شاعر کے لیے زبان و کلام کی لفظی و معنوی نزاکتوں پر مرتکز فکر و احساس کو لازمی قرار دیتے ہیں کہ:

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر　　　نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

غالب کے شعر سے ماخوذ ''عرض کیجیے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں'' کے زیر عنوان اپنے تحریر کردہ دیباچے میں ایک جگہ رقم طراز ہیں:

''نعت گو شعراء جو روحِ عصر سے اپنا رشتہ جوڑنے کے لیے حضور کی ثنا میں معروف ہیں ان کی ذمہ داریاں گوناں گوں بڑھ گئی ہیں وہ نعت کہہ کر نہ صرف الحاوی قوتوں کو للکار رہے ہیں بلکہ وہ نعت کے نام پر ہونے والی بے راہ روی کے سیلاب کے آگے بند باندھنے کے لیے بھی کوشاں ہیں۔''

عزیز احسن جہاں نعت گوئی کو فکر و نظر کی بعض جامع و مربوط شرائط سے مشروط ٹھہراتے ہیں وہیں وہ نعتیہ تنقید کے لیے بھی جو ایک واضح رجحان کے طور پر ماضی قریب میں منصۂ مشہود پر آیا ہے صنفِ نعت کی تحلیلِ نفسی کے لیے معیارات کا تعین بھی کرتے ہیں جن کا اظہار انہوں نے زیر تبصرہ کتاب میں ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے۔

''تنقیدِ نعت کا عمل عقیدے کی پختگی، رائے کی اصابت، عقیدے کے اعتدال، زبان کی فصاحت کے شعور، بیان کی لطافت کے ادراک اور سخن فہمی کا متقاضی ہے۔''

چنانچہ اپنی تازہ ترین تصنیف میں جوان کے آٹھ عدد تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے اور جو مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں عزیز احسن خود اپنے اشعار کو اپنے ہی معیارِ تنقید پر پرکھتے ہوئے اصلاح و ترمیم کی ضرورتوں کو احترامِ نبوتؐ کے تقاضوں کے پیشِ نظر واضح کرتے ہیں۔ ان کی نعت کا ایک مصرعہ کچھ یوں لکھا گیا کہ:

نعت کہنا ہی مرا مشغلہ بن جائے عزیزؔ

اس میں لفظ ''مشغلہ'' کی طرف جب ان کی توجہ دلائی گئی تو انہوں نے محسوس کیا کہ یہ لفظ تو تفریحی مقاصد کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو نعت کی تحریم و تقدیس کے منافی ہے چنانچہ انہوں نے ایک موزوں متبادل لفظ تلاش کیا اور ان کی نعت کا مقطع جس کے مصرعہ اول میں لفظ مشغلہ استعمال ہوا تھا ترمیم کے بعد علوئے معنویت سے ہمکنار ہو گیا۔

نعت کہنا ہی وظیفہ مرا بن جائے عزیزؔ ۔۔۔ جب لکھوں لذّتِ دیدار چشیدہ لکھوں

عزیز احسن کی اپنی نعت گوئی کا معیار اس لیے بھی ان کے تنقیدی معیار سے ہم آہنگ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حُبِ نبیؐ کی دولتِ لازوال سے سرفراز فرمایا ہے اور فکر و فن کے اوصاف بھی عطا فرمائے ہیں۔ زیرِ نظر تصنیف کے پہلے ہی مضمون میں انہوں نے ایک حمدیہ نظم کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے اور قمر جمیل کی اس نظم کو نہایت متوازن و مدلل تنقید کا سزاوار ٹھہرایا ہے فرماتے ہیں:

''قمر جمیل کی یہ نظم مذہبی روایت کی بازگشت، متصوفانہ شعری رویے کی گونج اور محکم نظامِ فکر سے انسلاک کے باوجود دینی شعریت کی بازآفرینی کی ایک اچھی مثال اور تجدیدِ متن کا بہتر نمونہ ہے۔''

مصنف کی دیگر تصانیف بھی جن میں ''اردو نعت اور جدید اسالیب (۱۹۹۸ء) تیرے ہی خواب میں رہنا (شعری مجموعہ ۲۰۰۰ء) اور ''کرم و نجات کا سلسلہ'' (مجموعہ نعت ۲۰۰۵ء) کے

علاوہ نصف درجن تالیفات بھی شامل ہیں۔ مصنف کی بحیثیت شاعر اور بحیثیت نقاد ژرف نگاہی کی مظہر ہیں اور شعروادب ہیں ان کے نظریاتی استحکام کی عکاس، عزیز احسن نے زیرِ تبصرہ تصنیف میں معروضی تنقید کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے انہوں نے نعت گوشعراء کی ایک بہت بڑی تعداد کو جو بزمرۂ متقدمین ومتوسطین اور متاخرین ہی نہیں بلکہ جن میں معروف وغیر معروف معاصرین بھی شریک ہیں ان کی نعت گوئی کے سیاق وسباق میں پرکھا ہے۔ مصنف کے ان ہی اوصاف کی نشاں دہی معاصر اہل علم نے بھی کی ہے جن میں دیگر کے علاوہ پروفیسر ابوالخیر کشفی، پروفیسر ڈاکٹر سید وحید اشرف اور پروفیسر ڈاکٹر اسلم فرخی شامل ہیں۔ ملاحظہ ہوں چند اقتباسات:

''عزیز احسن کا جدید اور قدیم ادب کا مطالعہ بہت وسیع ہے وہ مشرقی اصولِ تنقید سے بھی باخبر ہیں اور مغربی تنقید کے بھی رمز شناس ہیں۔'' (پروفیسر سید محمد ابوالخیر کشفی)

''عزیز احسن کا اردو نعتیہ شاعری کا مطالعہ وسیع بھی ہے گہرا بھی، وہ نعتیہ شاعری کے لیے زبان وبیان کے آداب سے بھی واقف ہیں اور شعری محاسن پر بھی نظر رکھتے ہیں اردو کی نعتیہ شاعری پر ان کا تحقیقی مطالعہ بھی ہے اس موضوع پر نقد ونظر کے اُصولوں سے بھی وہ بڑی حد تک واقف ہیں اور خود ایک خوش گو شاعر بھی ہیں'' (پروفیسر ڈاکٹر سید وحید اشرف)

''عزیز احسن ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جس نے متانت سنجیدگی، دیدہ وری اور فکری وفنی آگہی کی روشنی میں نعت رسولؐ کے ذخیرے، تاریخ اور جدید امکانات کا جائزہ لیا اور فکر وفن کے نئے تقاضوں کے تناظر میں نعت گوئی کا بحیثیت صنف محاکمہ کیا ہے۔'' (پروفیسر ڈاکٹر اسلم فرخی)

کثیر الاطراف فکری، نظری اور علمی صلاحتیں عزیز احسن کے اوصاف ہیں چنانچہ وہ اپنے گردوپیش سے بھرپور اثرات بھی قبول کرتے ہیں اور پورے انتقادی اخلاص وصداقت کے ساتھ دوٹوک اور برملا اظہار بھی کرتے ہیں چنانچہ ایسے ہی کردار جوان کی صداقتِ احساس سے متصادم ہوئے ان کا ہدفِ تنقید بنے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ وہ اپنے رقم کردہ دیباچے کے آغاز ہی

میں کہتے ہیں۔

''ہر بار یش گویا اپنے آپ کو نعت خواں کی بجائے نعت گو شاعر بھی منوانے پر مصر ہے اور بعض ٹی وی چینلز ایسے نعت خوانوں کو مسلسل متعارف کروا کے شہرت دے رہے ہیں میں ایسے نعت خوانوں کو تنقید کے قابل بھی نہیں سمجھتا۔''

(جنوری۔مارچ ۲۰۰۸ء)

کلیاتِ مکتوباتِ فارسی غالب

پرتو روہیلہ

غالب کے فارسی مکتوبات کے پانچ مجموعوں یعنی نامہ ہائے فارسی غالب باغ دور، آثر غالب، متفرقات غالب اور پنج آہنگ کے آہنگ پنجم پر مشتمل زیر نظر کلیات کے مترجم و مرتب حضرت پرتو روہیلہ کی ہمت و جانکاہی پر ہم حیران ہیں کہ وہ کام جو آج تک کسی سے نہ ہو سکا وہ انہوں نے اس طرح کر دکھایا کہ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی ''اپنے اس کام کی بدولت غالب کے ساتھ پرتو روہیلہ بھی ہمیشہ زندہ رہنے والوں کی صف میں شامل ہو گئے ہیں'' ترجمہ اس اعتبار سے ایک نہایت مشکل کام ہے کہ لفظ و معنی کی جہتوں کو تو احاطہ کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی تہہ میں جو مزاج و آہنگ کی کیفیات پوشیدہ ہوتی ہیں اور اُسلوب و تاثیر کے جو میخانے آباد ہوتے ہیں انھیں ایک سے دوسری زبان میں منتقل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں جوش نے بجا فرمایا کہ

لیلائے سخن کو آنکھ بھر کر دیکھو قاموس و لغات سے گزر کر دیکھو
الفاظ کے سر پر نہیں اڑتے معنیٰ الفاظ کے سینوں میں اتر کر دیکھو

چنانچہ فاضل مترجم نے ''واحد متکلم'' کے زیرعنوان اپنے تقریظی کلمات میں واضح کر دیا ہے کہ ''یہ ترجمہ اس بنیادی مفروضے پر مبنی ہے کہ اسے پڑھنے والا لازماً ایسا شخص ہو گا جو اردو کی بہت اچھی اور فارسی کی بھی کسی قدر علمیت ضرور رکھتا ہو گا۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ ہر لفظ اور ہر فقرے کا ترجمہ کرنا اصل متن کی روح کو زخمی کرنے کے مترادف تھا۔۔۔ اسی خیال کے تحت بہت سے فقروں اور القاب و آداب کے مروجہ الفاظ کو جوں کا توں رکھا گیا ہے ہم نے کلیات ہذا کے ممکن حد تک مطالعے کے بعد یہ محسوس کیا ہے کہ واقعی مترجم نے الفاظ کے سینوں میں اُترنے کی کوشش کی ہے جس سے اُن کی فارسی اور اردو دونوں زبانوں پر دسترس کا اندازہ ہوتا ہے ویسے بھی

یہ ضخیم و مبسوط دستاویز جو آٹھ سو سے بھی متجاوز صفحات پر محیط ہے۔ مترجم کے مزاجِ تحقیق کی بھی آئینہ دار ہے جس کا ثبوت مکتوب الیہم کے حالات زندگی سے ملتا ہے جو مستند مآخذ اور معتبر حوالوں کی تلاش و جستجو کے بعد مرتب کیے گئے ہیں یہ حالات کلیات کے صفحہ ۳۷۷ سے صفحہ ۴۲۲ تک قارئین کو ایسا مواد مہیا کرتے ہیں جس سے عصر غالب اور معاصرین غالب پر بھرپور روشنی پڑتی ہے پرتو روہیلہ کے شاہکار ادبی کارنامے کے اسی پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے مشفق خواجہ نے بجا طور پر انھیں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

> ''پرتو روہیلہ فارسی زبان پر ماہرانہ دسترس کے ساتھ ساتھ غالب کے مزاج داں بھی ہیں اسی لیے انہوں نے انشائے غالب کو منشائے غالب کے مطابق اس طرح اردو میں منتقل کیا ہے کہ ترجمہ پر تخلیق کا گمان ہوتا ہے۔''

پرتو صاحب نے مآخذ و حوالہ جات کی صحت پر خصوصی توجہ دی ہے جس نے ان کے کام کو مزید وقیع بنا دیا ہے انہوں نے ''نامہ ہائے فارسی غالب'' کے ترجمہ کے لیے سید اکبر علی ترمذی کے مرتبہ نسخہ پر انحصار کیا ہے جو پہلی بار نئی دہلی انڈیا سے ۱۹۶۹ء میں طبع ہوا ''باغ دودر'' کے مکتوبات کے سلسلہ میں انہوں نے اورینٹل کالج لاہور کے ۱۹۷۰ء میں طبع کے گئے اُس ایڈیشن کو پیش نظر رکھا ہے جو تحقیق نامے اور تعلیقات کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی کے صد سالہ جشن کے موقع پر مصنۂ شہود پر آیا۔ اسی طرح ''مآثر غالب'' کے خطوط کا ترجمہ قاضی عبدالودود کے نسخہ سے کیا گیا ''متفرقات غالب'' کے بارے میں انکا کہنا ہے کہ ان کے پیش نظر ۱۹۶۹ء میں لکھنؤ کے نظامی پریس سے دوسری بار طبع ہونے والا وہ ایڈیشن ہے جس میں سید مسعود حسن رضوی ادیب کا ایک طویل اور مبسوط مقدمہ بھی شامل ہے جب کہ آہنگ پنجم کے مکتوبات کا ترجمہ ''پنج آہنگ'' کے اُس ایڈیشن سے کیا گیا ہے جو مجلس یادگار غالب پنجاب یونیورسٹی نے ۱۹۹۹ء میں سید وزیر الحسن عابدی کی تدوین اور تصحیح و تحقیق کے ساتھ شائع کیا تھا۔

پرتو صاحب کے کام کا ایک اختصاص یہ بھی ہے کہ انہوں نے ترجمہ کے ساتھ فارسی متن کو

بھی کلیات میں شامل کیا ہے جس سے اس کی افادیت اور علمی وقعت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے مکتوبات غالب کے ان پانچوں مجموعوں میں مکتوب الیہم کی تعداد ۸۴ ہے اور مکتوبات کی تعداد ۳۴۱ مکتوب الیہم میں دیگر معاصرین غالب کے علاوہ جو اہم شخصیات ہیں ان میں صدرالدین خاں (صدرالصدور) شیخ امام بخش ناسخ ۔نواب مصطفیٰ خاں ۔مومن خاں مومن ۔منشی ہرگوپال تفتہ ۔میر مہدی اور پنڈت نول کشور نمایاں ہیں۔ فاضل مترجم نے ترجمہ کے معیار میں کہیں جھول نہیں آنے دیا جس کا اندازہ درج ذیل فارسی متن اور اُردو ترجمے سے کیا جا سکتا ہے جسے فاضل مرتب و مترجم نے ''غالب کی انشاء نگاری کا ایک دلکش نمونہ'' کے زیر عنوان کلیات میں شامل کیا ہے۔'' ملاحظہ ہو (فارسی)

کم از آنم که در معلوتم یاید زد پیش لزانی که دکجات تقصی مرا نداتم خامه آهنگ گزارش مدح اخلاق که دارد که درمیدانِ تحریر از نقطه هزار چاهشت دست برزمین می گزارد. قاعده بخود فرورفتگانِ شرمِ ناکسی سراز پشتِ پا برنداشتن است و آدابِ سایه دار پیش گاه سطوت خودراموجودنه پنداشتن. اعتماد کدامِ طاقت راسروبرگ ذریعۂ عرضسخن گردانم و به نیرونے چه نسبت جرأت فضولی گفتگو بهم و سانم. حقاکه اگر وسعت حوصلۂ کرم در ضمیر نه گرزشتے، عنان خود دلری بگسیختے واگراندیشه ب ه پشت گرمی امید عفوِ قوی دل نگشتے ، این چنین بے محابا خونِ لفظ و آبروے معنی نه ریختے

(ترجمہ) میری حیثیت اتنی بھی نہیں کہ میرے لیے معذرت کا دروازہ کھٹکھٹایا جائے (لیکن) تو اس سے بلند ہے کہ مجھے میری تقصیر پر شرمندہ کرے۔ میں نہیں سمجھتا کہ (میرا) قلم کس کے اخلاق کی تعریف کی گزارش کا ارادہ رکھتا ہے کہ میدان تحریر میں ہزار جگہ نقطے کے ذریعے عجز کا اظہار کر رہا ہے۔ بے بضاعتی کی شرم میں غرق ہو جانے والوں کا قاعدہ تو

یہ ہے کہ اپنی گردن جھکائے رکھیں اور سائے کے لیے آفتاب کی شوکت کی پیش گاہ میں یہی ادب ہے کہ اپنے وجود کو ناموجود جانے کون سی طاقت کے اعتماد کو ذریعہ عرض سخن کا ساز و سامان سمجھوں اور کس تعلق کے زور پر اس ہرزہ سرائی کی جرأت کروں۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر (تیرے) کرم کے حوصلے کی وسعت میرے ضمیر میں جاگزیں نہ ہوتی (تو میں کب کا) ہوش و حواس کی باگ توڑ چکا ہوتا اور اگر (میری) فکر کو تیرے درگزر کی امید سے ڈھارس نہ ہوتی تو (میں ہرگز) اس طرح الفاظ کا خون اور معانی کی آبروریزی نہ کرتا۔"

ترجمے کا متن صرف یہ ہی نہیں کہ وہ رواں اور شستہ ہو بلکہ بین السطور اُن مفاہیم و تاثرات کا بھی حامل ہو جو اصل متن میں ماورائے الفاظ لہجہ و اُسلوب کے توسط سے مترشح ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ترجمہ کو تخلیق سے زیادہ کار دشوار قرار دیا جاتا ہے۔ جس کا احساس مترجم کو تھا اور اس منفرد و دقیق کام کی تکمیل میں پرتو روہیلہ کو اسی سبب ایک عشرے سے بھی زیادہ وقت صرف کرنا پڑا لیکن اس کام نے انھیں اُمر بنا دیا ہے کتاب کے ناشر کا ان کی نسبت یہ خراج تحسین کہ "یہ کارنامہ انجام دے کر انھوں نے کم از کم پانچ غفلت زدہ و خوابیدہ نسلوں کا قرض چکا دیا" نہایت درست و برمحل ہے جب کہ زیرِ نظر کلیات کے انتساب الیہ ڈاکٹر جمیل جالبی کا یہ تاثر بھی نہایت حقیقت افروز ہے کہ

"فارسی مکاتیب کے اس دلکش اور سحر انگیز اردو ترجمے نے ادب عالیہ کا بند دروازہ کھول دیا ہے جو ڈیڑھ سو سال سے تشنگان ادب پر بالعموم اور اردو والوں پر بالخصوص مقفل پڑا تھا۔

(اپریل۔ جون ۲۰۰۸ء)

گرہ نیم باز (شعری مجموعہ)

مرتضٰی برلاس

مرتضٰی برلاس معروف شاعر اور معتوب افسر رہے ہیں۔ معتوب اس لیے کہ ان کی شاعری کا تند و تلخ آہنگ اور منافقت گریز اُسلوب سرکار و دربار کے آداب سے متصادم اور مزاج شاہی پر ہمیشہ گراں گزارا۔ گرفت میں اس لیے نہ آسکے کہ ''طنز و کنایہ اور رمز و اشارہ'' کا ہنر خوب جانتے ہیں۔ ڈویژنل کمشنر کے منصب تک تو پہنچے لیکن وہ پذیرائی جوان کے دل و دماغ کی صلاحیتوں کا حق تھا میسر نہ آسکی جس کا انھیں نہ کبھی گلہ ہوا نہ افسوس۔

حرفِ بے باک سے بے ساختہ پن سے اپنے　　　ہم نے دی جرأت اظہار، سخن سے اپنے
ٹوٹے بے شک مگر جھکے نہ کہیں　　　ہوں گے ہم سے بھی سر پھرے نہ کہیں

''گرہِ نیم باز'' ان کا تازہ شعری مجموعہ ہے جس کے پیش رو ''تیشۂ کرب'' (غزلیں) ''ارتعاش'' (نظمیں، غزلیں) اور ''اضطرار'' (غزلیں) ایک ہی طرزِ سخن کے غماز ہیں اور یہی مرتضٰی برلاس کی شناخت ہے۔

کبھی مقطع نہ کہا اور نہ تخلص رکھا　　　اپنی پہچان ہے اُسلوب سخن سے اپنے
لوگوں کا ہے جو مشغلۂ جامِ انبساط　　　میرے لیے وہ شاعری خوں کی کشید ہے

فیض صاحب نے برلاس کی شاعری پر ایک مختصر اور جامع تبصرے میں کہا تھا کہ ''مجھے امید ہے کے مرتضٰی برلاس کا یہ کہنا سچ ہو کر رہے گا۔''

باتوں کا رس جو کان سے پہنچا زبان پر　　　کہرام مچ گیا مرے طرزِ بیان پر

چنانچہ ''گرہ نیم باز'' کے مطالعہ سے یہی تاثر ملتا ہے کہ شاعر نے اپنے طرز بیان کو نئی وسعتوں اور منفرد رفعتوں سے ہمکنار کیا ہے وہ اپنے نقطہ نظر کے اظہار میں بے باک اور لہجہ و

اسلوب کی تلخی و جارحیت پر مصر نظر آتے ہیں شعر ان کے نزدیک ابلاغ کا ایک ایسا ذریعہ ہے جس کی کاٹ تلوار سے زیادہ اور تاثیر نیزے کی اَنی بن کر دل میں اترنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اُن کے شعری رویوں میں انانیت ہرگز نہیں لیکن خودداری و خوشناسی کا عنصر غالب نظر آتا ہے وہ شعر کو اپنے فن کا مظہر بنانے کے لیے پوری جگرکاوی سے کام لیتے ہیں اُنھیں 'تحسینِ ناشناس' اور 'سکوتِ سخن شناس' کا بھی پورا پورا ادراک ہے۔

نقادِ فن سے دادِ سخن چاہے مل نہ پائے ✧ تحسینِ ناشناسِ سخن سے خدا بچائے

مرتضیٰ برلاس بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن وہ غزل کو "تنگ نائے" نہیں سمجھتے اور تجربہ و مشاہدہ کی تلخ و شریں حقیقتوں کو شعری قالب میں ڈھالنے پر پوری طرح قادر ہیں انھوں نے شعری روایتوں کو نئے زاویوں اور نئے امکانات و موضوعات سے ہمکنار کر کے شعر کے فنی ارتقاء کو مہمیز لگانے کا اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ ان کی تنقید میں شدت اور تجزیے میں معروضیت نہایت واضح اور برملا ہے۔ بے خوفی و بے باکی ہے۔ لیکن تہذیب و شائستگی کے تابع وہ ایک دانشور کی حیثیت سے ملکی و بین الاقوامی امور کا نہ صرف واضح شعور رکھتے ہیں بلکہ اُس کے موثر ابلاغ پر قادر بھی ہیں برلاس کی شاعری انتقادی جہتوں کے ساتھ ساتھ فنی نزاکتوں سے بھی مرصع ہے۔ ملاحظہ ہو

سازشوں کی چنگاری بال و پر میں لے آئے ✧ کیوں پرائے گھر کی آگ اپنے گھر میں لے آئے
رسن و طوق و سلاسل وہی سب آپ کے ہیں ✧ پہلے ہم غیر کے مفتوح تھے اب آپ کے ہیں
ساقی گری کا فرض ادا کر دیا گیا ✧ پانی کا گھونٹ زہر ملا کر دیا گیا

اور اب خود احتسابی کا انداز بھی دیکھیے

جو دشمن جاں ہم کو منانے میں لگے ہیں ✧ اُن لوگوں کے ہم ناز اٹھانے میں لگے ہیں
گردن ہے کہ اب تن سے جدا ہونے لگی ہے ✧ اور ہم ہیں کہ دستار بچانے میں لگے ہیں
وہ لوگ جو محروم سماعت ہیں انہیں کو ✧ ہم قصۂ غم اپنا سنانے میں لگے ہیں

یہ تو ہے مرتضٰی برلاس کا مرغوب اسلوب نگارش اور پیش و پس کے حالات و واقعات پر بغیر کسی پس و پیش کے برملا ردِعمل لیکن اس سے یہ تاثر لینا درست نہ ہوگا کہ وہ غزل و غنائیت کی شاعری سے نفور ہیں یا نا آشنا۔ وہ صاحب مطالعہ بھی ہیں اور شعر میں حُسنِ روایت اور روایت حسن کے امین بھی۔ ذرا دیکھیے تو

نشۂ قرب یار سا کچھ ہے
یہ جواب تک خمار سا کچھ ہے

دل کے جو آر پار سا کچھ ہے
یہ کہیں تیر تو نظر کا نہیں

کیوں یہ پھر انتظار سا کچھ ہے
روٹھنے والے خود نہیں آتے

کہ اب تک وہیں وقت ٹھہرا ہوا ہے
قیامت تھا تیرے بچھڑنے کا لمحہ

زندگی میں یہی کمائی کی
شاعری، عشق اور رسوائی

کوئی صورت نہیں رہائی کی
ہم اسیر کمند شائستہ

نغمے کا سارا سوزِ دروں زیر و بم میں ہے
ہے زندگی میں حسن نشیب و فراز سے

''گرہِ نیم باز'' کا شاعر بھی اور بہت سوں کی طرح مغلوب الغالب ہے اس لیے نہیں کہ یہ ایک روایت بن گئی ہے بلکہ اس لیے کہ خوشہ چینی میں بھی تخلیق و اختراع کے نئے زاویے تلاش کیے جا سکتے ہیں برلاس کو مطالعہ کرنے سے اُس کی ذہنی و فکری توانائی کا احساس ہوتا ہے جس کا ثبوت اس نے غالب کا تتبع کر کے اور اپنی تخلیقی انفرادیت قائم کر کے مہیا کیا ہے غالب کی ''غنچۂ ناشگفتہ'' والی غزل کو اپنے نگار خانہ تخلیق میں اس طرح سجایا ہے کہ وہ ''گُل شگفتہ'' بن گئی ہے اب یہ صاحبانِ شعر ہی جانتے ہیں کہ ایک مشکل ردیف میں شعر کہنا اور وہ بھی کسی مسلم الثبوت استاد کی زمین میں یا تو شرمساری ہے یا گُل کاری ملاحظہ ہو برلاس کی گل کاری:

مانا کہ مصلحت تھی کچھ تم نے اگر کہا کہ یوں
وقت کریگا فیصلہ یوں تھا درست یا کہ یوں

اپنی خطا ہے بس یہی ہم نے منافقت نہ کی
جو بھی ہمارے دل میں تھا کہہ دیا برملا کہ یوں

میں نے کہا کہ بن ترے کیسے کٹے گی زندگی
جلتے ہوئے چراغ کو اُس نے بجھا دیا کہ یوں

زیرِ نظر مجموعے میں ایک ایسا شعر بھی نظر سے گزرا جس نے چند ساعتوں کے لیے احتسابی کیفیت سے دو چار کر دیا اور دروں بینی کے اصل عمل نے باور کرادیا کہ مرتضٰی برلاس حُب وطن کے جذبۂ لازوال سے سرشار ہے وہ صرف جبر وستم کے نظام پر معترض ہی نہیں بلکہ نعمتوں کا معترف بھی ہے اُس کی شاعری حرف احتجاج ہی نہیں بلکہ اپنی مٹی سے محبت کرنے کی احتیاج پر بھی مرکوز ہے ملاحظہ ہو

جس کی نسبت سے تمہیں دنیا میں پہچانا گیا تم ذرا سوچو کہ تم نے اُس زمیں کو کیا دیا

اسی سیاق وسباق کا ایک اور شعر

سوچ، ملبوس، عمل، سب پہ ہیں اغیار کے رنگ اب ہماری یہاں پہچان نہیں ہے کوئی

اضطرار و بیقراری کی کیفیات برلاس کے دل و دماغ کو جھنجوڑ کر رکھ دیتی ہیں جب اجتماعی مفاد سے متصادم اور وطن دشمن رویے نظر آتے ہیں۔ وہ عالمِ بے تابی میں پکار اُٹھتا ہے

یارو ازالۂ ستم و جور کچھ کرو گر جینا چاہتے ہو تو فی الفور کچھ کرو
اتنا ہی خوف تم کو جو رسوائیوں کا ہے پھر عاشقی کا دم نہ بھرو اور کچھ کرو
دیکھو قلم ہے پاس تمہارے زبان بھی لب بستگی کا ہے یہ نہیں دور کچھ کرو

(اپریل۔ جون۔ ۲۰۰۸ء)

دیوان محشر (شعری مجموعہ)

مرزا اصلاح الدین احمد محشر

حسنِ سیرت وحسنِ صورت کا مرقع۔ شرافت ونجابت کا پیکر۔ تہذیب وشائستگی کا سراپا۔ اسلاف کی عظمتوں کا امین اور شعروادب کی محفلوں کا صدر نشین یہ تھا وہ شخص جس سے میں پہلی بار بھاولنگر میں ۱۹۵۶ء یا غالباً ۱۹۵۷ء میں ملا۔ یوں لگا گویا تمدن ومعاشرت کا ایک پورا عہد نظر کے سامنے آ گیا۔ تقریب ملاقات ایک محفل مشاعرہ تھی جس کا اہتمام محشر صاحب نے خود کیا تھا وہ وہاں افسر خزانہ کے منصب پر فائز تھے خوش قسمتی سے ہم چند افراد کو جو بہاولپور سے مدعو کیے گئے تھے ان کی میزبانی کا شرف بھی حاصل ہوا۔ یہ میزبانی کیا تھی ان کی وضعداری کا نقش ہمارے دلوں پر ثبت ہو گیا اور کیوں نہ ہوتا کہ وہ ریاست لوہارو کے شہ نشینوں میں سے تھے حکمرانی کے باوجود خاکساری سرشت میں تھی۔ مشاعرہ میں جو غزل پڑھی وہ خود ان کا تمدنی تعارف تھی کلام میں داغ اور تلامذۂ داغ کا اُسلوب، زبان وبیان کی چاشنی اور محاورہ روزمرہ کا برجستہ استعمال اُن کے کلاسیکی اندازِ فکر کا غماز تھا۔ سادگی وسلاست اور روانی وبے ساختگی کا وہ عالم کہ اُزدل خیزد بردل ریزد

زیرِ نظر شعری مجموعہ نواب صلاح الدین محشر مرحوم کی صاحبزادی محترمہ اُنیسہ بانو کی اپنے والد سے بیکراں محبت کی یادگار ہے انھیں کے توسط سے آخری بار اسلام آباد میں مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ ان کے رشتے کے بھانجے پروفیسر سید محمد عارف نے جو ایک صاحب بصیرت نقاد ہیں اور ادب کے استاد کتاب پر نہایت جامع مقدمہ تحریر کیا ہے جو مرحوم کے فکر وفن اور پُر جہت شخصیت پر معلومات کا ایک گنجینہ ہے تقریظ نگار کے مطابق محشر صاحب کو نواب مرزا داغ کے ممتاز ترین تلامذہ حضرت سائل وبیخود کے علاوہ اختر عزیز جے پوری۔ اطہر باپوڑی اور رعنا رسول پوری سے شرفِ استفادہ حاصل تھا تاہم زیرِ نظر مجموعہ کا انتساب سائل دہلوی سے کیا گیا ہے جو داغ کے

داماد اور خود جناب محشر کے رشتے میں دادا تھے۔ دیوانِ محشر کا آغاز جو دو سو سے زیادہ غزلوں پر مشتمل ہے حمد کے اس شعر سے ہوتا ہے۔

ہر زباں پر ہے اگر وصف تو مولا تیرا　　ہر جبیں کا ہے مقدر تو ہے سجدہ تیرا

اور جہاں تک رنگِ غزل کا تعلق ہے وہ متنوع کیفیات اور روایت شعری کے مختلف النوع اسالیب کی مظہر ہے مثلاً اک انداز یہ بھی ہے کہ

ملی نہ چشم حقیقت نگر زمانے کو　　سمجھ رہا ہے تماشا مرے فسانے کو
کوئی یہ غنچوں سے گلشن میں جاکے کہہ آئے　　زمانہ جرم سمجھتا ہے مسکرانے کو
مجھ سے چلتی ہوئی تلوار نے کیا بات کہی　　جنبش ابروئے خم دار نے کیا بات کہی
ایک بجلی سی تو گرتی ہوئی آئی تھی نظر　　کیا بتائیں نگہٗ یار نے کیا بات کی
شبِ دراز نہیں عرصۂ قلیل کوئی　　سنائے جایئے افسانۂ طویل کوئی
سبھی مقام ہیں محشر مری نگاہوں میں　　نواحِ طور کوئی گلشنِ خلیل کوئی

'نواح طور' اور 'گلشن خلیل' سے ماورا بھی فکر شاعر کمند افگنی کرتی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ حسنِ کلام جگہ جگہ دامن کشِ دل نظر آتا ہے جسے شاعر کی زبان پر قدرت اور بھی بلیغ و صبیح بنا دیتی ہے۔

فاصلہ اتنا نہیں مجھ سے رخ یار ترا　　نام ہے میری نگاہوں کا ہی دیدار ترا
ویسے تنہائی تو کہنے کو ہے تنہائی مری　　ایسی تنہائی تو ہے لمحۂ دیدار ترا
بارِ نظر سے پھول کے عارض ہیں شبنمی　　اے ذوقِ دید ایسی نزاکت کا کیا علاج
پست ہمت نہو فریاد کا انداز بدل　　نغمہ سنجانِ چمن کی طرح سینے کو اُبھار
تیرے جلووں کی نہ وسعت نہ نگاہوں کی حدیں　　دھڑکنوں کی بھی مرے دل کی نہ گنتی نہ شمار
بحرِ امید و بیم ہے یہ قلزم جنوں　　طوفاں عجب عجب ہیں کنارے نئے نئے

ہماری اردو شاعری کا عظیم سرمایہ کلاسیکی روایات پر مشتمل ہے یہ درست ہے کہ فکری ارتقا نے اردو غزل کو موضوعی وسعت عطا کی اسے اسالیب کی ندرت اور محاسنِ شعری نے آفاقیت اور

مقبولیت سے ہمکنار کر دیا استعارہ وتشبیہ کے وسیع استعمال اور قافیہ وردیف میں جدّت طرازی کے رجحان نے غزل کو نئی رفعتوں تک پہنچا دیا لیکن جہاں خارجی عوامل کی اثر پذیری غزل کے مزاج و آہنگ میں نو بہ نو پہلو تراشتی گئی وہیں غزل کی باطنی ساخت نے بھی مفہوم و معانی کے توسیعِ عمل کو سرد نہیں پڑنے دیا۔ تاہم ان تمام میلانات اور امکانات کو بنیاد شعر کے کلاسیکی نظام نے فراہم کی۔ مرزا اصلاح الدین محشر اُسی کلاسیکی نظام کا ایک ستون ہیں اور ان کی غزل اس حقیقت کا ایک واضح ثبوت

منشا جو زمانے کی ہے وہ جان گئے ہیں ہم وقت کی رفتار کو پہچان گئے ہیں
اس جنبش ابرو کے فسوں مان گئے ہیں لاکھوں اسی انداز پہ قربان گئے ہیں
منجدھار بھی بے جان ہے بے کیف ہیں موجیں ساحل کی خبر لینے کو طوفان گئے ہیں
چرچا جفائے یار کا کیوں چار سو کریں بلبل نہیں کہ صبح و مسا ہاؤ ہو کریں
آداب گلستاں کا تقاضا ہے اے جنوں کھل کر نہ پھول پھول سے کیوں گفتگو کریں
پھولوں کی طرح کرتے ہیں دامن کو تار تار ہم وہ نہیں کہ چاک گریباں رفو کریں
دیکھے ترا جمال یہ تاب بشر نہیں تو ہر جگہ ہے اور کہیں جلوہ گر نہیں
بیتا بیوں پہ صرف ہے جینے کا انحصار یعنی سکونِ قلب سرشتِ بشر نہیں
اقرارِ وصل میں وہ کہاں دل فریبیاں کہنا ادھر اُدھر ترا کچھ دیکھ کر ''نہیں''

درج بالا آخری شعر میں ردیف ''نہیں'' کا مخصوص استعمال محشر صاحب کے مکتب شاعری کی طرف اشارہ کر رہا ہے جس کے سرخیل داغ تھے اور جسے حسن وعشق کی جولانگاہ میں ہجر و وصال کی کیفیات کی ترجمانی پر سائل و بیخود جیسے قادر الکلام شعراء نے قدرت بخشی چنانچہ اسی اُسلوب سخن کے اتباع کی مثالیں دیوانِ محشر میں جا بجا ملتی ہیں۔ مثلاً ''ہاں'' کے لفظ کو شاعر نے کس خوب صورتی سے ندرتِ معنی کے زیور سے آراستہ کیا ہے درج ذیل شعر میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ان کو مری حیات کا کتنا خیال ہے یہ خوف ہے کہ دم نہ نکل جائے ''ہاں'' کے ساتھ

مکتب داغ کے ایسے ہی اسلوب اور بھی جگہ جگہ دیکھے جاسکتے ہیں:

دیکھو ہر وقت ضد نہیں اچھی — کبھی کہنا بھی مان لیتے ہیں
مجھے بتا تو سہی دردِ بیکراں کی قسم — صدائے آہ سے اب اختصار کیا ہوگا
آہ کے ٹکڑے بنیں اور لبوں تک رہ جائیں — یہ بھی انداز ترا عرضِ تمنا دیکھا
کھائے جاتے ہیں دل زار کو ارمان بہت — خود تو یہ اتنا سا ہے اور ہیں مہمان بہت

یہی نہیں کلام محشر میں مے و میخانہ اور جام و سبو کا ذکر بھی پوری لغزش مستانہ کے ساتھ ملتا ہے ان کا اسلوب برجستہ و بے ساختہ ہے اور قدح خواری کے جملہ لوازمات کے ساتھ:

جھومتی آئی نظر ساری خدائی محشر — ساغرِ مے کو ابھی منہ سے لگایا بھی نہ تھا
آج میخانے کا یہ رنگ بدلتے دیکھا — رقص میں جام تو صہبا کو اُچھلتے دیکھا
سرورِ جاودانی گر تری آنکھیں پلا دیتیں — نہ شکوہ ظرف کا ہوتا نہ رونا جام کا ہوتا
مرے ساقی کا مسلک امتحانِ ظرف ہے شاید — اِدھر گردش سے میں نکلا اُدھر گردش میں جام آیا
ساقی کی چشمِ مست کو ساغر سمجھ لیا — بہکا دیا نظر نے مئے ناب کی طرح
آج ساقی نہیں پیمانہ بہ پیمانہ نہیں — یا ترا رند نہیں یا ترا میخانہ نہیں
تیرا ہر دیدۂ بدمست ہے جانِ میکش — کونسا ان میں چھلکتا ہوا پیمانہ نہیں
جامِ لبریز کو رہنے دے یونہی پی لونگا — تیری آنکھوں سے زیادہ مجھے پیمانہ نہیں

کلام محشر میں جو کسک چبھن اور شکست و کرب کا ایک برملا احساس کہیں چنگاری اور کہیں شعلۂ جوالہ بنتا نظر آتا ہے اُس کے پس منظر میں محشر صاحب کا غریب الوطنی کا اذیت ناک تجزیہ کارفرما ہے جس نے ان کی روح کو آشفتہ اور مزاج کو مضمحل کردیا۔ ایک مفتخر بذات زندگی سے محرومی اور مسائل گزیدہ حالات کی بے رحمی کے سپرد ہو جانے پر اُن کی شاعری نے جو روپ دھارا اس کا اندازہ ان اشعار سے کیا جاسکتا ہے۔

آ کے دیکھے تو کوئی گردشِ دوراں بن کر — کیا اُجڑا مرا گھر رشکِ گلستاں بن کر

ہائے اُس گھر کا فسانہ سنے ہم سے کوئی صاحب خانہ جہاں جاتا ہو مہمان بن کر
نہ پھول ہیں نہ چمن ہے نہ آشیانہ ہے مری تباہی کا محشر کائی ٹھکانا ہے
مرے کریم بہت خوار ہو چکا ہوں یہاں بتا بتا مجھے عزت سے کب اُٹھانا ہے

''ہدیہ تشکر'' کے زیرعنوان مرحوم کی صاحبزادی اُنسیہ بیگم لکھتی ہیں کہ ''والد محترم کی زندگی میں کئی بار یہ دیوان تیار کیا گیا تاہم چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر اشاعت کے مرحلے تک نہ پہنچ پایا۔ اس بارے میں مشفق و محترم دادا جناب جمیل الدین عالی کے پرزور اصرار پر میں نے اپنے ناتواں کندھوں پر یہ ذمہ داری اٹھانے کی جسارت کی، 'دیوان محشر' کی تیاری کے ہر موقع پر مجھے جناب جمیل الدین عالی کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ میں تہہ دل سے انکا شکریہ ادا کرتی ہوں۔''

صاحبزادی اُنسیہ بانو کے اس اظہار تشکر کے بعد اولاً تو ہمیں یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ عالی صاحب نے اپنے خاندان کے چشم و چراغ اور بزرگوں کی شعری روایات کے امین حضرت محشر کے زندگی بھر کے اندوختہ شعری پر ایک حرفِ تفریظ تک لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اگر مرحوم کے بھانجے ڈاکٹر عارف بھی کچھ نہ لکھتے تو یہ ایک سانحہ ہوتا کہ لوہارو کے اُس عظیم المرتبت خاندان میں جس سے مرزا اسداللہ غالب جیسی شخصیت کو شرف نسبت و تعلق حاصل تھا ایک فرد بھی ایسا نہ تھا کہ دیوان محشر کو اہل ادب سے متعارف کرا سکتا۔ کاش عالی صاحب صرف ایک دن کا منفعت بخش اخباری کالم نہ لکھ کر چند سطور محشر صاحب کی شعر گوئی پر سپرد قلم کر دیتے تو یہ اخلاقی قرض جو اُن پر باقی رہ گیا ادا ہو جاتا۔ آخر میں جناب محشر کے اس شعر پر اختتام کلام

داستاں درد کی پُرکیف تھی میری شاید سو گئے آپ ہی افسانہ سنانے والے

(اپریل۔ جون ۲۰۰۸ء)

پاکستان میں تدریس اردو

ڈاکٹر شاہد اقبال کامران

معلّم، محقق اور اقبال شناس کی حیثیت سے اُردو زبان و ادب کے اُفق پر گزشتہ چند برسوں میں طلوع ہونے والا نام۔۔ڈاکٹر شاہد اقبال کامران۔۔اب ایک ایسا معنوی استعارہ بن چکا ہے جس کی علمی بصیرت اور انتقادی معروضیت تیزی سے اہلِ دانش کی توجہ حاصل کر رہی ہے۔ زیرِ نظر تصنیف پاکستان میں تدریس اُردو کے حوالے سے اُن کے نقد و نظر کا ایسا شاہکار ہے جو ہمارے نظام و نصاب تعلم کی جملہ جہتوں کا احاطہ بھی کرتا ہے اور قومی مقتضیات کی نشاندہی بھی۔ پہلی جماعت سے اعلیٰ ثانوی سطح تک مروّجہ درسی کتب کا یہ تجزیاتی مطالعہ صغیر سنی کی سطح سے بتدریج نشوونما پانیوالے طلباء و طالبات کی انفرادی و اجتماعی نفسیات پر ایک فکر انگیز محاکمہ کی حیثیت رکھتا ہے اور قومی و صوبائی سطح پر نصاب سازی کے عمل کو رہنما خطوط مہیا کرتا ہے۔ فاضل مصنف نے پوری ژرف نگاہی کے ساتھ اپنے موضوع کے خفیف ترین نکات پر بھی توجہ مرکوز کی ہے اور پوری جامعیت کے ساتھ ایسی تجاویز دی ہیں جو قومی شعور کی تربیت و پرورش اور اُردو کے ذریعے ایک کثیر اللسانی معاشرہ کو مستحکم تشخص عطا کرنے میں مددگار ثابت ہوسکتی ہیں۔ ’حرفِ آغاز‘‘ کے زیرِ عنوان صاحب تصنیف رقمطراز ہیں:

’’اُردو پاکستان کی قومی زبان ہے۔ برصغیر میں ملی تشخص اور اُردو زبان کے ارتقاء کی تاریخ ایک ہے۔ اردو ایک زبان سے بڑھ کر ہمارے لیے تہذیب اور ثقافت کا درجہ بھی رکھتی ہے۔ پاکستان کی دیگر زبانوں کے ساتھ اُردو کی لغوی اور لسانی مماثلتیں اس کی ثروت خیزی میں اضافہ کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو پاکستان میں قومی رابطے کا بہترین ذریعہ خیال کی جاتی ہے۔ پاکستان کے لیے اُردو کی نظریاتی، سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی اہمیت یہ باور کراتی ہے کہ اس زبان کی نصاب سازی اور اس زبان کی تدریس کا عمل دیگر مضامین کی نسبت زیادہ حساس معاملہ ہے۔‘‘

چنانچہ معاملے کی حساس نوعیت کے پیش نظر ڈاکٹر کامران اپنی کتاب کا اختصار یہ درج ذیل جن سوالات کے ذریعے ترتیب دیتے ہیں وہ ان کی معلمانہ بصیرت و دانش کے مظہر ہیں:

- ☆ کیا ہمارے اُردو نصابات اور درسیات مختلف درجات کے طلباء کی نفسیات اور ضروریات سے ہم آہنگ ہیں؟
- ☆ سماجی ضروریات اور عصری تقاضوں سے مطابقت رکھتے ہیں، اور یہ کہ علمی زندگی میں ان کی افادیت کیا ہے۔؟
- ☆ کیا مختلف درجات میں زبان و ادب کے مطالعات میں تدریج اور ارتقاء کے اصول کو پیش نظر رکھا جاتا ہے؟
- ☆ کیا ہمارے ہاں ابتدائی سطح پر اردو زبان کو مقامی زبانوں سے ہم آہنگ کر کے پڑھانے کی کوشش کی گی ہے اور کیا ہمارے مطالعات ادب مستقبل کے امکانات کے ساتھ وابستہ ہیں؟
- ☆ ہمارے نصاب ساز تاریخی و تدریجی مطالعات کو اہمیت دیتے ہیں یا حال کے ادبی رجحانات اہم خیال کیے جاتے ہیں۔؟
- ☆ مختلف درجات میں نظم و نثر کا انتخاب کرتے وقت کیا اصول ہمارے سامنے ہوتے ہیں؟
- ☆ کیا ہمارے منتخباتِ ادب مطالعہ زبان و ادب کو زندگی کا معاون بناتے ہیں؟
- ☆ کیا وہ طلباء کے ذوق کی تہذیب اور زندگی کی ارفع اقدار کو نمایاں کرتے ہیں؟

ان پُر معز سوالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ نونہالانِ قوم کی جدید تقاضوں سے ہم آہنگ تعلیم اور قومی اقدار اُردو روایات سے مرصع تربیت مصنف کی ترجیحات میں سرفہرست ہے جس کا دقیق و وسیع جائزہ انہوں نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے بعنوان ''پاکستان میں اُردو زبان و ادب کی درسیات و نصابات کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ'' میں لیا ہے۔ اور غالباً اسی سبب زیر نظر تصنیف کے

مباحث کا تعلق ۲۰۰۳ء سے پہلے کے چند برسوں سے ہے تاہم مروجہ درسی کتب میں تاحال ایسی کوئی قابل ذکر تبدیلی نظر نہیں آتی جس سے زیرِ تبصرہ تجزیاتی مطالعے کی ہمہ گیرافادیت متاثر ہو سکے۔ ڈاکٹر کامران کی تازہ تصنیف، جو تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل اور سات ابواب میں منقسم ہے، سندھ، بلوچستان، پنجاب اور سرحد کے ٹیکسٹ بک بورڈوں کے علاوہ وفاقی وزارتِ تعلیم کے شعبۂ نصابات کے ابتدائی اُردو کے قاعدوں، پاکستان میں پہلی جماعت سے تیسری جماعت تک کے لیے مربوط نصاب پر مبنی درسی کتب، چوتھی اور پانچویں جماعتوں کے لیے اردو کی درسی کتب وسطی درجات میں اُردو درسیات و نصابات کے جامع تجزیہ و تبصرہ کا حقیقت پسندانہ اظہار ہے۔ انہوں نے اپنے اخذ کیے ہوئے نتائج کو ساتویں باب میں مجتمع کیا ہے، جب کہ ہر باب کے ساتھ ایک معروضی تجزیہ تصنیف کی اہم فنی خصوصیت ہے۔ اُن کا اصل نقطہ نظر، جو کتاب کو بنیاد فراہم کرتا ہوا نظر آتا ہے، ایک سوال کی شکل میں یہ ہے کہ ''اردو عمومی طور پر پاکستان کے مختلف علاقوں کی اوّلین زبان نہیں ہے۔ پاکستان میں اُردو زبان کے حوالے سے مہارت کا معیار بھی یکساں نہیں ہے، لیکن اُردو زبان و ادب کے نصابات اور درسیات عمومی طور پر یکساں نوعیت اور یکساں منصوبہ بندی کے تحت تیار کی جارہی ہیں۔ تو کیا اردو کو ہر جگہ اوّلین زبان کے طور پر پڑھانے سے ہم تدریس زبان کے مطلوبہ نتائج حاصل کر سکیں گے۔؟''

فاضل مصنف کے اس نقطۂ نظر کے بارے میں ہم اپنے تحفظات کے باوجود محسوس کرتے ہیں کہ انہوں نے جس باریک بینی سے خفیف و جلی نکات کا احاطہ کیا ہے وہ نوعمر طلباء وطالبات کی نفسیات اور ہماری قومی وتہذیبی اقدار حیات کے پیش نظر نہایت جامع و برمحل ہے۔ چنانچہ جہاں وہ یہ کہتے ہیں کہ ''اُردو قاعدہ اپنی پیشکش کے اعتبار سے پُرکشش نظر نواز، رنگین اور دلچسپ ہونا چاہئے کہ یہ وہ پہلی درسی کتاب ہے جو مدرسہ میں ایک بچے کو پڑھنے کے لیے ملتی ہے۔'' وہیں وہ درسی قاعدوں میں قومی ترانے کی تقدیس و تحریم سے گریز پر مبنی پنجاب اور صوبہ سرحد کے رویوں کا سخت نوٹس لیتے ہیں۔ پنجاب میں قومی ترانے کو عقبی سرورق کے اندرونی حصہ پر چھپا کر شائع کرنے کی مصلحت کو وہ ''نا قابلِ فہم'' گردانتے ہیں، جب کہ سرحد کے اردو قاعدے میں قومی

ترانے کے اندراج کا تکلف ہی برقرار رکھنا مناسب خیال نہیں کیا گیا۔ اس کے عوض ایک نظم ''منّی کا گھوڑا'' قاعدے کی پشت پر درج ہے۔

اسلامی عقائد و اقدار کی نسبت بھی صاحب تصنیف نہایت سنجیدہ رویہ رکھتے ہیں، چنانچہ انہوں نے سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ کی شائع کردہ درسی کتب کو سراہا ہے جن میں استعمال میں لائے گئے ذخیرۂ الفاظ کو بھی ''بہتر اور وسیع'' قرار دیا ہے۔ تاہم اس سلسلے میں پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی پیشکش کو سب سے کمزور سمجھتے ہیں۔ بچوں کے اذہان پر چونکہ بعض چھوٹی چھوٹی باتیں بھی گہرے اثرات چھوڑ جاتی ہیں اس لیے ڈاکٹر کامران صوبہ سرحد کے ٹیکسٹ بک بورڈ کی شائع کردہ قائداعظم کی تصویر پر معترض ہیں، اور اُن کا کہنا ہے کہ ''قائداعظم'' دُبلے پتلے ضرور تھے لیکن اس قدر گھبرائے ہوئے کبھی نہ تھے جس قدر اس تصویر میں دکھائے گئے ہیں۔'' انہوں نے اس بات کا بھی نوٹس لیا ہے کہ چاروں ٹیکسٹ بک بورڈوں کی درسی کتب میں شامل منظومات کے ساتھ شعراء کے نام بھی لکھ دیئے جاتے ہیں اور کبھی نہیں لکھے جاتے۔ طلباء کی نسبت مطلوب و مقصود توجہ کا تقاضا ہے کہ درسی کتب ایسے سہو سے مبرّا ہوں۔ وہ اظہار افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''ابتدائی درجات کی درسیات کے لئے ذخیرۂ الفاظ کے تعین کی طرف نہ تو وفاقی ادارۂ نصاب ساز نے توجہ کی ہے اور نہ ہی صوبائی ٹیکسٹ بک بورڈ اس اہم ضرورت کی طرف متوجہ نظر آتے ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ جس محتاط اور ذمہ دارانہ انداز میں اہم ترین درسی و نصابی موضوعات پر ڈاکٹر شاید اقبال کامران نے اپنے نتائج تجزیہ و تحقیق مرتّب کئے ہیں، اُن پر متعلقہ ارباب مجاز بھرپور توجہ دیں گے کہ نسل نو کی صحیح و صحتمند تعلیم و تربیت سے زیادہ اہم ہمارے قومی نصاب کی ترجیحات کا کوئی اور موضوع نہیں ہوسکتا، کیونکہ:

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج   تا ثریا می رود دیوار کج

(جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۸)

رموزِ اوقاف

پروفیسر سیّد محمد عارف

پروفیسر ڈاکٹر سید محمد عارف نے جو بحیثیت معلّم، محقق، ادیب اور دانشور تجربہ ومشاہدہ کا وسیع علمی وتعلیمی پس منظر رکھتے ہیں، زیر نظر کتاب مرتّب کر کے ایک نہایت اہم خدمت انجام دی ہے۔ عین ممکن ہے کہ ''رموز اوقاف'' کی اصطلاح سے بعض حضرات متعارف ہی نہ ہوں لیکن تعلیمی شعبے میں نصابی مضمون کے طور پر انگریزی زبان کا متبادل لفظ Punctution ایسا ہے جس سے ثانوی سطح کے طلباء وطالبات بھی بخوبی واقف ہیں۔ لغوی اور اصطلاحی معنی میں اس لفظ سے اعراب نگاری مراد ہے، یعنی وقفہ لگانے کا عمل، بالخصوص تحریر یا طباعت میں معنی کو واضح کرنے کے لیے۔ نشانات وعلامات سے عبارت کو آراستہ کرنے کا عمل، فن یا نظام۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کے الفاظ میں ''اوقاف یا وقفے اُن علامتوں کو کہتے ہیں جو ایک جملے کو دوسرے جملے سے یا کسی ایک جملے کے حصے کو دوسرے حصوں سے علیحدہ کریں۔'' اس سلسلہ میں اپنی کتاب ''قواعد اُردو'' میں مولوی صاحب اس نظام یا عمل کے نتائج پر روشنی ڈالتے ہیں، چنانچہ مصنف نے مولوی صاحب کے اس تاثر پر مبنی تحریر کو خصوصی اہمیت دیتے ہوئے اسے کتاب کے آغاز ہی میں ایک مکمل صفحہ کی زینت بنایا ہے۔

''ان اوقاف کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اوّل تو اُن کی وجہ سے نظر کو سکون ملتا ہے وہ تھکنے نہیں پاتی دوسری بڑی بات یہ ہے کہ ذہن ہر جملے یا جزو جملہ کی اہمیت کو جان لیتا ہے اور مطلب سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔''

زیر تبصرہ تصنیف کو ہم مصنف کی ایک اہم خدمت اس لیے بھی سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اُردو زبان وادب کے صحیح تفہیم وادراک کے فراموش کردہ اور مسلسل عدم توجہی کے شکار ایسے موضوع کی طرف اہل علم ودانش اور شعبہ تعلیم کے کارپردازانِ گرامی کی توجہ مبذول کرائی جو عبارت ومتن کے

لفظی اور معنوی حسن کی بھی ضمانت دیتا ہے۔ انگریزی کی طرح اگر رموزِ اوقاف کو اُردو کے نصاب کا حصہ بنایا گیا ہوتا تو اُردو کے لسانی شعور کی سطح ابتدائی درجات سے لے کر ڈاکٹریٹ کی سطح تک مزید بہتر ہو سکتی تھی اور اہلِ علم کے مرتبہ رسائل و کتب حسنِ ہئیت کے سبب زیادہ پُرکشش اور تاثر انگیز ثابت ہو سکتے تھے۔ ہماری بدقسمتی کہ قیامِ پاکستان کے بعد آج چھ دہائیوں سے زیادہ مدت گزر جانے کے باوجود بھی یہ اہم موضوع محتاجِ توجہ نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں متعلقہ اداروں کی بے اعتنائی بلکہ بے حسی ایک المیہ ہے۔ ۱۹۸۵ء میں مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد نے یقیناً ایک اہم قدم اٹھایا اور قومی زبان کے مسائل کے حوالے سے جو سمینار منعقد کیے گئے ان میں منجملہ دیگر اُمور و مسائل رموزِ اوقاف کے موضوع پر بھی شرکاء نے بحث کی اور متعدد تجاویز زیرِ غور آئیں۔ چنانچہ ایک تجویز جسے پذیرائی حاصل ہوئی یہ تھی کہ ''ہر سطح کی درسی کتابوں میں علامتوں کے درست استعمال کے علاوہ تربیت کے لیے سکول کی سطح پر کسی درجے میں اسے نصاب کا جزو بنایا جائے تا کہ آنے والی نسلیں ان علامتوں کے استعمال پر اس طرح قادر ہوں کہ اُن کی فطرت ثانیہ بن جائے۔''

لیکن بقول ڈاکٹر عارف، رموزِ اوقاف کو انٹرمیڈیٹ کی سطح پر تو نصاب میں شامل کر دیا گیا لیکن موثر عملدرآمد نہ ہو سکا۔ ہم ان کے اس خیال سے بھی متفق ہیں کہ منجملہ دیگر وجوہ ایک سبب یہ بھی تھا کہ اُردو میں اس موضوع پر مواد نہ ہونے کے برابر ہے۔ ڈاکٹر ممتاز بنگلوری نے اُردو زبان کی اس محرومی کا جو نقشہ کھینچا ہے اُس کے خدوخال آج بھی بدستور قائم و دائم ہیں:

''کچھ غلطیاں مصنف کی کچھ ایڈیٹر کی، کچھ کاتب یا خوش نویس صاحبان کی اور کچھ پروف ریڈر صاحبان کی۔۔ سب مل کر کتاب میں رموزِ اوقاف کا وہ نمونہ پیش کرتی ہیں جو دیدنی ہے۔''

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر مصنف کا یہ جذبہ قابلِ قدر ہے کہ وہ اپنی زیرِ نظر تصنیف کو ایک تحریک کا نقطۂ آغاز بنانے کے متمنی ہیں اور ان کی آرزو ہے کہ یہ تحریک اردو میں علمی انقلاب کا پیش

خیمہ ثابت ہو۔ ''تمنا کا دوسرا قدم'' کیا ہوگا، آنے والا وقت ہی بتا سکتا ہے۔ جہاں تک مقتدرہ کا تعلق ہے، ہمیں یہ موضوع ان کی ترجیحات میں کہیں نظر نہیں آتا۔ یہ غنیمت ہے کہ ہائر ایجوکیشن کمیشن نے ڈاکٹر عارف کی اس اہم تصنیف کی اشاعت کا اہتمام کیا جو حقیقتاً مقتدرہ کے دائرۂ کار میں آتا ہے۔ بااین ہمہ مقتدرہ کے صاحبانِ اقتدار سے یہ توقع بے محل نہ ہوگی کہ وہ ''دیر آید درست آید'' کے مصداق ۱۹۸۵ء کے سیمینار کے تفویض کردہ اہداف کی تکمیل کے لیے سرگرم عمل ہو جائیں، جن میں 'الف) اردو میں قابل استعمال رموزِ اوقاف کی جامع فہرست کی تیاری (ب) رموزِ اوقاف میں ہر علامت کے لیے میعاری نام تجویز کرنا، نیز (ج) رموزِ اوقاف کے صحیح استعمال کی جامع مثالیں تیار کرنا شامل ہے۔

رموزِ اوقاف کے تجدید واحیاء کی کسی بھی منصوبہ بندی میں مقتدرہ کو زیرِ نظر تصنیف سے موثر رہنمائی اور مدد مل سکتی ہے۔ فاضل مصنف نے کتاب کے مندرجات کا آغاز ہی ایک ہمہ گیر جائزے سے کیا ہے جو مسلم الثبوت محققین کے نتائجِ تحقیق سے مرصّع ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں مرحوم کی تحقیق کے مطابق اردو میں رموزِ اوقاف کا استعمال اٹھارویں صدی عیسوی تک بالکل نہیں تھا۔ اُنیسویں صدی کے ربع اوّل میں فورٹ ولیم کالج، کلکتہ اور بمبئی ایجوکیشنل سوسائٹی کے تحت اردو ٹائپ میں مطبوعہ کتب میں اختتام پر ستارے کا نشان (☆) ملتا ہے۔ یہی نشان سرسیّد کے رسالے ''تہذیب الاخلاق'' میں بھی نظر آتا ہے۔ اولاً اردو مین رموزِ اوقاف کے دو ہی زبانوں کے نمونے سامنے آتے ہیں۔ ایک عربی میں قرآن مجید کے رموز اوقاف، دوسرے انگریزی زبان میں مروّجہ علامات۔ سرسیّد سے پہلے اردو میں قرآنی رموز اوقاف کے استعمال کی طرف توجہ دلائی گی تھی۔ تاہم سرسید نے بوجوہ قرآنی رموزِ اوقاف کی بجائے انگریزی علامتوں کے استعمال پر زور دیا۔ پروفیسر ڈاکٹر عارف نے اپنی کتاب میں جو دس ابواب پر مشتمل ہے رموزِ اوقاف کی حقیقت و ماہیت اور اُس کی جامع تعریف، نیز اہمیت وافادیت پر بحث کی ہے۔ انہوں نے علامتوں کے اخذ کرنے کی توجیہہ، مستند انگریزی کتب اور دانش وروں کی آرا کے ساتھ اپنے محتاط اور وقیع تجزیئے پیش کئے ہیں۔ کتاب مستند، جامع اور قطعیت کی حامل ہے۔ فاضل مصنف کا

مدعا ہے کہ ادباء وشعراء، اہل صحافت اور ابتدائی جماعتوں سے لے کر ڈاکٹریٹ تک کے طلباء و طالبات میں رموزِ اوقاف کا واضح شعور پیدا ہو سکے۔

ہم فاضل مصنف کی موضوعی اعتبار سے اس سنگِ میل تصنیف پر ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں اور اُن کی مخلصانہ کاوش کے بار آور ہونے کے لیے دعا گو ہیں۔

(جولائی۔ستمبر۲۰۰۸ء)

عرض داشت (شعری مجموعہ)

سیّد مشکور حسین یاد

سیّد مشکور حسین یاد کا چوتھا شعری مجموعہ ''عرض داشت'' پیش نظر ہے، جسے اُن کے گزشتہ مجموعوں یعنی ''برداشت'' ۔ ''پرداخت'' اور ''نگہداشت'' کا معنوی اور فکری وفنی تسلسل کہا جا سکتا ہے۔ وہ ایک مسلم الثبوب اُردو اور فارسی ادب کے استاد اور جیسا کہ ایک بار ہم اُن کے بارے میں لکھ چکے ہیں۔ ایک ''مجتہد الفکر'' اہل قلم اور دانشور ہیں، ہمیں ان کے بارے میں یہ رائے قائم کرنے کا موقع اس طرح میسر آیا کہ اب تک ہم ان کے تمام شعری مجموعوں پر تو نقد و تبصرہ کی سعادت حاصل کر ہی چکے ہیں، اُن کی دیگر تالیفات و تصانیف بھی اسی ضمن میں ہمارے زیر مطالعہ آ چکی ہیں، لہٰذا اُن کی فلسفیانہ فکر، ادبی نظریات اور تنوع سے مملو وسعت مطالعہ جس میں مذہبی رموز نکات بھی شامل ہیں۔ ہمارے لئے محتاج تعارف نہیں۔ یاد صاحب کی ایک قلمی جہت انشائیہ نگاری بھی ہے ار ہم اس سے بھی متعارف ہیں، تاہم تنقید و تحسین کے ضمن میں ہم ان کے اس وصف سے باخبر ہیں یہ وہ اختلافِ رائے کو حقیقی دانش و حکمت کا اہم تقاضا گردانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے انتقادی تجزیئے ہمارے اور اُن کے درمیان وسیع النظری کے ربطِ باہم کی علامت بن چکے ہیں۔

یاد صاحب کا شعری سفر چھ دہائیوں سے بھی متجاوز مدت پر محیط ہے۔ وہ تمام اصنافِ شعری بالخصوص غزل کے فکری، فنی اور موضوعی ارتقاء کے ناظر بھی ہیں اور نظیر بھی۔ نصف صدی قبل اُن کا تصور غزل اُن کے درج ذیل اشعار میں جھلکتا نظر آتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

کہتے ہیں جس کو حشر قیامت ہے جس کا نام — یہ حادثہ تو روز ہوا ہے ہمارے ساتھ
ہیں غم بھی بے شمار تو خوشیاں بھی بے پناہ — جو بات ہے وہ حد سے ہوا سے ہمارے ساتھ
یارو چراغِ عقل و خرد کو سنبھالنا — دشتِ طلب کی تیز ہوا ہے ہمارے ساتھ

زیرِ نظر مجموعہ اُن کے افکارِ تازہ کی سندِ اعتبار ہے جس میں اُن کی متحرک فکر اُن کے نظریات تازہ کی بھی غماز بن گئی ہے اور اُن کے اپنے کہے ہوئے مصرعہ یعنی ''جو بات ہے وہ حد سے سوا ہے ہمارے ساتھ'' پر مہر تصدیق ثبت کر رہی ہے۔ اس مجموعے میں شامل ایک غزل کے چند شعر:

کس شاہ کے سامنے جھکے ہیں ہم خود کو سلامنے جھکے ہیں
معیار پہ لا رہے ہیں سب کو ہر خاص کو عامنے جھکے ہیں
ہے قوس میں قول کی قیادت کامل سے کلامنے جھکے ہیں
سجدہ ہے روانی مطالب مطلب کو لگامنے جھکے ہیں

اسمائے معرفہ ونکرہ سے افعال کی نئی اشکال تراشنا بحیثیت استاد اُن کا حق ہے، لیکن زبان کی لطافت و شستگی کو پیش نظر رکھنا بھی بحیثیت شاعر اُن کا فرض ہے۔ شعر و ادب کی دنیا میں وہ ایک قد آور شخصیت تسلیم کئے جاتے ہیں۔ یہ وہ ہستیاں ہوتی ہیں جو معاصر رُجحانات کو نئی اقدار کا ورثہ دے جاتی ہیں۔ توانا و مقتدر تجربہ و مشاہدہ ان کے فن کی اساس ہوتے ہیں۔ لیکن ہمیں یقین نہیں آتا کہ پروفیسر یاد جیسا ذکی و زیرک فنکار عصری سطحیت کا شکار ہو سکتا ہے اور جدت و اختراع کے نام پر ایک ہم عصر شاعر (جسے جدیدیت کا سرخیل ہونے کا دعویٰ ہے) کی مخبوط المعنای اور کریہہ الہیت، نام نہاد جدید اختراعی شاعری کی تمثیل کو کسی طرح واجب و لازم سمجھ سکتا ہے۔ مذکورہ اشعار یا چند اسی نوع کی غزلوں سے قطع نظر ''عرض داشت'' کا بیشتر کلام فکری و فنی جدت، علوئے خیال اور اُسلوب و ہیئت کی شاہکار امثلہ سے بھرا پڑا ہے، جن میں بین اسطور شاعر کا مذاق خود آگہی اور شعور ذات کا متوازن اظہار قاری کو خوشگوار حیرت سے دوچار کر دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

مجھ میں زادے نے دیکھے ہیں بہت خواب فلک ہر ستارہ مری تصویر لے بیٹھا ہے
ہم اپنی طبع کی جب کہکشاں سنبھالتے ہیں تو حرفِ نو کا نیا آسماں سنبھالتے ہیں
ہم اپنے گوشِ حقیقت نیوش کے باعث نوید نوبت نام و نشاں سنبھالتے ہیں
ہم کس طرح نہ تیز ہوں ادراکِ صبح میں رہتے ہیں عین جلوۂ بیباک صبح میں

کیے نہ ہم سے خاور تدبیر جگمگائے
اپنا لہو ہے شعلہ چالاک صبح میں
وا ہے ہمارا سینہ بھی ہر نور کے لیے
ہم بھی شمار ہوتے ہیں افلاکِ صبح میں
ہر زخم دے رہا ہے ہمیں دولت شعور
معنی کا اژدہام ہے ہر چاکِ صبح میں
کچھ اور شے ہے یاد وہ نظارۂ طلوع
کرنوں کو ڈالے خس و خاشاک صبح میں

فکری انفرادیت اور فنی عظمت کا یہ وہ ورثہ گراں بہا ہے جو اید جیسے بلند قامت شاعر نسل نو کو منتقل کر سکتے ہیں۔ جدت اور اختراع کے لیے جس ندرت و تازہ کاری کی ضرورت ہے وہ ''عرض داشت'' کے شاعر کے ہاں ذخیرہ در ذخیرہ موجود ہے۔ لفظی شکوہ، اُسلوب کی وجاہت، فکری ماورائیت اور لہجے کا نیا پن دیکھنا ہو تو یاد کا یہ طرز سخن بھی یاد رکھیے:

شام و سحر کے جوش نمو میں اتر گیا
میں مسکرا کے اپنے لہو میں اتر گیا
بس خود کو آئینے کی طرح توڑتا رہا
خواہش کی خام کاریٔ خُو میں اتر گیا
موجِ ہوا میں واقعی تاثیر ے بھی تھی
سیر صبا کو لے کے سبؤ میں اتر گیا
میرا تو یاد کھیل ہی سارا تھا حرف تک
نکلا کبھی سے اور کبھو میں اتر گیا

جبینِ حرف پہ بل دھوپ کا کرشمہ ہے
سخن میں ردوبدل دھوپ کا کرشمہ ہے
بھرا ہے دھوپ سے میرا غزال صد معنی
مری تمام غزل دھوپ کا کرشمہ ہے
مری جبیں سے اجالوں کے چشمے پھوٹتے ہیں
مری جبیں کہ جبل دھوپ کا کرشمہ ہے
بساطِ جلوہ بچھا دی ہے حرف حرف نے یاد
سخن کی سیج سجل دھوپ کا کرشمہ ہے

دل کو اک آہ سے اٹھانا تھا
کوہ کو گاہ سے اٹھانا تھا
میر صاحب کے ہوش اڑ جاتے
آہ کو واہ سے اٹھانا تھا

مشکور حسین یاد کی شاعری ان کی شخصیت کے فکری، نظری اور فنی خدوخال کی ترجمان ہے۔ ابلاغ کی جہتوں پر انہیں جو قدرت حاصل ہے درج ذیل اشعار اس کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

ملے وہ رنگ سیاق سبق سبق سے ہمیں
شفق شفق نے پکارا ورق ورق سے ہمیں

جبھی تو وا ہوئے ہم پر طرح طرح کے علوم
عزیز ہیں جو معانی اوق اوق سے ہمیں

یوں سمجھئے ساتھ اپنے جھکتے ہیں سات آسماں
اس طرح سر کہکشاں انداز میں رکھتے ہیں ہم

برق کی صورت چمکتے ہیں معانی و خیال
آگہی کو ناگہاں انداز میں رکھتے ہیں ہم

توڑتے ہیں سرحدیں ندرت کی تیغ تیز سے
ہر کراں کو بیکراں انداز میں رکھتے ہیں ہم

رفعت کون ومکاں قدموں میں ہو کیونکر نہ یاد
آسماں کو آستاں انداز میں رکھتے ہیں ہم

"آسماں کو آستاں انداز میں رکھتے ہیں ہم" یہ مصرعہ لفظ و معنی پر شاعر کی مضبوط گرفت کی غمازی کے ساتھ ساتھ قلبی کاوش کی بھی عکاسی کرتا ہے۔ شاعر کے چاروں دواوین میں ایسی مثالیں بے شمار ہیں لفظوں کی صورتی ہم آہنگی سے پیکر تراشی کے انداز یاد کا منفرد اُسلوب ہے جسے انگریزی شاعری میں "Alliteration" کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسے ہم اردو میں "تجنیس لفظی" بھی کہہ سکتے ہیں۔ صوتی ہم آہنگی کے ذریعہ لفظی جمالیات کا اہتمام مشکور کا نہایت محبوب ومرغوب مشغلہ ہے۔

اپنی وحشت کو ہم اعلان میں لے کر آئے
دل کے اس تحفے کو طوفان میں لے کر آئے

کوئی دیوانہ ہی سمجھے گا ہماری حکمت
گرد گردوں کو گریبان میں لے کر آئے

ہم نے یوں قربت و دوری کی حفاظت کی ہے
ہجر کو وصل کے جُزدان میں لے کر آئے

ہیں بیش و کم جاگیں اور جاگتے جائیں
ہم کہ دم بدم جاگیں اور جاگتے جائیں

ہم جو روشنائی سے ظرف عصر پُر کر دیں
لوح کیا قلم جاگیں اور جاگتے جائیں

نام دوست آتے ہی کیوں نہ حرف ہائے شوق
یاد یک قلم جاگیں اور جاگتے جائیں

شہد کا شرارہ ہے بوسۂ لب لعلیں
کیا شفق شمارہ ہے بوسۂ لب لعلیں

اس سے بڑھ کے کیا ہوگی عشرتِ طلب کوئی
حدِ استعارہ ہے بوسۂ لب لعلیں

ہر کڑی دھوپ میں سائے کہ سہولت ہے یہ جان
مُہر ہے مُہر بلب ایسی مہورت ہے یہ جان

مشکور حسین یاد کی شاعری کا مزاج بنیادی طور پر کلاسیکی ہے۔ ان کے ہاں فکر غالب کا تسلسل اس حد تک نمایاں ہے کہ انہیں "مغلوبِ الغالب" کہا جائے تو غلط نہ ہوگا لیکن انہوں نے اپنی تازہ

کاری سے ''عصریت'' کے عنصر کو بھی خوب واضح کیا ہے، البتہ ایک طویل ادبی سفر کے بعد اُنہیں کہ وہ اپنے تقریظ نگار کرامت بخاری کے بقول ''مفرِش بھی ہیں اور معرّب بھی'' زبان و بیان کے ایسے عصری رو۔حجانات کو در خور اعتنا نہیں سمجھنا چاہئے جن سے اردو زبان اور اردو غزل کا حسن متاثر ہوتا ہو۔ ردیف و قوافی میں طرفگی کو جستجو اور لفظی تراش خراش کا عمل، عمل تادیب و تخلیق تو ہونا چاہئے لیکن عملِ جراحی نہیں۔ ہم نے متذکرہ اشعار کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مشکور واقعی ''مجتہد الفکر'' شاعر ہیں۔ زبان و کلام پر قدرت ان کا اختصاص ہے۔ تغزل کی لطافتوں اور ع باریکیوں کے وہ نقیب بھی ہیں اور امین بھی، اور اُن کا کلام اُن کے اسی تصورِ غزل کا تسلسل بلکہ ارتقائی مرقع ہے۔ جس کی ایک جھلک اس تجزیئے کے آغاز میں ہم نے دیکھی۔ کتاب کے دیباچے کے اختتام پر اُن کا پہلا نوٹ کہ وہ دیباچہ لکھوانے کے قائل نہیں، بے ضرورت معلوم ہوتا ہے کہ فاضل دیباچہ نگار نے ان کے فکر و فن کا جس خوبصورت انداز سے احاطہ کیا ہے وہ دیباچے کی ضرورت کو واضح کرتا ہے۔ دوسرے نوٹ میں کہ ''میں عروض کی بہت سی پابندیوں کا خاص قائل نہیں ہوں، اس لیے میرے اشعار میں حروفِ علت کو احتیاط سے پڑھیں'' ہم درحقیقت اُن کے ''کلام بلاغت نظام'' کو ہر طرح کی علتوں سے ماورا دیکھنا چاہتے ہیں، جس پر وہ قادر بھی ہیں۔ بطور ثبوت ملاحظہ ہوں اُن کی تغزل بار فکر کے چند نمونے:

طواف کرتا ہے آنکھوں میں خواب لہجے کا ＿ لبوں پہ رہتا ہے اس کے گلاب لہجے کا
وہ اس کی صورتِ زیبا پہ رونق معنی ＿ وہ اس کے رخ پہ دہکتا غیاب لہجے کا
کہاں کہاں نہیں لہجے کا میکدہ پہنچا ＿ کہاں کہاں نہیں چھلکا صحاب لہجے کا

تغزل ہی نہیں آخر میں یاد کی فلسفیانہ فکر کا نمائندہ ایک شعر جو کسی بھی قاری کو تادیر غور و فکر کے محیط میں مقیدر کھ سکتا ہے۔

یہ جہاں خواب تو ہے خواب کی جاگیر نہیں ＿ آنکھ کھل جائے تو یہ خواب کی جاگیر بھی ہے

(جولائی۔ستمبر ۲۰۰۸ء)

شعروں کے انتخاب نے

خواجہ مشتاق حسین

زیرِ نظر شعری انتخاب جو خواجہ مشتاق حسین کے لطیف و نفیس مذاقِ سخن کا مرہونِ منت ہے، کتابی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ خواجہ صاحب بہ امتیاز پیشہ سول انجینئر ہیں اور ۱۹۶۵ء میں کراچی (پاکستان) سے ترکِ سکونت کے بعد سے مستقلاً امریکہ میں مقیم ہیں۔ چنانچہ اُنھیں تارکِ وطن بھی کہا جاسکتا ہے لیکن سرزمینِ وطن کی تہذیب و ثقافت جس شعری و ادبی ورثے کی امین ہے وہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ان کے ذہنی اُفق پر جلوہ بار نظر آتا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب کے مرتب ہی نہیں بلکہ اکثر تارکینِ وطن اُن اقدارِ حیات کو اجنبی معاشروں میں بھی حرزِ جاں بنائے ہوئے ہیں جن سے ان کا ماضی عبارت ہے۔ چنانچہ یورپ، امریکہ، مشرقِ وسطیٰ اور خلیج کے ممالک میں بالخصوص اردو زبان و ادب سے والہانہ ربط و تعلق کی جو روایتی فضا پروان چڑھ رہی ہے اُس کے نتیجہ میں برصغیر پاک و ہند کے اہلِ قلم کے بیرونِ ملک روابط میں نہ صرف اضافہ ہوا ہے بلکہ اردو زبان و ادب کے عالمی سطح پر فروغ و ارتقاء میں موثر مدد ملی ہے۔ خود خواجہ صاحب نے بالٹی مور، میری لینڈ اور ایریزونا وغیرہ میں بین الاقوامی مشاعروں کا اہتمام کیا ہے۔ ایریزونا میں ''بزمِ فن'' کے صدر کی حیثیت سے اُن کی خدمات بہت نتیجہ خیز ثابت ہوئیں جن میں ان کی رفیقہ حیات، محترمہ برکت فاطمہ حسین کا کردار نہایت اہم رہا جو ایک پروفیشنل آرٹسٹ ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ''شعروں کے انتخاب نے'' اُن کی غالب شناسی کو سندِ اعتبار عطا کر دی ہے کہ فکرِ غالب کا ایک ایسا شعر، جو شاعر کے اسلوبِ سخن کا شاہکار بھی ہے کتاب کے سرورق کی زینت بن گیا ہے، یعنی:

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے مجھ سے

مرتّب کے حسنِ انتخاب کا سہرا جو انتخاب حسن بھی ہے اُن کے عہدِ طفلی سے منسوب ''بیت بازی'' کی مشقوں کے سر ہے جنہیں اُن کی سخن شناسی کی صلاحیتوں نے دیارِ غیر کی شعری محفلوں میں ایک محبوب و مرغوب جہت کا مقام عطا کر دیا ہے۔ اشعار کا انتخاب فنی ضرورت کے طور پر حروف تہجی کی ترتیب کے تحت کیا گیا ہے، لیکن موضوعی، فکری اور اُسلوبی برجستگی کا وہ عالم ہے کہ قاری لحہ بہ لحہ محسوس کرتا ہے کہ ''کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست'' یہی نہیں بلکہ متقدمین، متوسطین اور متاخرین و معاصرین کے شعری انتخابات صنفِ غزل کے فکری وفنی ارتقاء کا جمال افروز منظر نامہ پیش کرتے ہیں۔ ادبی روایت کا تسلسل اس طرح عکس ریز نظر آتا ہے کہ کلاسیکی اقدارِ شعر سے جدید افکارِ غزل تک کا سفر مطالعے کے حسن کو دل کی گہرائیوں میں اُتار دیتا ہے۔ مثلاً اساتذہ کے انتخاب میں بھی جو کلاسیکی لطافتیں دامن کش دل بن جاتی ہیں، ان کا اندازہ درج ذیل اشعار سے ہوسکتا ہے۔

ناسخ۔ باندھتے ہیں اپنے دل میں زلفِ جاناں کا خیل
اس طرح زنجیر پہناتے ہیں دیوانے کو ہم

آتش۔ نہ پوچھ عالم برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

میر۔ خورشید سا پیالۂ مے بے طلب دیا
پیر مغاں سے رات کرامات ہو گئی

میر۔ دل پُرخوں کی اک گلابی سے
عمر بھر ہم رہے شرابی سے

میر۔ مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

میر۔ غمزۂ چشمِ خوش قدانِ زمیں
فتنۂ آسمان ہوتے ہیں

غالب۔ کوئی پردہ نشیں مصروف غسلِ ناز ہے شاید
کہ چلمن چھوڑ دی ہے آسماں نے ابروباراں کی

مومن۔ شب وصال ہے گُل کر دوان چراغوں کو
خوشی کی بزم میں کیا کام جلنے والوں کا

کتاب کے مطالعے سے تاثر ملتا ہے کہ مرتب صرف صاحب ذوق ہی نہیں صاحب مطالعہ بھی ہیں، خصوصاً غزل کے ضمن میں ان کا شعری انتخاب، حرورفِ تہجی کی ناگزیر ترتیب سے قطع نظر، ہر دور کے نمائندہ شعراء کے نمائندہ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس طرح مضامین واسالیب غزل کی ارتقاء پذیری کا رُجحان قاری کی توجہ خود بخود اپنی طرف مبذول کرا لیتا ہے۔ ہماری دانست میں

غزل نے جس طرح مشاعرہ کو ذریعہ بنا کر اُسے ایک ادارے (Institution) کا مقام و مرتبہ عطا کیا اسی طرح اگر بیت بازی میں حروف تہجی کو ثانوی اور حسنِ شعری کو اوّلین حیثیت دی گئی تو بلاشبہ یہ بھی ایک ادارے کی منزلت کو پہنچ سکتی ہے۔ اب تک اس شعبہ کو نو عمر طلباء تک محدود رکھا گیا ہے۔ اگر اسے صاحبانِ ذوق کو شامل کرنے تک وسعت دی جائے تو ہوسکتا ہے کہ یہ کسی وقت مشاعرہ کی ہم پلہ حیثیت اختیار کر لے اور مشاعروں کی طرح اُردو زبان کے نئے بلندیوں تک پہنچنے کا ذریعہ بن جائے۔ فاضل مرتب کے حسنِ انتخاب سے درج ذیل اشعار ہمارے اس تاثر کو تقویت بخشتے ہیں:

غالب۔ اک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگہ — چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے
حسرت۔ اللہ رے حسن یار کی شوخی کہ خود بخود — رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام
اقبال۔ اے یاد بیابانی مجھ کو بھی عنایت ہو — خاموشی و دل سوزی، سرمستی و رعنائی
غالب۔ بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی — وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے
غالب۔ ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق — لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر
ثاقب لکھنوی

رہ طلب میں کوئی کس پہ اعتبار کرے — جنوں خرد کا مخالف، خرد جنوں دشمن
فانی۔ صور و منصور و طور اے توبہ — ایک ہے تیری بات کا انداز
اقبال۔ عرش کا ہے کبھی کعبے کا ہے دھوکہ اس پر — کس کی منزل ہے الٰہی مرا کاشانۂ دل
اقبال۔ فطرت مری مانند نسیم سحری ہے — رفتار ہے میری کبھی آہستہ کبھی تیز
میر۔ کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے — تیری آنکھوں کی نیم خوابی سے
ثاقب لکھنوی

یوں تبسّم آفرین چہروں کے کھائے ہیں فریب — جب کوئی بے ساختہ ہنستا ہے بھر آتا ہے دل
ثاقب لکھنوی

وہ آنسوؤں پہ مرے مسکرادیئے ثاقب — بکھر گئے مری حدِ نگاہ تک گلشن

غالب۔ یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے　　کہ غیر جلوۂ گل رہگزر میں خاک نہیں

جگر۔ یارب ہجوم درد کو دے اور وسعتیں　　دامن تو کیا ابھی مری آنکھیں بھی نم نہیں

غزل میں اسلوب کی بے شمار جہتیں جلوہ بار دکھائی دیتی ہیں جن میں سلامت و سادگی، برجستگی و بے ساختگی اور ندرت و نفاست وغیرہ بھی شامل ہیں جب کہ خیال یا مضمون کی رفعت و ماورائیت اور جدت و طرفگی بھی شعر کی عظمت متعین کرتی ہیں۔لیکن اوّل الذکر کو فوقیت اس لیے حاصل ہے کہ بعض اوقات بے سلیقگی اچھے سے اچھے خیال کو بے وقعت بنا دیتی ہے۔ زیرِ نظر انتخاب شعری میں مرتّب کا وجدان اسالیب کے محاسن پر کمند افگنی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ملاحظہ ہو:

داغ۔ پڑا فلک کو ابھی دل جلوں سے کام نہیں　　جلا کے خاک نہ کردوں تو داغ نام نہیں

قمر جلالوی۔ صرف چہرے کی اُداسی سے بھر آئے آنسو　　دل کا عالم تو ابھی آپ نے دیکھا ہی نہیں

قمر جلالوی۔

ضبط کرتا ہوں تو گھٹتا ہے قفس میں میرا دم　　آہ کرتا ہوں تو صیاد خفا ہوتا ہے

بہزاد لکھنوی۔

گدا نواز نے سب کے تو ہاتھ تھام لیے　　ہمارا دستِ طلب مسکرا کے چھوڑ دیا

اکبر الہ آبادی۔

بزم یاراں سے پھری باد بہاری مایوس　　ایک سر بھی اُسے آمادۂ سودا نہ ملا

حسرت۔ ترے کرم کا سزا وار تو نہیں حسرت　　اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

نامعلوم۔ تم سمندر کی بات کرتے ہو　　ہم تو آنکھوں ڈوب جاتے ہیں

نامعلوم۔ تبسّم کھیلتا رہتا ہے لب پر　　امیدوں کا بھرم ہے اور میں ہوں

اصغر گونڈوی۔

رواداد چمن سنتا ہوں اسی طرح قفس میں　　جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

اقبال۔ گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور　　چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

ساحر صدیقی۔

میں ایک زمانے سے تمھیں ڈھونڈ رہا ہوں　　تم ایک زمانے سے خدا جانے کہاں ہو☆

متاخرین و معاصر شعراء کے کلام سے بھی خوبصورت انتخاب کتاب کی زینت ہے جو یہ باور کرانے کے لیے کافی ہے کہ اردو زبان کا مزاج اردو غزل میں اس قدر رچ بس گیا ہے کہ تازہ بہ تازہ افکار و مضامین سرمایۂ غزل کا حصہ بنتے چلے گئے ہیں اور یہ عمل غیر مختتم جاری و ساری ہے۔

وجد حیدر آبادی۔

اے صبا لالۂ کم ظرف سے اتنا کہہ دے　　دل کی توہین ہے داغوں کا نمایاں ہونا

بشیر بدر۔

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو　　نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

ساغر صدیقی۔

آؤ اک سجدہ کریں عالمِ مدہوشی میں　　لوگ کہتے ہیں کہ ساغر کو خدا یاد نہیں

احمد ندیم قاسمی۔

انداز ہو بہو تیری آوازِ پا کا تھا　　دیکھا نکل کے گھر سے تو جھونکا ہوا کا تھا

زہرہ نگاہ

بھٹک رہے ہیں مقدر کی بارگاہوں میں　　نظر فریب سہاروں کے کُھل رہے ہیں بھرم

فیض۔ بھولے سے مسکرا تو دیئے تھے وہ آج فیض　　مت پوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے

ساحر لدھیانوی۔

پوچھ کر اپنی نگاہوں سے بتا دے مجھ کو　　میری راتوں کے مقدر میں سحر ہے کہ نہیں

ادا جعفری۔

تم پاس نہیں ہو تو عجب حال ہے دل کا　　یوں جیسے میں کچھ رکھ کے کہیں بھول گئی ہوں

صاحبزادہ میکش۔

چھلک رہا ہے تبسم بھی ساغرے سے　　پھر ایکبار اسی طرح مسکرا کے پلا

فیض۔

جوڑ کے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے　　رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

پروین سیّد فنا۔

چھلک رہے ہیں نگاہوں سے خوں کے پیمانے کوئی دکھے ہوئے دل کی پکار کیا جانے

پروین شاکر۔

خوشبو کہیں نہ جائے یہ اصرار ہے بہت اور یہ بھی آرزو کہ ذرا زلف کھولیے

راحت اندوری۔

ڈھلے گا دن تو سلگنے لگے کا دل میرا مجھے بھی گھر کے چراغوں کے ساتھ رکھ دینا

ناصر کاظمی۔

ذرا سی دیر ٹھہرنے دے اے غم دنیا بُلا رہا ہے کوئی بام سے اتر کے مجھے

حامد مارہروی۔

ذکر کچھ آپ کے اُلجھے ہوئے گیسو کا نہ تھا بات تو میری پریشانی حالات کی تھی

مخدوم محی الدین۔

رات بھر دیدۂ غمناک میں لہراتے رہے سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

ساغر صدیقی۔

زندگی جبر مسلسل کی طرح کاٹی ہے جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

نخشب جارچوی۔

کہاں میں اور کہاں دیر و حرم کی کشمکش نخشب کسی کے نقش پا پر رکھ دیا گھبرا کے سر میں نے

شکیل بدایونی۔

میں اِسی میں سرخرو ہوں کہ محبتوں کی بازی وہ قدم قدم پہ جیتے میں قدم قدم پہ ہارا

شکیل بدایونی۔

مرا عزم اتنا بلند ہے کہ پرائے شعلوں کا ڈر نہیں مجھے خوف آتشِ گل سے ہے یہ کہیں چمن کو جلا نہ دے

قتیل شفائی۔

گنگناتی ہوئی آتی ہیں فلک سے بوندیں کوئی بدلی تری پازیب سے ٹکرائی ہے

ایک قابل ذکر وصف اس کتاب کا یہ بھی ہے کہ خواجہ مشتاق حسین صاحب نے خاصی تعداد ایسے اشعار کی شریک اشاعت کی ہے جو زبان زد خاص و عام ہیں۔ لیکن اکثر کے خالق شعراء کا نام معلوم نہیں یہ مسئلہ بڑی حد تک مرتب نے حل کرنے کی کوشش کی ہے تاہم ایسے اشعار بھی ہیں جن کی وراثت کا علم نہیں ہو سکا ہے۔ شائد ڈاکٹر فرمان فتحپوری اس سلسلے میں مدگار ہو سکیں کہ وہ ''آوارہ شعروں'' کا شجرۂ نسب دریافت کر لینے میں شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ چند نمونے:

مادھو رام جوہر۔

اب عطر بھی ملو تو محبت کی بُو نہیں ۔۔۔ وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا

حفیظ جونپوری۔

بیٹھ جاتے ہیں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے ۔۔۔ ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

ثاقب لکھنوی۔

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے ۔۔۔ جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

اصغر گونڈوی۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے ۔۔۔ اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

مخدوم محی الدین۔

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو ۔۔۔ چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

نامعلوم۔ داورِ حشر مرا نامۂ اعمال نہ دیکھ ۔۔۔ اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

شیفتہ۔ فسانے اپنی محبت کے سچ ہیں پر کچھ کچھ ۔۔۔ بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیبِ داستاں کے لیے

قائم چاندپوری۔

قسمت کی خوبی دیکھیئے ٹوٹی کہاں کمند ۔۔۔ دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

میر۔ کیا بھروسہ ہے زندگانی کا ۔۔۔ آدمی بلبلہ ہے پانی کا

مصحفی۔ کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار ۔۔۔ اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

ثاقب لکھنوی۔

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقتِ دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

اقبال۔ ناز ہے طاقت گفتار پہ انسانوں کو
بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

درد۔ وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

شیفتہ۔ ہم طالب شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام
بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

فانی۔ ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مرمر کے جئے جانے کا

فانی۔ اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

نامعلوم۔ یاد ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

ڈاکٹر تاثیر کے لفظوں میں ''شکار ماہ'' اور ''تسخیرِ آفتاب'' کا جو شعری انتخاب کا معرکہ برپا ہوا ہے اُس میں میر صاحب مرد میدان نظر آتے ہیں جن کی سخن گستری کا اعتراف جلال و ناسخ اور غالب جیسے اساتذۂ فن کے علاوہ ہر دور کے شعراء نے کیا ہے۔ لیکن میر کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا اس سے زیادہ انوکھا انداز ہماری نظر سے نہیں گزرا جیسا کہ راحت اندوری نے اختیار کیا اور جس کے انتخاب کی داد دینا فاضل مرتب کا حق ہے۔

یارو معاف میر کا میں معتقد نہیں
ایسی بھی کیا غزل کہ کلیجہ نکال لے

(جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۸ء)

انتہائے شب (شعری مجموعہ)

پرتو روہیلہ

حافظ کا شعر ہے:

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں　　که ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

فلک پر ناز اور اجرام فلکی پر حکمرانی تصور و تخیل کا فیضان اور اُس عالمِ سرشاری و سرمستی کے مرہونِ منت ایک ایسی کیفیت ہے جسے 'شاعری جزوے ست از پیغمبری' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گرامی کا درج ذیل شعر بھی اقبال کی نسبت اسی فکری ماورائیت کی جانب ایک بلیغ اشارہ ہے:

در دیدۂ معنی نگہاں حضرتِ اقبال　　پیغامبری کرد و پیمبر نتواں گفت

چنانچہ زیر نظر شعری مجموعہ 'انتہائے شب' کے مطالعہ سے شاعر کے جذبہ واحساس اور تخیل و تصور کی ہمہ گیریت کا بھرپور تاثر ملا جس کی برملا گواہی خود پرتو روہیلہ کے اس شعر میں ملتی ہے:

مجھے لگا کہ میں سلطانِ عصر ہوں پرتو　　مری رکاب میں دورِ زماں دکھائی دیا

پرتو کہ اقتدار کے ایوانوں میں مختار علی خاں کے نام سے جانے پہچانے گئے۔ افسری سے شاعری تک کے سفر میں یادگار سنگ ہائے میل تعمیر کر چکے ہیں۔ اُن کی مختلف زبانوں پر گرفت جن میں کثیر الجہت اردو کے علاوہ فارسی، ہندی اور سنسکرت بھی شامل ہیں اُن کا طرۂ امتیاز بن چکی ہے۔ وہ غالب کے شارح بھی ہیں اور مترجم بھی۔ ثانی الذکر حیثیت میں مکتوبات فارسی غالب کو اردو زبان کے قالب میں ڈھال کر عظیم علمی و ادبی کارنامہ سرانجام دیا ہے اور غالب کو جو فارسی اور اردو شعر کی پرشکوہ اقلیم کے تاجدار کی حیثیت سے اپنا نقشِ دوام لوحِ روزگار پر ثبت کر چکا تھا مزید امر بنا دیا ہے۔ فارسی شعر و ادب اُن کے کلام میں عکس زرنگار بن کر جھلکتے ہیں۔ اردو اور ہندی سنسکرت ہی نہیں بلکہ دیگر علاقائی زبانیں بھی ان کی شعری تخلیقات میں اسلوب و آہنگ کا دلپذیر تنوع بن کر نمایاں نظر آتی ہیں۔ اُن کی تصنیفِ تازہ کے تقریظ نگار حضرت احمد ندیم قاسمی

ان کے محاسن کا احاطہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اردو میں کم ہی شعراء کے ہاں موضوع و اُسلوب کا اتنا بھرپور تنوع دستیاب ہے۔ ان معنوں میں پرتو روہیلہ کی فنی حیثیت منفرد ہے۔''

دوم

''پرتو کا فن انسانی زندگی کی بوقلمونی کی نمائندگی کرتا ہے۔ اُن کے ہاں مشاہدات و تجربات کی ایک دنیا آباد ہے۔''

سوم

''اظہار کا یہ عالم ہے کہ وہ خالص ہندی اور اردو زبان کی نزاکتوں سے کام لینے کے علاوہ بعض پشتو اور پنجابی الفاظ بھی اتنی بے ساختگی اور روانی سے استعمال کر جاتا ہے کہ وہ اردو کا حصہ معلوم ہونے لگتے ہیں۔''

چہارم

''پرتو کی ساری شاعری اس کی ذاتی واردات کا اظہار ہے اور یہ اظہار بے تکلفانہ اور بے ساختہ ہے۔ اُس کا براہِ راست انداز دراصل براہِ راست دل میں اُتر جانے کا انداز ہے۔''

قاسمی صاحب نابغۂ روزگار شخصیت تھے چنانچہ ''مستند ہے اُنکا فرمایا ہوا'' اور اس سند کو اعتبار پرتو کا تازہ شعری مجموعہ ''انتہائے شب'' مہیا کرتا ہے کہ اس میں (۱) تنوع (۲) مشاہدات و تجربات کی وسعت (۳) لسانی کثیر الجہتی اور (۴) اسلوب و اظہار کا دل میں اُتر جانے والا بے تکلفانہ اور بیساختہ انداز بیک وقت عین السطور اور بین السطور برملا دکھائی دیتا ہے۔

کب تاب دید ہے کہ نظارہ کرے کوئی — نیرنگیٔ جہاں کا تماشہ کرے کوئی
ہر آرزو کہ ایک غزال رمیدہ ہے — کس کس کا دشتِ شوق میں پیچھا کرے کوئی
فرصت کہاں کہ لوحِ تصور پہ تیرا نقش — مژگان آرزو سے سنوارا کرے کوئی

مرا وجود تھا آوازِ زیرِ لب کی طرح
بساطِ وقت پہ اک آہِ بے سبب کی طرح

حریمِ دیدہ و دل میں حطیمِ خاطر میں
وہ گونجتا ہے سدا انتہائے شب کی طرح

مجھے بھی ساتھ ہی لے چل ہوائے کوئے سحر
کہ جل رہا ہوں چراغِ وداعِ شب کی طرح

جبیں کو ماہ کیا آنکھ کو ستارہ کیا
تو روشنی سے ترا حُسن استعارہ کیا

نگاہ اب بھی طلسماتِ نور میں گم ہے
جہانِ حسن کا اس رنگ میں نظارہ کیا

نکالی فال تو روئے نکو کے مصحف سے
رُخِ جمیل کی آیت سے استخارہ کیا

پرتو کا حُسنِ نگارش مرہونِ منت ہے اُن کے مطالعۂ فارسی کا جس کے متعلق غالب نے کہا تھا کہ ''فارسی بین تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ'' چنانچہ ''انتہائے شب'' ایسے نقش ہائے رنگ رنگ سے مرصع نظر آتا ہے۔ غزالِ رمیدہ لوحِ تصور، مژگانِ آرزو، آوازِ زیرِلب، آہ بے سبب، حریم دیدہ و دل، حطیم خاطر، چراغ وداعِ شب اور طلسمات نور وغیرہ ایسی پُرشکوہ تراکیب و اختراعات ہیں جو کلام کو حسنِ اسلوب ہی نہیں حسنِ معنی بھی عطا کرتی ہیں۔ استعارہ و تشبیہ اور کنایہ کا ایک جہان طلسمات ہے جو ازاول تا آخر کلام پرتو کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ایک خوبصورت مثال:

طلوعِ صبح کا منظر تھا اُس گریباں پر
میں سوچتا تھا کہ سورج کہاں دکھائی دیا

پرتو نے اپنے اس مجموعے کو دعائیہ، حمدیہ اور نعتیہ اشعار سے بھی سجایا ہے جو اُن کی حُریت فکر کے غماز ہیں۔ ملاحظہ ہوں

آئینہ خانے میں حیران کھڑا ہوں کب سے
مالکِ نطق مجھے قوتِ گویائی دے

کس کو معلوم ہے اور ننگِ زمانہ پرتو
کل سحر دم کسے آواز پذیرائی دے

یہ ہست و بود کی نیرنگیاں پکارتی ہیں
بہار تجھ سے خزاں تجھ سے، گلستاں تجھ سے

سعادتِ بشری کا وہؐ اسمِ اعظم ہیں
تمام عظمتیں منسوب اُنؐ کے نام کے ساتھ

''انتہائے شب'' کا شاعر جہاں باطنی تجربات اور قلبی واردات کی نزاکتوں اور لطافتوں کو شعری جمالیات کے قالب میں ڈھالنے پر پوری طرح قادر ہے وہیں وہ شعور و ادراک کو عصری تقاضوں سے بھی ہم آہنگ کیے ہوئے ہے۔ اُس کا فن تلخ و شیریں حقیقتوں کے موثر ابلاغ کی

پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ گل و یاسمن کے نہاں خانوں سے نکل کر صحرائے زندگی کے خارزاروں کو روندنا بھی جانتا ہے۔ ملاحظہ ہوں پرتو کے عصری شعور پر مبنی شعری زاوے:

در امید بھی جس سے نہ ہو سکا روشن	میں گم سوادِ نور سحر کو دیکھتا ہوں
خراب چشم نظارہ ہوں اسقدر پرتو	لگا کے آگ میں اب اپنے گھر کو دیکھتا ہوں
بشر میں بھی درندہ دیکھتے ہیں	خداوندا یہ ہم کیا دیکھتے ہیں
زمیں پر چل رہی ہے کالی آندھی	فلک سے خوں برستا دیکھتے ہیں
یہ ہم ہی ہیں مقابل آئینے کے	یہ ہم اپنا ہی چہرہ دیکھتے ہیں
شب گزرتی کیوں نہیں سورج نکلتا کیوں نہیں	درد پتھر بن گیا آخر پگھلتا کیوں نہیں
رات کی بے سمت گہرائی ہے پرتو اک سوال	صبح کے پیکر میں میرا خواب ڈھلتا کیوں نہیں
عجب جہان تضادات میرے اندر ہے	کہ ہونٹ خشک ہیں سینے میں اک سمندر ہے
نگار صبح کا چہرہ نظر نہیں آتا	فضائے عرصہ دوراں بڑی مکدّر ہے
رسولِ وقت ہوں پرتو یہ دیکھتا ہوں میں	اُفق پہ حشر کے دن کا عجیب منظر ہے

یہی نہیں بلکہ پرتو کی چشمِ بصیرت جو کچھ دیکھ رہی ہے وہ ''ساکنانِ دشتِ بلا'' کے لیے ایک انتباہ بھی ہے اور تحریک نظارہ بھی۔

اے ساکنانِ دشت بلا دیکھتے رہو	چلتی ہے کس طرف کی ہوا دیکھتے رہو
نخوت کے آسماں سے برہنہ زمین پر	گرتے ہیں اور کتنے خدا دیکھتے رہو

جیسا کہ جناب قاسمی نے پرتو کو کثیر النوع اور کثیر اللسان شاعر ٹھہرایا ہے۔ ویسا ہی اصناف شعری کا ایک دلربا نیرنگ ۳۲۷ صفحات پر مشتمل زیر نظر تصنیف میں ملتا ہے۔ پرتو کی حسنِ اسلوب اور حسنِ معنی سے مرصع آزاد و پابند نظمیں بھی 'انتہائے شب' میں خوبصورت چراغوں کی طرح ضیا بار ہیں مثلاً نظم بعنوان ''وہ سرو قامت و سرکشیدہ'' شاہکار نظم ہے۔ اسی طرح نظم بعنوان ''جگ روگ'' شاعر کی کثیر اللسانیت کی دلآویز مثال ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں

کوئی کپڑے بوٹے کاڑھے کوئی پھول بنائے　　کوئی اپنا بالک پالے کوئی گھر کو سجائے

کوئی بس آواز کے بل پر بجھتے دیپ جلائے　　کوئی رنگوں سے کاغذ اندر جیون جوت جگائے

اور اسی تمثیلی انداز کو آگے بڑھاتے ہوئے نظم کے مرکزی خیال کو آخری شعر میں یوں سموتے ہیں۔

ایک ہی سب کو روگ ہے پرتو ہر من کو برمائے　　کیسے کوئی دوجے کو نت اپنا آپ دکھائے

پرتو نے کتاب کے آخری صفحات ''دوہوں' کی نذر کیے ہیں جو اُن کے شاعرانہ تشخص کی ایک اہم جہت بھی ہیں اور قدرتِ کلام کا نمونہ بھی۔ آخر میں اُن کی غنائیت پرور فکر پر مبنی ایک مترنم بحر میں غزل سے چند اشعار پیش کرتا ہوں اور اجازت چاہتا ہوں۔

کسی حسینہ کی نوئی گاگر کے ٹھیکروں کی طرح ہیں ویراں
وہ لب کہ جن پر کبھی بہاروں کی پُرسکوں تازگی ملی ہے
کبھی جو ماضی کے پیراہن میں نے یاد کی الگنی پہ ڈالے
تو لمگجی ریشمی تہوں میں گلوں کی خوشبو بسی ملی ہے
سیاہ راتوں کی جدولوں پر بنوکِ مژگاں لکھا ہے میں نے
وہ اک فسانہ حقیقتوں کو بھی جس سے تابندگی ملی ہے

(اکتوبر۔دسمبر ۲۰۰۸ء)

مسلم شمیم۔ شخصیت وفن (مقالہ برائے ایم۔اے اردو)

شبنیلا نازنین

یہ رجحان کہ معاصر شخصیات کے فکر وفن پر نصابی مقالات لکھے جائیں ایک فال نیک بن کر سامنے آیا ہے۔ تاہم جامعات کے لیے لازم ہے کہ وہ علمی و تحقیقی معیار اور بامعنی اور مربوط مواد کی مقدار کو یقینی بنانے کے لیے ذمہ دارانہ کردار ادا کریں۔ اس ضمن میں ایسی نگارشات بھی ہمارے زیر مطالعہ آئیں جن سے معیار و مقدار دونوں اعتبار سے فکری و معنوی تہی دامنی کے سوا کوئی اور تاثر مرتب نہ ہو سکا لیکن کراچی یونیورسٹی کی طالبہ شبنیلا نازنین کا زیر نظر مقالہ اُن کی معیاری تحقیق اور کثیر الاوصاف ایسی شخصیت کے انتخاب پر ستائش کا مستحق ہے جو جامعہ کی طرف سے سند اعتبار عطا کرنے کا مکمل جواز مہیا کرتی ہے۔

موضوع تحقیق بنائے جانے والی شخصیت سے تعارف کا دعویٰ تو ہمیں بھی ہے اور مدت تعارف بھی کم و بیش چار دہائیوں پر محیط ہے لیکن تحقیقی مواد سامنے آنے کے بعد ہمیں اپنی بے خبری کا احساس ہوا کہ مسلم شمیم کی 'حیات زلزلہ پیا' کے احوال و آثار پر اگر کام نہ کیا جاتا تو معاصر ادبی تاریخ میں پیدا ہونے والا خلا مستقبل کے محققین کا زیاں بن کر رہ جاتا۔ مقالہ نگار کی درجِ ذیل تحریر سے اُن اکناف تحقیق کا اندازہ ہوتا ہے جن پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔

"مسلم شمیم مشہور قانون دان، سیاسیات کے سابق مُعلم، صحافی اور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین نقاد بھی ہیں۔ جدید اردو تنقید میں مسلم شمیم کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے ترقی پسند نقاد کی حیثیت سے تنقید کی ابتداء کی اور آج تک ترقی پسندیت کو اپنا نصب العین بنایا ہوا ہے۔"

شبنیلا نازنیں نے مسلم شمیم کے سن ولادت ۱۹۳۹ء سے سال رواں ۲۰۰۸ء تک ان کی متنوع الجہت زندگی کا پوری جُزرسی اور وقت نظر سے جائزہ لیا ہے اور بہار کی مردم خیز سرزمین کے

شہرۂ آفاق صدر مقام سے لے کر جسے تاریخ میں ابتداً پاٹلی پتر، مغل عہد میں عظیم آبادؔ اور فرنگی دور میں پٹنہ کا نام دیا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد سکھر، لاڑکانہ اور کراچی تک جو مسلم شمیم کی حیاتِ شعور و آگہی کے اہم سنگ ہائے میل ہیں اُن کے نظریاتی مسلک اور ادبی پرورش و تربیت پر حتی الامکان مصدقہ مواد پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ مسلم شمیم کی نظریاتی اساس کا مستحکم حوالہ اُن کے عہد طفلی میں پٹنہ کا وہ سماجی و معاشی نظام مہیا کرتا ہے جس میں کسان زمیندارانہ استحصال کا شکار تھا۔ مسلم شمیم نے اپنے والد کو کھیتوں میں خود ہل چلاتے ہوئے اور ایک ناآسودہ زندگی سے مسلسل نبرد آزما دیکھا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اُن کے ادبی سفر کا آغاز ہی منزل سے ہوا یعنی پٹنہ میں ایک صاحب علم و نظر شخصیت حمید عظیم آبادی کا وہ بوسیدہ سا مکان جسے 'حمید منزل' کہا جاتا تھا۔ یہاں مسلم شمیم نے صرف ابتدائی تعلیمی مراحل ہی طے نہیں کیے بلکہ یہیں اُن کا ادبی و شعری وجدان بھی متحرک ہوا۔ پٹنہ ہی کے ایک طرحی مشاعرہ میں اُن کے تعارف کا عنوان درج ذیل شعر بن گیا

دل بہل جائے گا دیکھیں گے تڑپتے جو مجھے　　　سیر کی سیر، عیادت کی عیادت ہو گی

لیکن جن عوامل نے مسلم شمیم کے ذہن پر گہرے نقوش مرتب کیے انہوں نے مسلم شمیم کو بحیثیت شاعر ترقی پسند تحریک کا حلقہ بگوش عقیدت بنا کر رکھ دیا۔ مقالہ نگار نے اس تحریک کے ابتداء و ارتقا کے ساتھ ساتھ اُن اسباب و عوامل پر بھی مبسوط بحث کی ہے جن کے باعث جنوبی ایشیاء کے ادب میں برپا ہونیوالا انقلاب مغرب کی مماثل تحریکوں سے مغلوب و متاثر نظر آنے لگا۔ مسلم شمیم نے اس منظرنامے کا عمیق و وسیع مطالعہ کیا تاہم ان کی ادبی سرشت کی تشکیل میں غیر شعوری طور پر سرزمین بہار کی اُن قد آور شخصیتوں کا فیضان شامل ہے جو لوح تاریخ پر اپنی ادبی عظمتوں کے نقوش دوام ثبت کر گئے ہیں۔ ان میں عبد القادر بیدل، شاد عظیم آبادی، سید امداد امام اثر اور بعد میں آنے والوں میں پروفیسر کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود، سید سلیمان ندوی، پروفیسر جمیل مظہری اور پروفیسر حسن عسکری جیسے جلیل القدر نام شامل ہیں۔ وہ عوامل جنہیں پٹنہ

کے عہد طفلی نے مسلم شمیم کے ذہن کو نظریاتی و فکری بنیادیں مہیا کیں ان کا معنوی تسلسل اُن کی بعد کی زندگی میں نمایاں نظر آتا ہے چنانچہ سندھ میں سکھر و لاڑکانہ کے دورانِ قیام ان کی ادبی سرگرمیاں دو تہذیبی امتزاج یعنی بھارت کی گنگا جمنی تہذیب اور پاکستان میں وادیٔ سندھ کی تہذیب وثقافت سے عبارت نظر آتی ہیں۔ حسن اتفاق کہ بچپن سے آغاز جوانی اور جوانی سے وسیع تجربہ ومشاہدہ پر محیط موجودہ عمر تک نظریاتی وادبی ارتقاء کی تمام کڑیاں ملتی چلی گئیں۔ سکھر میں دوران قیام اُن کے معاصرین بلکہ متاثرین ترقی پسند تحریک میں اُن کے استاد مکرم حمید عظیم آبادی جنہیں شاد عظیم آبادی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا کے صاحبزادے اشتراکیت پسند حسن حمیدی اور پیکر نقوی (مُدیر ہفت روزہ رہنما) کی رفاقت حاصل رہی جب کہ سکھر میں اُن کے صدر مدرس اور سندھی زبان کے ادیب شیخ عبدالرزاق راز کے علاوہ مقامی اہل قلم آفاق صدیقی، شوکت عابدی، مظہر جمیل اور نکہت بریلوی بھی ان کی ادبی فکر کی تشکیل میں ہمرکاب نظر آتے ہیں۔ نیز شیخ ایاز اور تنویر عباسی سے رابطے اُن کی زندگی کی جہتوں میں عکس ریز ہوئے۔ اُن کا یہ نظریاتی ارتقا اپنے نقطۂ عروج کو اُن کے لاڑکانہ کے دوران قیام پہنچا۔ جہاں وہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان سے اُس وقت وابستہ ہوئے جب وہ غیر قانونی اور زیر زمین پارٹی تھی چنانچہ وہ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۲ء تک ضلعی سطح پر پارٹی کے سیکرٹری رہے۔ لاڑکانہ میں اُن کی نظریاتی تعمیر وتشکیل میں جن شخصیات کی قربت نے کردار ادا کیا ان میں سوبھو گیان چندانی، سید جمال الدین بخاری اور حیدر بخش جتوئی شامل ہیں۔ مسلم شمیم اس عہد کو اپنی زندگی کا سنہرا دور قرار دیتے ہیں اور لاڑکانہ کو اپنی ''پریم بھومی اور گیان بھومی'' جب کہ پٹنہ بحکم قضا وقدر اُن کی ''جنم بھومی'' ٹھہرا۔

مقالہ نگار شبینا نازنین نے زیر تبصرہ کتاب کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے اور اپنے ممدوح کے احوال وآثار اور فکر وفن کا معتبر حوالوں اور اقتباسات سے کماحقہ احاطہ کیا ہے۔ آخر میں ایک نہایت جامع مجموعی محاکمہ بھی پیش کیا گیا ہے مسلم شمیم کی سندھ اور یہاں کی تہذیب ومعاشرت سے والہانہ وابستگی کا اندازہ مقالہ نگار کے ان الفاظ سے کیا جا سکتا ہے کہ انہیں ''سندھ محبتوں کی

سرزمین اور تہذیب وتمدن کا آسمان نظر آیا۔'' حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی سے اُن کی عقیدت اُن کے سندھی ادب کے مطالعہ کے رہینِ منت ہے۔ وہ متعدد کتب کے مولف و مصنف ہیں جن میں امکان (شعری مجموعہ) آدرش (مضامین و مقالات) شوکت عابدی (فن اور شخصیت) اور تناظر (نثری ادب) شامل ہیں اُن کے مزید نصف درجن مسوداتِ کتب زیرِ تدوین ہیں۔ جن میں ان کی خودنوشت پاتلی پترا سے موئن جوڈرو تک'' قابل ذکر ہے۔ مسلم شمیم نے اہم معاصر شخصیات پر ادبی رسائل وجرائد میں بکثرت لکھا ہے۔۔ سہ ماہی 'الاقرباء' میں بھی ان کی اہم نثری وشعری نگارشات شائع ہوتی رہی ہیں۔ حال ہی میں ہارورڈ یونیورسٹی (امریکہ) نے اپنے طلباء کے لیے 'الاقرباء' کے جن تحقیقی مقالات کو اپنے رواں نصابی پروگرام میں شامل کیا ہے اُن میں مسلم شمیم کا ایک مقالہ بھی شامل ہے۔ چنانچہ ان کے فکروفن کی ہمہ جہتی اور زندگی کے تلخ وشیریں تجربات کے پیش نظر کتاب کی مصنفہ نے سرِ آغاز کے طور پر اُن کا یہ شعر نقل کیا ہے

ایسے کئی مقام مری داستان میں ہیں　　جنت بدر ہوا کبھی مصلوب میں ہوا

(اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۸ء)

گلہائے رنگ رنگ (شعری مجموعہ)

محمد مسلم عظیم آبادی

جناب مسلم عظیم آبادی کا زیرِ نظر شعری مجموعہ ان کے فرزند محمد اسلم صاحب کا مرتّبہ ہے اور وہ خود ہی اس کے ناشر بھی ہیں۔ مسلم صاحب کا انتقال ۸۹ سال کی عمر میں ۱۹۷۷ء میں کراچی میں ہوا۔ مجھے شاید زندگی بھر یہ قلق رہے کہ میں کراچی میں ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۷ء تک چار برس کے قیام کے باوجود پروفیسر مسلم عظیم آبادی جیسے مسلّم الثبوت سکالر، محقق اور شاعر سے شرفِ نیاز حاصل نہ کر سکا حالانکہ تقریباً ہر ملاقات میں برادرِ محترم حمایت علی شاعر نہایت عقیدت وارادت سے ان کا ذکر کرتے اور میں ہر بار اپنے عہد کی اس ''گنجینۂ معارف'' شخصیت سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کرتا مگر ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ''

اب جبکہ ان کی وفات سے تین دہائیوں سے بھی متجاوز مدت کے بعد کم وبیش ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل اور پُروقار و دلکش طباعت سے مزین شعری مجموعہ میرے پیشِ نظر ہے۔ میرا احساسِ محرومی فزوں تر ہو گیا ہے۔ ''گلہائے رنگ رنگ'' ہی کے صفحات میں سید ابوالخیر کشفی پروفیسر مسلم عظیم آبادی کی شاعری پر بایں الفاظ تبصرہ فرماتے ہیں:

(الف) ''انہوں نے برعظیم جنوبی ایشیا کی تاریخ کے نہایت اہم دور دیکھے ادبی لحاظ سے بھی اور سیاسی اعتبار سے بھی۔''

(ب) ''مسلم صاحب شاعری میں شاد عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔ شاد اردو غزل کی پہلی مستند آواز ہیں۔ شاد نے حسرت موہانی اور فانی سے پہلے غزل کی تہذیب کی۔''

(ج) ''مسلم صاحب کے مجموعۂ کلام میں نظموں کی کثرت ہے لیکن غزلیں بھی موجود ہیں۔''

(د) ''۱۹۱۳ء میں ابھی حالی زندہ تھے اور انہی کی زندگی میں پروفیسر مسلم اور ظفر علی خان نے شاعری کی اس طرز کو آگے بڑھایا جس کا تحفہ حالی نے اردو شاعری کو دیا تھا۔''

(ہ) ''ان کے مجموعۂ کلام میں فطرت کے کتنے نقش اور مناظر سانس لیتے نظر آتے ہیں، ان نظموں میں فطرت کا حسن اور انسانی جذبات واحساسات ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ ورڈز ورتھ کی طرح مسلم صاحب بھی فطرت کے دست شفا کے قائل ہیں۔''

(و) 'مسلم صاحب کی بہت سی غزلوں میں تسلسل نظر آتا ہے۔ لہجے، مزاج، مضامین کا تسلسل اور اسی کے ساتھ ساتھ روحِ عصر بھی۔''

کشفی مرحوم نے مسلم صاحب کی شخصیت اور فکر وفن کے جو اوصاف بیان کیے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعۂ کلام ان کی سندِ شہادت مہیا کرتا ہے۔ مسلم صاحب کا سنِ ولادت ۱۸۸۸ء ہے اور پٹنہ یعنی عظیم آباد جو صوبۂ بہار جیسے مردم خیز خطۂ ارضی کا صدر مقام ہے مسلم صاحب کا مولد و مسکن بھی تھا۔ ۱۹۰۳ء سے برصغیر کے موقر ادبی رسائل وجرائد میں ان کی نگارشات کا آغاز ہو چکا تھا۔ 'قلم رانی' کا عہد سات دہائیوں سے بھی زیادہ مدت پر محیط ہے جو شاعری کے علاوہ افسانہ اور ڈرامہ نگاری' مضامین و مقالات نگاری اور تحقیق و تنقید پر مشتمل ہے۔ اپنے ایک تحقیقی کام ''تاریخِ معتقداتِ عجم'' کے بارے میں خود ارشاد فرماتے ہیں کہ ''تاریخ معتقداتِ عجم'' میری سالہا سال کی سعی اور دماغ سوزی کا نتیجہ ہے۔'' ان کے بارے میں ڈاکٹر محمد محسن پروفیسر پٹنہ کالج نے آل انڈیا ریڈیو سے اپنے ایک نشریے میں کہا تھا کہ ''غالباً بہار کے افسانہ نگاروں میں اوّلیت کا سہرا پروفیسر مسلم کے سر ہی رہے گا'' چنانچہ ان کی تصانیف میں اردو افسانوں اور ڈراموں کا مجموعہ بعنوان ''دعوتِ فکر'' شامل ہے۔ اس کے علاوہ فارسی زبان میں بھی ایک ڈرامہ بعنوان ''وکلاء مرافعہ'' انفرادی حیثیت کا حامل ہے۔ دیگر تصنیفات میں منجملہ دیگر نگارشات دو تحقیقی مقالات بعنوان ''فارسی علوم اور اسلام'' اور ''معتقداتِ عجم اور اسلام'' ان کے فکر وفن اور تحقیق کے شاہکار ہیں۔ مسلم صاحب نے نصابی و درسی کتب بھی لکھیں جن میں علم النحو پر ایک کتاب ''تحسیر النحو''

خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

زیرِ نظر مجموعے میں متعدد نظمیں ایسی ہیں جو نہ صرف حالی کے نظریۂ شعر کی ترجمان ہیں بلکہ بقول کشفی صاحب ورڈز ورتھ کی طرح 'فطرت کے دستِ شفا' پر جناب مسلم کے یقین و اعتماد کی مظہر ہیں، ملاحظہ ہوں ایک نظم بعنوان ''درخت'' سے تین شعر:

کہسار حریف صد چمن ہے　　جو پیڑ ہے سر و قد دلہن ہے
ہے سبز درخت کی جو کونپل　　ہر پنکھڑی اس کی سرخ مخمل
پوشاک ہری ہے، لال زیور　　اطلس پہ ٹکی ہے سرخ جھالر

ایک اور نظم ''بادلوں کی اٹکھیلیاں'' سے خوبصورت اقتباس:

دامن پہ بچھی ہے سبز مخمل　　اور چوٹی پہ کھیلتے ہیں بادل
اُجلے نیلے کبھی ہیں کالے　　یہ روئی کے نرم گرم گالے
ہیں کف بدہن گرج رہے ہیں　　یا طبل فلک پہ بج رہے ہیں

صنفِ غزل جس کی طرف بہ نسبت نظم مسلم صاحب کی توجہ کم نظر آتی ہے اپنے پورے کلاسیکی لوازمات اور آہنگ و اُسلوب کی رعنائی کے ساتھ ان کے کلام میں جلوہ بار ہے:

سب کچھ خرامِ ناز سے پامال کر گئے　　اک سیلِ کوہسار تھے آئے گزر گئے
جو خوگرِ جفا ہیں ستم دیدگانِ عشق　　دیکھی کبھی جو شکلِ مسرت تو ڈر گئے
کرم کہ آئے تم اور اشکِ غم بہا کے چلے　　ستم! کہ سوئی ہوئی حسرتیں جگا کے چلے
وہ چشمِ شوخ اور آنسو! نگاہِ یاس افسوس　　جو دل سے کھیلنے آئے تھے چوٹ کھا کے چلے
کیا ہے یاس نے آ آ کے بیقرار مجھے　　جہاں امید سے دیکھا ہے ہمکنار مجھے
بہت ہے میرے لئے اک یہی کرم تیرا　　تمام عمر جو رکھا امیدوار مجھے
اجل جو وادئ غربت سے لے چلی مجھ کو　　تو بیکسی مری تکتی تھی بار بار مجھے

مسلم عظیم آبادی کے فکر وفن کی جہتیں اور بھی ہیں جن پر پروفیسر کلیم الدین احمد جیسے معروضی

نقاد نے روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

(الف) ''محمد مسلم'' شاد کے شاگرد تھے۔ لیکن انہوں نے غزل گوئی سے زیادہ نظموں کی طرف توجہ کی۔ شاید وجہ یہ ہوئی کہ وہ انگریزوں کو اردو پڑھاتے تھے۔ اچھی انگریزی سیکھی اور انگریزی شاعری سے انہیں دلچسپی ہوگئی۔ دو نظمیں انگریزی نظموں کا آزاد ترجمہ ہیں ایک معرفتِ انسان، جس میں پوپ کی مشہور نظم 'The Essay on Man' کے کچھ بندوں کا ترجمہ کیا گیا ہے لیکن اس خوبی کے ساتھ کہ نظم ترجمہ معلوم نہیں ہوتی۔ اسی طرح 'عذرِ کاہلی' ٹینی سن کی نظم 'The Lotus Eaters' سے ماخوذ ہے۔

(ب) ہنگامی نظموں سے قطع نظر ان کی نظموں میں چار مختلف قسم کے دھاگے ملتے ہیں۔ ایک رنگِ غزلیت (Lyricism) ہے دوسرا منظر نگاری ہے۔ تیسرا فکر اور آزادیٔ فکر ہے۔ اور چوتھا طنز ہے۔ یہ رنگ الگ بھی نظر آتے ہیں اور کبھی ایک دوسرے میں اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ انہیں علیحدہ کرنا ممکن نہیں۔ لیریکل شاعری میں ان کی بہترین نظم ''ہاشم'' جو ایک مرثیہ (ELEGY) ہے۔ ایسا مختصر، جامع اور حسین مرثیہ اردو شاعری کے لیے انوکھی چیز ہے۔ دوسری نظم ''پھول اور ایک حسینہ'' ہے جس میں خیالات اور جذبات کے اتار چڑھاؤ کو حسن کارانہ طرز میں پیش کیا گیا ہے۔''

پروفیسر کلیم الدین کو ادبی تنقید کی روایت میں اس کے باوجود کہ انہوں نے غزل جیسی حسین ولطیف اور لازوال صنفِ سخن کو 'گردن زدنی' قرار دیا ایک قدآور نقاد کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ انہوں نے جس معروضی انداز میں جناب مسلم کی متنوع فکرِ شعری کا جائزہ لیا ہے اس کا حقیقی عکس ان کے کلام میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ملاحظہ ہوں نظم 'عذرِ کاہلی' سے تین اشعار:

ہروقت دھیمی دھیمی آوازِ آب جاری   اک کیفِ نیم خوابی رکھتی ہے ہم پہ طاری

یہ تھپکیاں صبا کی سبزے کا یہ بچھونا   پھیلا کے پاؤں اس پر راحت کی نیند سونا

دن کو لئے تصور کا دورِ جام رہنا　　　اور شب کو خوابِ شیریں سے شادکام رہنا

یہی روانی، حسن کاری اور آئینہ سازی کا ماہرانہ انداز نظم ''پھول اور ایک حسینہ'' میں بھی ملاحظہ کیجئے:

مشتاقِ چشم شوق ہے میری طرح سے تُو　　　انجام ایک دونوں کا اور ایک آرزو
دونوں کی منزل ایک ہے اور ایک جستجو　　　پھر آ' گلے لگا لوں' بنے کیوں رہیں عدو
ہمدوش مجھ سے تو' میں ہم آغوش یار سے
ارمان نکلیں دونوں کے ایک اس کے پیار سے

الیگزینڈر پوپ کی نظم کا ترجمہ ''معرفتِ انسان'' جو بقول پروفیسر کلیم ترجمہ معلوم نہیں ہوتا۔ جناب مسلم کی انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر مضبوط گرفت کا گواہ ہے:

نہ جانا آپ کو جس نے وہ ذاتِ حق کو کیا جانے　　　حقیقت کی طلب ہو جس کو وہ انساں کو پہچانے
جہالت اس کی فطرت اور عقل عرش پیما بھی　　　اگر برتر فرشتے سے تو حیواں کا نمونہ بھی
کبھی ہے نفس کا بندہ کبھی ایمان کا قائل　　　کبھی ہے روح کا منکر، کبھی شیطان کا قائل
نہیں کل کی خبر اور سو برس کے جمع ہیں ساماں　　　بڑا فرزانہ لیکن، ہے عجب صیدِ فریب انساں
یہ منصف حق و باطل کا خطاؤں کا خزانہ ہے　　　بڑے ہیں اس کے پھر بھی انسان اک معمہ ہے

مُرتّب نے بحیثیت فرزند، مسلم مرحوم کے مجموعۂ کلام کو حسنِ طباعت سے آراستہ کر کے عقیدت و محبت کا حق ادا کیا ہے۔ جس کے لئے وہ تحسین کے مستحق ہیں لیکن دورانِ مطالعہ تدوین و انتخاب کے جو معائب و نقائص بکثرت نظر آتے ہیں ان کے سبب کتاب کا معنوی حسن نہ صرف بُری طرح مجروح ہوا ہے بلکہ پروفیسر مسلم جیسے سکالر کے تصور شخصیت (image) اور ان کے علمی و ادبی مقام و منزلت کو بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ جس کی ذمہ داری بھی مرتب ہی پر عائد ہوتی ہے۔ پروفیسر مرحوم کے علم و دانش سے آگاہی رکھنے والا کوئی قاری یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ان کے کلام میں بحور و قوافی جیسے معائب سخن بکثرت پائے جائیں گے اور اصناف سخن کی ہیئت و ماہیت سے بے خبری ان کے کلام سے جگہ جگہ مترشح ہوگی جبکہ صرف و نحو اور عروض دانی میں

پروفیسر مسلم عظیم آبادی کا اسم گرامی سند سمجھا جاتا ہے۔ زیر نظر مجموعے میں غزلیات کو عنوان دے کران کے نظم ہونے کا گمراہ کن تاثر دیا گیا ہے (ص ۶۱، ۹۶، ۹۷، ۱۰۳، ۱۱۴، ۱۲۲، ۱۲۵، ۱۵۶، ۱۶۱، ۱۷۲، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۱، ۱۹۵، ۲۲۸) یہی نہیں بلکہ مرتب غزل میں مطلع کی تقدیم سے بھی بے خبر نظر آتے ہیں (ص ۵۸) اسی طرح ص ۱۰۴ پر بالکل مختلف الموضوع غزل کے تین اشعار کو بطور قطعہ پیش کیا گیا ہے۔ ص ...... نیز مطلع کے دونوں مصرعوں میں ایک ہی قافیہ کا ناقابلِ یقین نقص موجود ہے۔ ص ۱۰۸ پر رباعیات کے زیر عنوان ایک قطعہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ ص ۱۲۶ پر رباعیات کو ''بیٹیوں کی فریاد...... پردہ'' کے زیر عنوان بطور نظم پیش کیا گیا ہے۔ ص ۱۲۹ پر بے ربط مضامین پر مشتمل اشعار کو بعنوان ''ساس بہو'' شریک اشاعت کیا گیا ہے۔ ص ۱۵۱ پر غزل کو قطعات کا نام دے کر چھاپ دیا گیا ہے۔ ص ۱۷۳ پر قطعات کے زیر عنوان ایک قطعہ، ایک رباعی اور ایک مخمس کا بند پیش کر دیا گیا ہے۔ ص ۱۸۹ پر غزل کو قطعہ بند نظم کے طور پر لگا دیا گیا ہے۔ ص ۱۹۷ پر ایک قطعہ اور دو رباعیات کا عنوان 'قطعات' قائم کیا گیا ہے۔ ص ۲۲۵ پر قطعہ قوافی کے واضح نقص کے ساتھ چھپا ہے یعنی دُسن، چُمن کے ساتھ سُخن۔ ص ۲۳۳ پر دو رباعیات چار اشعار کی نظم کے طور پر پیش کر دی گئی ہیں۔ ص ۲۴۱ پر 'قطعہ' کے زیر عنوان تین رباعیات بھی شامل ہیں۔ ص ۲۴۷ پر طنزیہ اشعار ''غیر مطبوعہ'' کے زیر عنوان صرف تین مصرعے شائع کیے گئے ہیں۔ جگہ جگہ ناموزوں مصرعے نظر آتے ہیں۔

یہ امثلہ صرف ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے طور پر ہیں جو نہایت تکلیف دہ ہیں اور مرتب کی شعر و ادب سے یکسر بے خبری کی گواہ۔ انہیں چاہیے تھا کہ علمی اور فنی رہنمائی کے لیے اگر ''بیرون خانہ'' جانے ہی سے انہیں احتراز تھا تو 'درونِ در' ہی اپنے فرزندِ نسبتی ڈاکٹر محمد معز الدین ہی سے رجوع فرما لیتے جنہیں زیر نظر مجموعے ہی میں جناب مسلم نے شعری خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

مرحبا ڈاکٹر معز الدین جسد البحر، کوہِ علم و وقار

(جنوری۔ مارچ ۲۰۰۹ء)

بام اندیشہ (غزلیات)

امین راحت چغتائی

اندیشہ ہائے دور و دراز ہوں کہ اندیشہ ہائے قریب و قریں، جب وہ کسی بھی صاحبِ خیر و خبر یا اہلِ علم و دانش کی گرفت میں آتے ہیں تو امر بن جاتے ہیں۔ امین راحت چغتائی صحافی بھی ہیں اور ادیب بھی، شاعر بھی ہیں اور محقق بھی۔ اُن کی تازہ شعری تصنیف ''بامِ اندیشہ'' گزشتہ نصف درجن تصانیفِ نظم و نثر کا علمی و فنی تسلسل ہے اور قارئین کے لیے تالیفِ قلب کا باعث۔ ان کا یہ زیرِ نظر شعری مجموعہ اُنکے ادراک و احساس کا حقیقی ترجمان ہے اور برملا زمینی حقائق پر صرف حکیمانہ نقد و نظر ہی کا شاہکار نہیں بلکہ رجائیت کی خوشبو سے مہکتا ہوا پیغام بھی ہے جس کو عنوان ان کے حُبِّ وطن نے عطا کیا ہے۔ چغتائی صاحب نے اپنی تعقل سرشت حسیّات اور معاشرتی بصیرتوں کا یہ ارمغان ہمیں درجِ ذیل شعر کے ساتھ عطیہ کیا جسے کتاب کے مندرجات کا موثر ترین محرّک کہا جاسکتا ہے:

بایں گردِ علائق نیست ممکن چشم وا کردن　　　جنوں بر عالمے پازد کہ من بیدار گردیدم

گرد و پیش کے حالات و واقعات کی اُڑتی ہوئی دھول میں آنکھ کھولنا واقعی ممکن نہیں رہا چنانچہ جنونِ احساس کی ایک ہی مہمیز نے شاعر کی خفتہ بصیرتوں کو بیدار کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

کسی جبیں پہ شکن آئے کوئی برہم ہو　　　زبانِ خلق پہ جو کچھ ہے وہ سناتا جا
ملیں گے آگ کے دریا بھی راہِ منزل میں　　　مسافروں کے مگر حوصلے بڑھاتا جا
یہ کائنات تو جولانگہِ تفکر ہے　　　حجاب عقل کے جتنے ہیں سب اُٹھاتا جا

یہی وجہ ہے کہ کتاب میں ''پیش گفتار'' کے زیرِ عنوان خواجہ محمد زکریا فرماتے ہیں:

''امین راحت چغتائی کی شاعری پاکستان کے موجودہ مسائل کی سمت رہنمائی کرتی

ہے......غزل کی روایت کا انہوں نے وسیع مطالعہ کر رکھا ہے۔ وہ میر و مصحفی کے مداح ہیں......امیجری، استعارہ اور لفظی تلازمات کی مدد سے شعریت پیدا کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔''

یہ کہ امین راحت کی شاعری میں ''سمت نمائی' کا وصف، غزل کی روایت کا شعور نیز امیجری، استعارہ اور لفظی تلازمات کے ذریعہ شعریت پیدا کرنے کی سعی کامیاب کارفرما ہے اس کا واضح ثبوت درجِ ذیل اشعار مہیا کرتے ہیں اور شاعر کی فکری وفنی صلاحیتوں کے عکاس ہیں:

بادِ صبا چلی ہے طلوعِ سحر کے ساتھ
دامن سمٹ رہا ہے اندھیرے کی رات کا

اب کے زمیں کے مشورے ہونگے زمین پر
راحت بہت قریب ہے لمحہ نجات کا

ہم سے طلوعِ صبح کا منظر نہ پوچھئے
جیسے ہو روشنی میں اندھیرا ملا ہوا

اپنی تو زندگی یونہی راحت گزر گئی
جیسے ہوا کے رُخ پہ دیا ہو جلا ہو

شب زدوں کے لیے یہ کوئی خبر ہو کہ نہو
آفتاب ابھرے گا سودائے سحر ہو کہ نہو

آؤ اک بار صدا کر کے ذرا دیکھیں تو
شام ڈھلنے کو ہے پھر وا کوئی در ہو کہ نہو

وہ بھی کہلائے میر مے خانہ
جو صراحی نہ جام سے واقف

اہلِ محفل میں کوئی تو ہوتا
گردشِ صبح و شام سے واقف

کہا ہے جو بھی دل نے وہ کیا ہے
دیا رُخ پر ہوا کے رکھ دیا ہے

وہی لوٹا رہے ہیں آج تجھ کو
زمانے تو نے جو ہم کو دیا ہے

'بام اندیشہ' کے شاعر یاسیت کے شاعر نہیں اور لگتا ہے کہ وہ انگریزی شاعری کے اس قول سے بھی متفق نہیں کہ ''ہمارے شیریں ترین نعمات وہ ہیں جو غم واندوہ کے مظہر ہیں''۔ وہ قلم کو جبر کے خلاف ایک موثر طاقت سمجھتے ہیں اور اُس کے دانشورانہ اور فنکارانہ استعمال پر قادر ہیں۔ امین راحت کی شاعری جہاں مہذب فکر اور شائستہ روّیوں کی ترجمان ہے وہیں اخلاقی جرأت و بیباکی

بھی اس کا اہم وصف ہے۔ وہ ظلم سہنے اور احتجاج نہ کرنے کو بزدلی سمجھتے ہیں اور وہ اعلیٰ اقدار حیات جو اُن کے نصاب زندگی کا سرچشمۂ عمل ہیں وہی اُن کی شاعری میں بھی منعکس دکھائی دیتی ہیں۔ وہ اختلافِ رائے کے حق پر اصرار کرنا بھی جانتے ہیں اور ہم قلم اہلِ فکر و دانش سے مخاطب ہو کر حق و صداقت کو درپیش چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ اُن کے عصری شعور کا یہ برملا پہلو ہی 'بام اندیشہ' کی شناخت بن گیا ہے:

ہمیں تو کل بھی رہا اُن سے اختلافِ نظر
ہم اپنے جرم کا کرتے ہیں آج بھی اقرار

پھر اُس پہ عہد ریا میں جہاد لازم ہے
قلم میں ہو جو نہاں وصفِ تیغ جوہر دار

جلال عصر سے مرعوب ہوں وہ کیا راحت
جو اپنے ساتھ لیے پھر رہے ہیں چوب دار

جن کی آنکھوں میں سحر کا نور ہو الجھیں گے کیا
شوق سے زلفِ سیاہِ شب کو برہم کیجئے

ظلمتِ شب میں بھی جو صبح کے امکاں دیکھے
اُس کا ایماں کوئی دیکھے، کوئی ایقاں دیکھے

ہم نہوں تو رونقِ بزم جہاں کچھ بھی نہیں
قلقلِ مینا، در پیر مغاں کچھ بھی نہیں

جرأتِ پرواز ہو تو بام و در سب زیر پا
اوج و پستی کیا، زمین و آسماں کچھ بھی نہیں

ہم قلم دوستوں کو ہم قدم بنانے کی آرزو بھی 'بامِ اندیشہ' کے شاعر کے دل میں کروٹیں لیتی دکھائی دیتی ہے:

پھر دیکھ دل کا بوجھ اترتا ہے یا نہیں
جو روز دیکھتا ہے تماشا، رقم تو کر

پھر دیکھ کج کلاہوں کے گرتے ہوئے کلاہ
اپنے مشاہدات سپردِ قلم تو کر

اور ضمیر باختہ اہل دانش پر بھی نگاہ تحقیر ڈالتے ہیں:

ایسے بھی اربابِ دانش تھے سرِ اقلیم علم
روشنی کے باب میں جو تیرگی لکھتے رہے

'بامِ اندیشہ' کے فلیپ نگار جناب فرمان فتحپوری بھی چغتائی صاحب کی صحتِ غزل اور زمان و مکاں پر فکری گرفت کے معترف نظر آتے ہیں:

''غمِ کائنات دراصل شعورِ زندگی کا دوسرا نام ہے اور چغتائی کی غزل اس لحاظ سے صحت مند ماضی، حال کے اضطراب اور مستقبل کے امکانات کی امین ہے۔''

چنانچہ ملاحظہ ہو فکرِ راحت میں تغزل کا، سحر بھی اور وارداتِ قلبی کے اظہار کے والہانہ اُسلوب بھی:

فیصلہ کرنے سے پہلے اپنی ہمت دیکھ لو　　اتنا آساں بھی نہیں ملنا بچھڑ جانے کے بعد

انجمن انجمن شناسائی　　پھر بھی دل کی گئی نہ تنہائی

ہم کہاں دامِ گُل میں آتے تھے　　تیری خوشبو چمن میں لے آئی

بایں ہمہ 'بامِ اندیشہ' کا مجموعی آہنگ جارحانہ دانش اور پیغاماتِ بین السطور کا غماز ہے:

اختلافاتِ نظر ہیں کوئی توہین نہیں　　جان لو ہم بھی اک اندازِ نظر رکھتے ہیں

(جنوری۔ مارچ ۲۰۰۹ء)

متاعِ آخرت (حمد و نعت اور سلام و منقبت پر مشتمل شعری مجموعہ)

منظر ایوبی

پانچ عدد شعری و نثری مجموعوں کے خالق و مصنف، ادبی محفلوں کی رونق اور مشاعروں کے مطلوب و محبوب مترنم شاعر جناب منظر ایوبی سے راقم الحروف کا مجلسی تعارف و تعلق چار دہائیوں پر محیط ہے چنانچہ اُن کی خوش کلامی (خوش الحانی سے قطع نظر) اور شعری سلیقہ و ہنر مندی کا جو تاثر حافظے کا اثاثہ ہے اُسے اُن کا زیرِ نظر تازہ شعری مجموعہ جو حمد و نعت اور سلام و منقبت پر مشتمل ہے نہ صرف سندِ تصدیق بلکہ سندِ اعتبار بھی عطا کرتا ہے۔ حمد و نعت گوئی کا منصب جہاں قابلِ رشک ہے وہاں نہایت حزم و احتیاط اور سراسر تحریم و تکریم کا بھی متقاضی ہے۔ غالب نے کہا تھا کہ:

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم   کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

چنانچہ مدّاح کا ممدوح کا حقِ توصیف ادا کرنا جو رب العالمین اور رحمت اللعالمینؐ ہوں واقعی بصارت و بصیرت اور علم و دانش کا امتحان بھی ہے اور سعادتِ توفیقِ ایزدی بھی۔ منظر ایوبی کے زیرِ نظر بیشتر کلام کو پڑھ کر محسوس ہوا کہ اللہ نے اُنہیں خشوع و خضوع کے اوصاف سے بھی نوازا ہے اور خوبصورت شعری صلاحیتیں بھی ودیعت فرمائی ہیں۔ آغازِ کلام کے طور پر 'مناجات' کے زیرِ عنوان جو اشعار انہوں نے رقم کیے ہیں وہ لفظ و معنی پر اُن کی قادرانہ گرفت کے مظہر ہیں۔ صرف دو اشعار سے اندازہ کیا جا سکتا ہے:

میں بندہ تُو رب میرا   تجھ سے نام و نسب میرا
جان و تن کا حاکم تُو   میں فانی اور دائم تُو

تمام 'حمد' سلاست و روانی کا شاہکار ہے۔ کتاب کا حُسنِ ترتیب بھی متاثر کن ہے۔ کتاب میں صاحبِ کتاب نے نعت گوئی کے ایک نہایت اہم پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اب وقت ہے کہ حضور اکرمؐ کو اپنی شاعری میں 'بشرِ کامل' کے روپ میں بھی پیش کیا

جائے...... بہ الفاظ دیگر مذہبی موضوعات کو مرکزِ فکر بنانے والے اپنے ممدوحؐ کی سراپا نگاری پر اکتفانہ کریں بلکہ کردار، عمل اور سیرت اقدس کے اُن پہلوؤں کو بھی اُجاگر کریں جنکی تقلید و اتباع سے معاشرہ کی تطہیر اور سماج میں تغیر ممکن ہو۔''

چنانچہ پچاس سے متجاوز نعتوں میں جو شریک اشاعت ہیں شاعر نے منجملہ دیگر موضوعات متذکرہ پہلو کو بھی اپنی نعت میں شامل کیا ہے:

ماہیٔ بے آب کو آبِ رواں بخشا گیا　　رحمت اللعالمینؐ کا آستاں بخشا گیا
جس کی چاہت اک نمونہ جس کی شفقت اک مثال　　ہم گنہگاروں کو ایسا مہرباں بخشا گیا
رہ روانِ راہِ حق کی خوش نصیبی پر نثار　　مصطفٰےؐ جیسا امیرِ کارواں بخشا گیا
جس کی دانائی کے آگے گنگ تھے اہلِ زباں　　اُن کو حرفِ حق کا کیسا ترجماں بخشا گیا

ازل سے تا حشر ایک منظر زمیں سے تا عرش اک فضا ہے　　جہاں خدا ہے وہاں نبیؐ ہیں جہاں نبیؐ ہیں وہاں خدا ہے
محبتیں بے حساب ان کی نوازشیں بے شمار ان کی　　نہ ان کے لطف و کرم کی حد ہے نہ ان کی بخشش کی انتہا ہے

اساسِ فکر وہی جانِ شاعری ہیں وہی　　مرا شعور وہی میری آگہی ہیں وہی
زمانہ کتنے ہی سورج تراش لے منظر　　ہمارے واسطے ایماں کی روشنی ہیں وہی

منظر ایوبی کا اسلوبِ نگارش حمد و نعت کے منظر نامے میں عموماً والہانہ جذبات اور ارادت مندانہ اُسلوب سے مملو نظر آتا ہے۔ شائستگی و شیفتگی اُن کا نمایاں وصف ہے۔ حمد کا اُسلوب ملاحظہ ہو:

پہلے دلوں کو خوگرِ صدق و صفا کرو　　پھر لا کہہ بار دعوئ عشق خدا کرو
مختارِ روز و شب ہے وہ آقائے جسم و جاں　　ہر حال میں اُسی کا وظیفہ پڑھا کرو

اسی تناظر میں منظر کا تصورِ نعت بھی دیکھیئے:

ثوابِ مدحتِ سرکار دو جہاںؐ لوگو　　دل و نگاہ کی پاکیزگی سے ملتا ہے
یوں اُبھرتا ہے اُن کا تصور　　پھول صحرا میں جیسے کِھلا ہو

تشبیہ و استعارہ کا یہ لطیف و جمیل انداز ''متاعِ آخرت'' کے شاعر کے ہاں اکثر و بیشتر ملتا ہے

یہی نہیں ''قرآن'' کے باب میں جو اشعار کہے گئے ہیں اُن میں بھی نعتیہ پہلو نمایاں ہے:

قرآن بھی کیا معجزۂ حرف و صدا ہے لہجے میں محمدؐ کے خدا بول رہا ہے

اسی طرح نعت میں بھی حمدیہ یا دعائیہ انداز شاعر کی فکرِ بلیغ کا ترجمان ہے:

جو ایک نعت بھی آقاؐ قبول ہو جائے تمام عمر کی محنت وصول ہو جائے
کوئی دعا نہیں سرکارؐ اِس دعا کے سوا کہ جو دعا بھی میں مانگوں قبول ہو جائے
شفاعت کی تمنا ہے تو سرکارِؐ دو عالم سے غلامی کی سند لے کر چلو میدانِ محشر میں

''متاعِ آخرت'' سلام و مناقب کے گلہائے عقیدت سے بھی مزین ہے۔ اصنافِ سخن پر شاعر کی گرفت تجربہ و مہارت پر دلالت کرتی ہے۔ نظمِ آزاد میں ایک بند ملاحظہ ہو:

وہ خواجگی کے مہیب اندھیروں میں
روشنی کے عظیم پیکر
وہ کاروانِ جہادِ حق کے
عظیم رہبر
فضائے جنگ و جدال میں وہ
خلوص و مہر و وفا کے مظہر
وہ امن اور آشتی کے خوگر
وہ عدل و انصاف کے پیمبر
سلام اُن پر، سلام اُن پر

اور اب ''متاعِ آخرت'' کا ایک منفرد پہلو جو شاعر کے عجز اور عالی ظرفی کا بالواسطہ اظہار ہے جس کا ثبوت درجِ ذیل عبارت سے ملتا ہے:

''قارئینِ کرام! موضوعی اعتبار ہی سے نہیں اسلوبیاتی لحاظ سے بھی (شعری لوازمات اور فنی ضوابط کی روشنی میں) جہاں اور جس جگہ فنی سقم محسوس کریں تو نشان دہی ضرور

فرمائیں۔''

چنانچہ 'زرہِ امتثالِ امر' بھی راقم الحروف پہ لازم ہو گیا ہے کہ جہاں جہاں اس نوع کا احساس پیدا ہوا ہے اس کی نشان دہی خلوصِ نیت سے کر دی جائے اور وہ بھی اس گزارش کے ساتھ کہ تسامحات کی نشان دہی میں سہو راقم الحروف سے بھی سرزد ہو سکتا ہے۔

۱۔ (ص ۱۶۰) رباعی منسوب بہ حضرت جعفر صادقؒ جسے قطعہ کے طور پر شامل کیا گیا:

سرچشمۂ برکات ہیں جعفر صادقؒ دریائے ہدایات ہیں جعفر صادقؒ
کس فکر کو بخشی نہ انہوں نے صورت مجموعۂ صفات ہیں جعفر صادقؒ

مذکورہ رباعی میں لفظ 'برکات' میں حرف 'ر' متحرک ہونا چاہیئے جبکہ اسے ساکن نظم کیا گیا ہے۔ آخری مصرع میں لفظ 'صفات' سے مصرع بے وزن ہو گیا ہے۔ یہ غالباً سہو ہے (یہاں لفظ 'اوصاف' ہو تو نقص دور ہو جاتا ہے لیکن قافیہ کی پابندی کے سبب ایسا بھی ممکن نہیں......)

۲۔ (ص۔۱۵۶) قطعہ (پہلا شعر)

کس لیے آنکھ دکھاتے ہیں زمانے والے گرد آلود سہی جیب و گریباں میرا

محاورہ 'آنکھ دکھانا' نہیں 'آنکھیں دکھانا' ہے۔ اسی طرح ''جیب و گریباں'' صیغۂ جمع میں ہیں جبکہ اُنہیں صیغۂ واحد میں نظم کیا گیا ہے۔

۳۔ (ص۔۱۴۸) منقبت منسوب بہ حضرت بی بی زینبؑ (آخری شعر)

نہ فکرِ نان و شکم ہے نہ خوفِ جاں منظر بنا ہوں جب سے تمہارا قصیدہ خواں زینبؑ

شعر میں 'شترگربگی' کا نقص ہے جسے شاعر کے تخلص ''منظر'' کو لفظ ''مجھ کو'' سے تبدیل کر کے دور کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ (ص۔۱۴۵) منقبت منسوب بہ سردارِ شہیدانِ کربلا (پانچواں شعر)

ٹھہر سکے گی کسی پل نہ انقلاب کی رو لئیمِ وقت سنبھل میرِ کارواں ہیں حسینؑ

لگتا ہے کہ یہاں 'لعین' کی جگہ 'لئیم' کا لفظ سہواً لکھا گیا ہے کیونکہ دونوں لفظوں کے معنی

میں بُعد المشرقین ہے۔

۵۔ (ص۔۱۲۴) منقبت منسوب بہ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ (تیسرا شعر)

سبق ملا ہے یہ کردارِ مصطفیٰؐ سے ہمیں کٹھن ہو راہ مگر حوصلے جواں رکھنا

مصرعۂ اول اقبالؒ کے معروف ترین مصرع 'سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے' سے ماخوذ ہے بہتر ہوتا کہ فاضل صاحبِ کتاب یہ مصرع تبدیل فرما دیتے۔

۶۔ (ص۔۱۱۵) نعت کا پانچواں شعر:

نازل ہوئی کتابِ حق جس کی دلیل کے لیے ذاتِ نبیؐ پاک وہ مجموعۂ صفات ہے

مصرع ثانی میں 'مجموعۂ صفات' کے الفاظ نے مصرع کو خارج از وزن کر دیا ہے۔ یقیناً یہ سہو ہے۔

۷۔ (ص۔۱۱۲) نعت کا تیسرا شعر

لفظی ترکیب 'روحِ رواں' نہیں۔ 'روح و رواں' ہے۔ بظاہر یہ پروف خوانی کا سہو معلوم ہوتا ہے۔

۸۔ (ص۔۹۴) نعت کا پہلا شعر۔

نہ پوچھو کہ دل کو مرے کیا ہوا ہے دیارِ حبیبِ خدا ہو گیا ہے

شعر خصوصاً مصرع اول فاضل صاحبِ کتاب کے شعری دنیا میں تجربہ و مہارت کے شایانِ شان نہیں۔

۹۔ (ص۔۸۶) نعت کا چھٹا شعر:

آنکھوں میں کوئی خواب نہ دل میں کوئی اُمنگ کس درجہ فیضیاب ہیں اپنے نبیؐ سے ہم

شعر سے (نعوذ باللہ) منفی تاثر قائم ہوتا ہے۔ خاص طور پر 'فیضیاب' کا لفظ (خاکم بدہن) طنز یہ لگتا ہے حالانکہ شاعر کا مدعا یہ ہے کہ درِ نبیؐ سے فیضیاب ہونے کے بعد ہر آرزو کی تکمیل ہو گئی لیکن لفظی ابہام نے شعر کو نظرِ ثانی کا محتاج بنا دیا ہے۔

۱۰۔ (ص۔۷۵) نعت کا پہلا شعر

مرا محورِ عقیدت نہیں اور کوئی محمدؐ دمِ اولیں محمدؐ، دمِ آخری محمدؐ

شعری ثقاہت وفصاحت کے لیے مناسب ہوگا اگر فاضل صاحبِ کتاب مصرعۂ اول پر نظرِ ثانی فرمالیں۔

۱۱۔ (ص۔۷۶) نعت کا آخری شعر:

مجھے اپنی فردِ عصیاں پہ نہیں کوئی ندامت سرِ حشر ہونگے منظر مرے روبرو محمدؐ

بخشش کا امیدوار ہونا تو ہر مسلمان کا جزوِ ایمان ہے لیکن فردِ عصیاں پر ندامت نہ ہونا محلِ نظر ہے، ہمیں یقین ہے کہ فاضل صاحبِ کتاب اِس شعر کو ہرگز اپنے شعری مجموعے میں شامل نہ کرتے اگر حافظہ حضرت علامہ اقبالؒ کے درجِ ذیل دعائیہ مقطع کی طرف رہنمائی کردیتا۔

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر روزِ محشر عذر ہائے من پذیر

ورحسابم را بہ بینی ناگزیر از نگاہِ مصطفےٰؐ پنہاں بگیر

۱۲۔ (ص۔۶۹) نعت کا چوتھا شعر

سجدہ ریزی کے لیے پہنچا ہی تھا ارضِ حجاز میری پابوسی کو آئے تھے مہکتے راستے

ایک روایتی غزل جس میں محبوبِ مجازی کے نقشِ پا کے احترام میں یہ شعر کہا گیا تھا کہ:

اُس نقشِ پا کی بے ادبی کا یہ ڈر مجھے میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

جبکہ دیارِ حبیبؐ خدا کے احترام وتقدس کے پیشِ نظر یہ تصور ہی زائرین حرمین کو لرزہ بر اندام کردیتا ہے کہ اس سرزمین مبارکہ کی خاک میں ایسے خوش نصیب ذرات بھی ہو سکتے ہیں جنھیں سرورِ کائنات کے قدوم میمنت لزوم نے شرفِ لمس عطا کیا ہو چنانچہ اِس تصور ہی سے اہل ایمان کے دلوں میں سر کے بل چلنے کی خواہش ہیجان برپا کردیتی ہے۔ نہ جانے کیسے شاعرِ 'متاعِ آخرت' کے قلم سے سوئے ادب پر مبنی درجہ بالا شعر سرزد ہوگیا نعوذ باللہ من ذالک۔

۱۳۔ (ص۔۳۲) مدحتِ قرآن (دوسرا شعر)

خلق خدا کی خدمت قرآن سے عیاں ہے   بخشش کسی کی لوگو کب رائیگاں گئی ہے

اولاً 'بخشش' اور 'خدمت' میں کوئی معنوی ربط نظر نہیں آ رہا۔ دوم اساتذۂ فن شعر نے مطلع کے علاوہ کسی بھی شعر کے مصرع اول کے اختتام پر ردیف کے جزوِ آخر کے استعمال کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔ اس نقص سے مصرع اول کے الفاظ میں تقدیم و تاخیر کے ردوبدل کے ذریعہ بچا جا سکتا تھا۔ یعنی:

خلقِ خدا کی خدمت قرآن سے عیاں ہے   کب رائیگاں گئی ہے بخشش کسی کی لوگو

۱۴۔ (ص۔۲۳) حمد کا پہلا شعر:

بندے کی کیا مجال کسی کی ثنا کرے   جب تک کہ وہ زباں کو نہ طاقت عطا کرے

شعر میں ممدوح ذاتِ خداوندی ہے اور لفظ 'کسی' معنوی تعمیم پیدا کر دیتا ہے لہٰذا یہ نقص جو سہواً نظر آتا ہے نہایت خفیف سی ترمیم سے دور ہو سکتا ہے۔ یعنی:

بندے کی کیا مجال کہ اُس کی ثنا کرے   جب تک کہ وہ زباں کو نہ طاقت عطا کرے

(جنوری۔مارچ ۲۰۰۹ء)

رہنمائے سخن

پروفیسر ڈاکٹر محمد معز الدین

علم البیان، علم بدیع اور علم عروض کے مبادیات و مصطلحات کے مفاہیم و معنی اور شعری توضیحات و امثلہ پر مشتمل درسی و نصابی نقطۂ نظر سے لکھی جانے والی زیر نظر کتاب ''رہنمائے سخن'' کے مؤلف پروفیسر ڈاکٹر محمد معز الدین ہیں جو بین الاقوامی شناخت کے حامل سکالر اور محقق و نقاد کی حیثیت سے کیمبرج یونیورسٹی میں ''مسند اقبال'' (Iqbal Chair) پر صدر نشین کے منصبِ فاخرہ پر دو سال سے زیادہ مدت تک متمکن رہ چکے ہیں۔ قبل ازیں آپ نے لندن یونیورسٹی سے لسانیات جدید (Modren Linguistics/ Phonetics) میں ایم۔ فل کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد اس شعبہ میں اپنی دانش و بصیرت کے سبب وہ شہرت حاصل کی کہ اہلِ علم و خبر کی نظر میں پایۂ استناد کو پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب ڈھاکہ یونیورسٹی میں ادبیات اردو کے پروفیسر کے منصب پر بھی فائز رہے۔ جہاں آپ کو پروفیسر ڈاکٹر عندلیب شادانی جیسی معارف پرور شخصیت کی رفاقت و رہنمائی کا شرف حاصل ہوا چنانچہ ''رہنمائے سخن'' پر ڈاکٹر شادانی مرحوم کا یہ ارشاد کہ ''یہ رسالہ فی الحقیقت اسم بامسمٰی ہے۔ کالج کے طالب علموں کے لیے بھی اور اس فن سے دلچسپی رکھنے والے دوسرے حضرات کے لیے بھی'' زیر تبصرہ تالیف کو سندِ افتخار و اعتبار عطا کرتا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد معز الدین کی یہ تالیف پہلی بار ۱۹۶۰ء منصۂ شہود پر آئی جب وہ جگن ناتھ کالج ڈھاکہ کے شعبہ اردو و فارسی سے وابستہ تھے اور انہوں نے محسوس کیا کہ اعلیٰ ثانوی اور ڈگری کی سطح کے طلباء کو ایسی کتاب کی اشد ضرورت ہے جن کے نصاب میں فنِ عروض شامل ہے۔ لہٰذا بحیثیت ناشر نیشنل بک فاؤنڈیشن کا یہ دعویٰ درست نہیں کہ ۲۰۰۹ء کی اشاعت پہلا ایڈیشن ہے۔ علاوہ ازیں ناشر نے ''جملہ حقوق محفوظ ہیں'' لکھ دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ شرط بھی عائد فرمادی کہ ''یہ کتاب یا اس کا کوئی حصہ کسی بھی شکل میں ناشر کی تحریری رضامندی کے بغیر نقل

نہ کیا جائے'' چنانچہ راقم الحروف کو ۲۰۰۹ء کے تازہ ایڈیشن پر نہیں بلکہ ڈھاکہ میں طبع ہونے والے نسخہ پر انحصار کرنا پڑ رہا ہے تاکہ کسی بھی نوع کی قانونی چپقلش سے محفوظ رہا جاسکے ویسے بھی فن شعر کے موضوع پر اس اہم تالیف کے املا و انشاء کو ناشر ادارے نے جس ناواجب سلوک کا مستحق ٹھہرایا ہے وہ محلِ نظر بھی ہے اور افسوسناک بھی۔

زیر تبصرہ کتاب ۱۴ ابواب پر مشتمل ہے جن میں علم البیان۔ علم بدیع۔ قافیہ و ردیف۔ عیوب کلام۔ مصطلحاتِ شعر۔ علم عروض۔ بحور و زحافات اور اوزان رباعی پر بھی ابواب شامل ہیں۔ جنہیں طلبائے فن عروض کی تسہیل و تفہیم کے لیے اردو اور فارسی شاعری سے بکثرت اَمثلہ شریکِ متن کر کے اور بھی دلکش و مستند بنا دیا گیا ہے۔ کتاب مصطلحات و اصنافِ سخن کی جامع تعریف اور امتحانی مشقوں سے بھی آراستہ ہے۔ مثلاً علم البیان کے ضمن میں تشبیہ و استعارہ، کنایہ اور مجازِ مرسل کے ساتھ ساتھ علم بدیع کے باب میں صنائع معنوی کی پچیس اقسام پر بحث کی گئی ہے جن میں صنعتِ تضاد۔ مراعاۃ النظیر۔ ایہام۔ لف و نشر۔ مبالغہ۔ حشو۔ تلمیح اور توجیہہ وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح صنائع لفظی کے حوالے سے تجنیس اور اس کی اقسام صنعت اشتقاق۔ تکرار۔ لزوم۔ سجع۔ تنسیق الصفات۔ توشیخ۔ صنعتِ سیاق الاعداد اور صنعت متلون کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ قافیہ و ردیف کی فنی وضاحتوں کے ساتھ عیوبِ کلام مثلاً تعقید۔ حشو و زوائد۔ شتر گربہ۔ تنافر۔ تناقض۔ ابتذال اور سرقہ و توارد کی برمحل مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ مصطلحاتِ شعر پر فاضل مؤلف نے خصوصی توجہ دی ہے اور جن اصنافِ سخن کا احاطہ کیا ہے ان میں قصیدہ۔ غزل۔ قطعہ۔ رباعی۔ مثنوی۔ مرثیہ۔ نوحہ۔ مسمّط۔ مثلث۔ مربع۔ مخمس۔ مسدس۔ واسوخت۔ مدح و سلام کے ساتھ ساتھ نظم آزاد و نظم معریٰ اور دیگر اقسام و مصطلحات شعر مثلاً ریختہ۔ ریختی۔ شہر آشوب۔ ہجو۔ مزاح۔ ہزل۔ خمریات۔ جنسیات۔ سہل ممتنع اور تضمین وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ البتہ ریختی کے ضمن میں ''زنانے جذبات'' کی ترکیب نہ معلوم کیوں استعمال کی گئی ہے حالانکہ اس سے ''تیسری جنس'' کا حوالہ ملتا ہے نہ کہ نسوانی جذبات کا۔

علمِ عروض کے باب میں فاضل موئف نے طلباء و قارئین کو مطلوب و مقصود مواد مہیا فرمایا ہے جو فنی بصیرت پیدا کرنے کا موجب ہو سکتا ہے۔ علم عروض کی جامع تعریف کے ساتھ شعر کے لغوی معنی اور ارا کانِ بحر کو دلنشین پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ تقطیع کے ضمن میں قواعدِ تقطیع مفرد (سات عدد) اور مرکب (تین عدد) بحروں سے تسہیلِ فہم کے لیے شعری امثلہ کا سہارا لیا گیا ہے نیز زحافات کا تصور واضح کرتے ہوئے سالم و مزاحف بحروں کی مثالیں پیش کی گئی ہیں اور کثیر الاستعمال بحروں کے نمونے اساتذہ کے کلام سے دیئے گئے ہیں البتہ رباعی کے حوالے سے جو مفصل باب رقم کیا گیا ہے وہ نہایت اہم ہے کہ یہ صنف سخن عربی الاصل ہونے کے باوجود عجمی مزاج و آہنگ اپنا چکی ہے۔ بحر ہزج (مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن) پر اس صنف سخن کی بنیاد ضرور استوار ہوئی ہے لیکن اِس بحر سے ماخوذ اوزان کی تعداد دو درجن ہے تاہم شعراء میں اوزان کی خاصی کم تعداد استعمال میں رہی ہے۔ کتاب میں جہاں رباعیات کے نمونے معہ تقطیع پیش کیے گئے ہیں وہاں حالی کی رباعی کے الفاظ سہو کا شکار ہو گئے ہیں۔ اصل رباعی اس طرح ہے:۔

دنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھو   رودادِ جہاں کو ایک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا   ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو

سات صفحات پر مشتمل کتاب کا اشاریہ فاضل مولف کی سعیٔ بلیغ کا مظہر ہے۔ کم و بیش نصف صدی قبل مولفہ زیرِ نظر کتاب ایک ایسے عہد کی یاد تازہ کرتی ہے۔ جب علم و فن کو نظام معارف میں اولین ترجیح حاصل تھی۔ علم عروض کے بغیر السنۂ شرقیہ کے نصاب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا یا آج زوال و انحطاط کا عمل پستی کی اُس نہج تک پہنچ چکا ہے جہاں شاعر اور ناقد دونوں ہی فنی نراجیت کا شکار ہو چکے ہیں اور مستثنیات سے قطع نظر ہماری شاعری کا منظر نامہ بُری طرح دھندلا چکا ہے۔ نہ اب کوئی مولوی نجم الغنی کی ''بحرِ الفصاحت'' کو جانتا ہے نہ حسرت موہانی کی ''نکاتِ سخن'' کو۔ تاہم گزشتہ چھ سات دہائیوں میں مروجہ اصنافِ سخن میں لہجہ و اسلوب اور

موضوعات ومعانی کی جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ نیز فنی اقدار میں تحریف وترمیم کے جو تجربات کیے گئے ہیں اُن کے پیش نظر اور غیر ملکی اصنافِ سخن کی درآمدی یلغار کے نتیجہ میں مرتب ہونے والے اثرات کا احاطہ کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ''رہنمائے سخن'' کے صاحب بصیرت مولف کتاب کے موضوعات کو عصری معنویت سے ہم آہنگ کرتے تا کہ کتاب درسی ونصابی مبادیات سے بلند تر ہو کر عہدِ موجود کے تقاضوں کا موثر علمی وفنی ردِعمل پیش کر سکتی۔ ہمیں یقین ہے کہ پروفیسر ڈاکٹر محمد معزالدین جنہیں پروفیسر مسلم عظیم آبادی جیسی نابغہ روزگار شخصیت نے اپنی ایک تہنیتی نظم میں 'جسد البحر' اور 'کوہِ علم وقار' جیسے خطابات سے متصف فرمایا ہے وہ ایک سعی مکرر کے ذریعے یقیناً اس چیلنج کا جواب دے سکیں گے۔

ایسا کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ متعدد غیر ملکی اصنافِ سخن گذشتہ نصف صدی یا اس سے بھی زیادہ مدت میں اردو شاعری میں راہ پا چکی ہیں اس حقیقت کی طرف ایک واضح اشارہ خود زیرِ نظر تالیف میں نظم آزاد اور نظم معریٰ کی صورت میں موجود ہے جنہیں انگریزی شاعری میں علی الترتیب (Free Verse) اور (Blank-Verse) کا نام دیا گیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو شاعری میں موخر الذکر کی پذیرائی انگریزی ادب کے عظیم نقاد جانسن کی درج ذیل واضح اور دوٹوک رائے کے باوجود ہوئی:۔

" The disgust which blank verse surperads to an un-pleasing subject repels the reader, howsoever, willing to be pleased."

بہر حال حقیقت یہ ہے کہ اردو شاعری میں نظم معریٰ کے حوالے سے جو تجربات کیے گئے ان میں ہیئت واسلوب دونوں ہی میں نکھار پیدا ہوا ہر چند کہ یہ ہر شاعر کی انفرادی کاوش پر موقوف ہے مثلاً تین تین مصرعوں پر مشتمل نظم معریٰ کا یہ انداز داد طلب ہے جسے جاں نثار اختر نے اپنی تخلیقی کاوش کا جامہ پہنایا:

یہ ترے پیار کی خوشبو سے مہکتی ہوئی رات
اپنے سینے میں چھپائے ترے دل کی دھڑکن
آج پھر تیری ادا سے مرے پاس آئی ہے

کتنے لمحے کہ غمِ زیست کے طوفانوں میں
زندگانی کی جلاتے ہوئے باغی مشعل
تو مرا عزمِ جواں بن کے مرے ساتھ رہی

اسی طرح آزاد نظم میں بھی جو تجربات کیے گئے ان میں آزاد نظم عروض کی پابندی سے کہیں انحراف نہیں کرتی۔ یہ کسی نہ کسی بحر اور مخصوص وزن میں ہوتی ہے البتہ ارکان کسی مصرعہ میں زیادہ ہوتے ہیں کسی میں کم۔ ہائی کو (HICO) بھی جاپان کی ایک شعری صنف ہے جسے اردو میں پذیرائی ملی اور خصوصاً حمایت علی شاعر نے اسے ثلاثی کا نام دے کر بامِ شہرت پر پہنچا دیا۔ جعفر طاہر 'کینٹو' کے اردو شاعری میں نقیب ٹھہرے اور محسن بھوپالی نے تثلیث نگاری کو ''نظمانے'' سے تعبیر کیا:۔

محوِ حیرت رہ گیا میں دیکھ کر
لاش کی ٹھنڈی کلائی کے قریب
ہنس رہی تھی عمر کی لمبی لکیر (محسن)

ڈاکٹر صاحب کو عصرِ حاضر کے شعری رجحانات میں فنی تبدیلیوں کا بالخصوص جائزہ لینا ہوگا اور ہیئت وصنف کو جس طرح خلط ملط کر دیا گیا ہے اُسے درست کرنا ہوگا اور اس تناظر میں کہ اردو شاعری غزل و نظم پر مشتمل ایک اقلیم سخن ہے واضح کرنا ہوگا کہ غزل ایک صنفِ سخن ہونے کے باوجود دوسری اصناف سخن مثلاً قصیدہ۔ نظم۔ مرثیہ۔ واسوخت۔ شہر آشوب وغیرہ میں ایک قدرِ مشترک بن گئی ہے اسی طرح نظم موضوع کی وحدت کے ساتھ ایک اہم صنفِ سخن ہے لیکن

غزل اور مثنوی کی طرح کسی مخصوص ہیئت کی پابند نہیں اردو شاعری کی مختلف اصناف کو نظم ہی کی مختلف اشکال سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ مولانا حالی کی نظم ''مدو جزر اسلام'' جو مسدسِ حالی کے نام سے معروف ہے وہ بہ اعتبارِ ہیئت مسدس ہے چنانچہ ہیئت و اصناف کا یہ الجھاؤ اردو شاعری میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ انیس و دبیر کے مرثیے مسدس کی شکل میں ہیں جب کہ غالب نے عارف کے مرثیے کو غزل کی ہیئت میں رکھا۔ حالی نے غالب کا مرثیہ ترکیب بند کی شکل میں نظم کیا جب کہ اقبال نے ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' جو مرثیہ لکھا اُسے بعض نقادوں نے مثنویوں کے زمرے میں شامل کر دیا۔ بہر حال یہ اور ایسے ہی دیگر شعری تغیرات و تجربات ڈاکٹر محمد معز الدین کی مطلوبہ کاوش کے محرکات قرار پا سکتے ہیں۔

(اپریل۔ جون ۲۰۰۹ء)

اردو غزل کا تکنیکی، ہیئتی اور عروضی جائزہ

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد

زیر تبصرہ کتاب مصنف کا پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ ہے۔ جس پر انہیں جامعہ پنجاب نے ڈگری عطا کی۔ موضوع کے اعتبار سے نہایت اہم کہ عروض کو دور حاضر میں جنس کمیاب ہی نہیں بلکہ عہد فراموش کے عبرتناک انجام سے دوچار کر دیا گیا ہے اس تناظر میں تجزیہ و تحقیق کا سفرِ مراجعت حال و مستقبل کے شعری رجحانات کو تخلیقی فکر اور صحت فن کی جانب راغب کرنے کی ایک مبارک کاوش ہے۔ بدقسمتی سے غزل فکر و فن کے صدیوں پر محیط ارتقائی عمل سے گزر کر ایسے ادراک و شعور باختہ اذہان کی یرغمالی بن کر رہ گئی ہے جو نہ مطالعہ سے بہرہ مند ہیں نہ تجربہ و مشاہدہ میں مطلوب ژرف نگاہی سے متصف۔ تاہم غنیمت ہیں وہ حلقہ بگوشان غزل جنہوں نے اپنی فراست اور علمی و فنی بصیرت سے اس ''عروس دائم البہار'' کو بامعنی جہتوں اور خرد افروز وسعتوں سے ہمکنار کیا نیز غزل کو تجربہ و مشاہدہ کی نادرہ کاریوں کا ایک ایسا متحرک پیکر عطا کیا جو اس صنف کے بنیادی مزاج سے ہم آہنگ فنی و موضوعاتی تنوعات کے انجذاب کی پوری صلاحیت رکھتا ہے ہر چند مقدار کے مقابل معیار کے محرکات محدود ہیں لیکن یہی غزل کی حیات جاوداں کے ضامن ہیں۔

''پیش گفتار'' کے زیر عنوان مصنف نے نصف درجن ابواب پر مشتمل اپنے مقالے کے عنوانات سے متعارف کرایا ہے جن کا جواز ان کے اس نقطہ نظر سے مہیا ہوتا ہے کہ ''ہمارے ہاں عام طور پر غزل کا فکری پہلو ہی گفتگو کا موضوع رہا ہے اور اس کے فن پر بہت کم توجہ دی گئی ہے'' حالانکہ اشاریہ و کتابیات پر مشتمل طویل فہرست جہاں اُن کی بسیط و عمیق تحقیق کی نشان دہی کرتی ہے وہیں یہ ثبوت بھی فراہم کرتی ہے کہ غزل کا ماضی فکری و فنی ہر دو اعتبار سے متمول بھی ہے اور ایک توانا تہذیبی روایت کا شاہکار بھی۔ ڈاکٹر ناشاد نے نہایت خوش سلیقگی سے متن مقالہ کی تلخیص پیش کی ہے یعنی پہلا باب تکنیک اور عروض کے تعارف پر مشتمل ہے۔ دوسرے باب میں

حالی سے قبل کا فنی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں مصنف نے حالی سے اقبال تک کی غزل پر بحث کی ہے باب چہارم جدید غزل کے فنی مطالعہ پر محیط ہے جبکہ پانچواں اور چھٹا باب علی الترتیب جدید تر غزل کی ہیئتی۔ تکنیکی نیز عروضی مطالعہ اور غزل کے مستقبل کے جائزہ پر مشتمل ہے۔ مصنف نے پورے عجز و احترام کے ساتھ ان معارف پر وز ہستیوں کی نسبت اظہار تشکر کا فریضہ ادا کیا ہے جن کی علمی رہنمائی انھیں حاصل رہی۔ ان ہستیوں میں جناب عبدالعزیز خالد، ڈاکٹر فرمان فتحپوری اور دیگر کے علاوہ نگران مقالہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی شامل ہیں۔

شعر کے عناصر ترکیبی کو فکری اور فنی حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے صاحب مقالہ نے بجا طور پر کہا کہ ''فنون لطیفہ کا تکنیکی جوہر تخیل کی جلوہ گری سے نمو پذیر ہوتا ہے'' اور اس ضمن میں جو حوالے دیئے ہیں ان میں سید عابد علی عابد سے منسوب حوالہ نہایت جامع ہے:

> ''الفاظ اور معانی دراصل نفسیاتی طور پر ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں ایک ہی تصویر کے دو پہلو ہیں معانی کو الفاظ سے اس لیے جدا نہیں کیا جا سکتا کہ معانی کا تصور ذہن میں الفاظ کے بغیر ممکن ہی نہیں''

ڈاکٹر ناشاد نے شعری تکنیک کے ظاہری عناصر اور لفظیات کے انتخاب کے علاوہ عروض کے مآخذ اور تاریخی پس منظر پر متعدد حوالے پیش کیے ہیں جن سے ان کی کاوش کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے تاہم ان کے اس خیال سے کامل اتفاق ممکن نہیں کہ غزل کو صنف قرار دینے کے بجائے ہئیت کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے اور یہ کہ ہئیت کی کوئی جامع تعریف نہیں کی جا سکتی اس ضمن میں وہ اپنے مقالے کو کثیر الحوالہ بنانے کی کوشش میں معنوی تضادات کا شکار ہو گئے ہیں ہئیت و صنف سخن کی نسبت یہ خیال زیادہ قرین حقیقت ہے کہ ہر صنف سخن ایک مخصوص ہئیت رکھتی ہے جبکہ ہر ہئیت کا صنف سخن ہونا ضروری نہیں مثلاً غزل ایک صنف سخن ہے اور ایک مخصوص ہئیت کی حامل بھی جبکہ نظم کسی مخصوص ہئیت کی پابند نہیں چنانچہ نظم میں صرف غزل و مثنوی ہی کی مخصوص ہئیت ہی استعمال نہیں کی گئی بلکہ نظم دیگر اصناف سخن کی ہئیتوں سے بھی استفادہ کرتی رہی ہے۔

زیر نظر تالیف جو تقریباً پونے چار سو صفحات پر مشتمل ہے صاحب مقالہ کے بسیط و عمیق موضوعی مطالعہ کی غماز ہے۔ انہوں نے عربی و فارسی کے تاسیسی پس منظر کے حوالے سے اردو غزل میں عروض کی کارفرمائی کا جائزہ لیتے ہوئے مختلف ادوار میں نمایاں شعری شخصیات مثلاً امیر خسرو، شیخ ناصر علی سرہندی، حسن شوقی، قلی قطب شاہ، ولی دکنی اور انکے معاصرین فراقی اور داؤد اورنگ آبادی وغیرہ تک تین صدیوں کے دوران فکر و فن کے نمائندہ ارتقائی نکات پر توجہ مرکوز کی ہے۔ البتہ اس کے ساتھ ممتاز شعراء کے حوالے سے صنفی ارتقاء کے تناظر کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ سودا کے قصیدوں اور قطعہ بند غزلوں، درد کے متصوفانہ کلام اور میر کو ایک عظیم ترین معمار سخن کی حیثیت سے اجاگر کیا گیا ہے۔ عہد مغلیہ کے آخری دور میں شعراء کے دہلی سے ہجرت کے بعد لکھنو کے نئے دبستان شعر کے موسسین مصحفی، انشاء اور جرأت کے بعد ناسخ و آتش کے شعری رویوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نظیر اکبر آبادی کو مولف نے دہلی و لکھنو کے دبستانوں سے ماورا مقام پر رکھا ہے چنانچہ اردو غزل کی ہیئت و ماہیت کا یہ سفر غالب کے عہد میں پہنچ کر اجتہادی اختصاص حاصل کر لیتا ہے جس کے فروغ و ارتقا میں غالب و مومن ان کے معاصرین اور تلامذہ فکر و فن نے نمایاں کردار ادا کیا۔

حالی سے اقبال تک غزل کا فنی سفر ایک نمایاں تبدیلی کا سفر ہے جس کا بنیادی سبب بقول مؤلف یہ ہے کہ ''حالی نے اردو شعر و ادب کو نئے ماحول سے ہم آہنگ کرنے میں اہم کردار ادا کیا'' جسے علی گڑھ اور انجمن پنجاب کی تحریکیوں سے تقویت ملی تاہم ایک متوازی رنگ سخن بھی اپنی پوری آب و تاب سے شعری منظر نامے پر جلوہ ریز رہا جس کو روایتی اسلوب غزل اور کلاسیکی اقدار شعری نے بنیاد مہیا کی تھی مؤلف نے اگرچہ اس عہد کے متوازی دھاروں کو ''تنگنائے غزل'' میں یکجا کرنے کی واضح کوشش کی ہے اور جلال نیز امیر و داغ اور ان کے تلامذہ نے معاصر شعری رجحانات کو جس طرح متاثر کیا ہے اس سے صرف نظر تو نہیں کیا تاہم جہاں ایک طرف وحید الدین سلیم پانی پتی پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نظم طباطبائی۔ تاجور نجیب آبادی اور ایسی ہی دیگر

شخصیات کے ''غزل دشمنی'' کے رجحان کی نشان دہی کرنا محل نظر ہے وہیں مکتب داغ و امیر کے متعدد نامور شعراء کے ذکر سے پہلوتہی کرنا اردو ادب کی مسلمہ واقعاتی صداقتوں سے چشم پوشی کے مترادف ہے جس کے سبب کوئی بھی تحقیقی مواد نامکمل سمجھا جائے گا مثلاً تلامذۂ داغ میں سائل ۔ بیخود ۔ احسن ۔ نوح ۔ نسیم بھرت پوری ۔ جوش ملسیانی اور آغا شاعر وغیرہ ایسے معمولی نام نہیں کہ جنہیں نظرانداز کیا جاسکے اسی طرح امیر مینائی کے سلسلہ تلمّذ سے وابستہ ریاض خیرآبادی جلیل مانک پوری اور محسن کاکوروی وغیرہ کے اسماء بھی ناقابل فراموش ہیں ۔ غزل کے فکری و فنی ارتقاء میں ان بزرگوں کے نمایاں کردار سے انکار ممکن نہیں تاہم حضرت علامہ اقبال کی مرکزی شخصیت اور ان کی ذہنی نشوونما میں حالی و اکبر کے شعری نظریات اور فکری رویوں نے جو اثرات مرتب کیے ان پر ڈاکٹر ناشاد نے وقیع تجزیاتی کام کیا ہے او بجا طور پر کہا ہے کہ:

> ''اقبال کی غزل کے تکنیکی عناصر میں زبان کا معجزانہ استعمال سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اقبال نے اردو غزل کو ایک بلند آہنگ اور پُر جلال اسلوب سے روشناس کرایا......
>
> اقبال بحروں کے مزاج اور ان کی مخصوص خاصیتوں کا گہرا شعور رکھتے تھے''

اپنے مبسوط مقالے میں صاحبِ مقالہ نے ''جدید اردو غزل کا فنی سراپا'' کے زیرِ عنوان جو بحث کی ہے وہ وقیع تحقیقی مواد کی حامل ہے البتہ ''نئے عبوری دور'' کے شعراء (عبوری دور کی اصطلاح وضاحت طلب ہے) حسرت ۔ فانی ۔ یگانہ ۔ اصغر کے ساتھ فراق کو جدید غزل کے معمار کے طور پر پیش کیا گیا ہے لیکن جوش پر یہ الزام کہ انکی ''غزل دشمنی دراصل غزل کے مزاج سے ان کی ناواقفیت کا نتیجہ ہے ۔'' خود جوش کی شاعری کی عدم تفہیم کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ غزل پر بطور صنف سخن جوش کے اعتراضات اپنی جگہ لیکن غزل کے مزاج سے جوش کی ناواقفیت کا الزام ایک تدبر گریز جسارت ہے جس کا موثر جواب کسی تفصیل میں جائے بغیر (جس کا محل نہیں) جوش کے درج ذیل صرف ایک شعر کی تفہیم پر موقوف ہے جو شاعر کی غزل کے مزاج پر حاکمانہ گرفت کا ثبوت ہے ۔

ہر ایک کانٹے پہ سرخ کرنیں کلی کلی میں چراغ روشن
خیال میں مسکرانے والے ترا تبسم کہاں نہیں ہے

اسی تسلسل میں ایک اور جگہ صاحب مقالہ کا یہ کہنا کہ ''عدم کی غزل گھسے پٹے موضوعات اور فرسودہ و پامال لفظیات کی حامل ہے۔'' ہمارے خیال میں یہ ایک جارُوبی انداز تنقید ہے جو کسی بھی تحقیقی کام کے سیاق وسباق میں اجنبی دکھائی دیتا ہے۔ کیا عدم کے درج ذیل شعر میں ''گناہ شبنم وخورشید'' کی خوبصورت ترکیب شاعر کی تازہ کاری اور جدت فکر کا ثبوت فراہم نہیں کرتی؟

ترے وصال کی امید کر رہا ہوں میں   گناہ شبنم و خورشید کر رہا ہوں میں

۱۹۳۶ء میں شروع ہونے والی ترقی پسند تحریک پر مولف نے خاصی توجہ مرکوز کی ہے اور اس تحریک سے وابستہ شعرا کے زیر استعمال اُن الفاظ وتراکیب پر اپنا نقطہ نظر واضح کیا ہے جنہیں وہ نامانوس اجنبی اور غیر غزلیہ سمجھتے ہیں۔ ''غیر غزلیہ'' کی وضع اصطلاح تو مولف کی اپنی صوابدید ہے لیکن ہم ان سے اس حد تک متفق ہیں کہ غزل کے مزاج وآہنگ سے متصادم الفاظ کا استعمال غزل کی روح کو مجروح کرنے کے مترادف ہے اور ترقی پسند تحریک ہی نہیں بلکہ یہ انداز نگارش رکھنے والے شعراء جن کی تعداد عدم مطالعہ اور ذہنی سطحیت کے باعث بالخصوص عہد موجود میں مسلسل روبہ اضافہ ہے کسی سنجیدہ تحقیق کا ہدف بننے کے ہرگز سزاوار نہیں اور اگر وہ اپنے شعری مجموعوں کو خود ''رطب ویابسِ'' کا نام دیتے ہیں تو ہمیں ان کی حقیقت پسندی کا اعتراف کرنا چاہیے زیر تبصرہ کتاب میں ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق سے وابستہ غزل گو شعراء کے ضمن میں فیض وندیم کی کثیر البحر شاعری اور ناصر کاظمی کے ہاں ان کے تنوع کی طرف اشارے کتاب کے موضوع کو نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیتے اسی طرح پچاس اور ساٹھ کی دہائیوں میں شعری منظر نامے کو جلا بخشنے والوں میں جو نام شامل ہیں ان میں ابن انشاء۔ باقی صدیقی۔ شان الحق حقّی۔ صبا اکبر آبادی۔ عدم۔ عابد علی عابد اور جمیل الدین عالی کے اسماء یقیناً اہم ہیں البتہ اس کے بعد شعر وسخن کا معیار بتدریج نہیں بلکہ بسرعت روبہ انحطاط نظر آتا ہے سوائے اُن مستثنیات کے جن

میں چند پر دین شاکر جیسے نام شامل ہیں ہمیں ڈاکٹر ناشاد سے مکمل اتفاق ہے جب وہ اپنی تحقیق سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

''اس دور میں آزاد غزل۔ معریٰ غزل اور نثری غزل جیسے ہیئتی ڈھانچے وجود میں آئے جن سے غزل کا تشخص مجروح ہوا پاکستان میں آزاد غزل کی اولین جھلک ظفر اقبال کے شعری مجموع ''رطب ویابس'' میں دکھائی دیتی ہے۔''

بہر حال ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کی زیر نظر علمی کاوش وقیع بھی ہے۔ مبسوط بھی اور ان کے انفرادی نقطہ ہائے نظر کی عکاس بھی جن سے اختلاف تو ہوسکتا ہے لیکن انہیں یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ سزاوار تہنیت ہیں کہ انہوں نے ایک ایسے موضوع کو ہدف تحقیق بنایا جس کی آگہی بالخصوص نئی نسل کے لیے از بس ضروری ہے۔

(جولائی۔ستمبر ۲۰۰۹ء)

اور تنکے بکھر گئے

عمرانہ معز

اصناف شعر ہوں کہ اصناف نثر، ان سب ہی شعبوں میں موضوعی اور فنی اعتبار سے سرعت پذیر تبدیلی کا ایک مسلسل عمل اس قدر واضح اور نمایاں ہے کہ ناقدین اور مبصرین کے لیے اکثر شعری اور نثری تخلیقات کی صنفی حیثیتوں کا تعین کرنا خاصا دشوار کام ہوگیا ہے۔ جس طرح شاعری کی اصناف اضافوں اور تبدیلیوں کے ارتقائی مرحلوں سے گزری ہیں اور گزر رہی ہیں بجنسہ، دیگر اصناف ادب بھی خواہ وہ کہانی یا افسانہ ہوں، ڈرامہ یا ناول ہوں یا کوئی بھی نو تصنیف نثری نگارشات، تبدیلی کے اس ہمہ گیر عمل سے نہ ماورا ہیں اور نہ مستثنیٰ۔

محترمہ عمرانہ معز کی تازہ نثری تخلیق ''اور تنکے بکھر گئے......'' اپنی فنی جہتوں اور موضوعی نادرہ کاری کے تناظر میں نیز زبان اور بیان کے اسالیب اور جذبات و احساسات کی انوکھی اور مسحور کن ترجمانی کے پیش نظر مجھے ایک ''ناولٹ'' کے مروجہ خدو خال سے پوری طرح مرصع نظر آئی۔ موضوع کے اعتبار سے بھی اسے سقوط ڈھاکہ کے بعد تخلیق ہونے والے ادب میں بجا طور پر ایک شاہکار قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ ناولٹ اپنی تاثراتی وحدت کے ساتھ ساتھ، جسے ایک عظیم سانحے نے جنم دیا، اپنے جلو میں ایسی جزئیات بھی لیے ہوئے ہے جن میں تہذیب و معاشرت کے نقوش بھی دیکھے جاسکتے ہیں اور انسانی رویوں کے جبلّی مظاہر بھی۔ یہ دل ہی نہیں روح کی گہرائیوں میں اتر جانے والا ایسا بیانیہ ہے جسے تاریخ کی پیشانی پر رقم کر کے مصنفہ نے معاشرتی المیوں کو زبان عطا کی ہے۔ پاکستان کے نظریاتی تشخص کو جیتے جاگتے کرداروں کے روپ میں ڈھال دیا ہے۔ اور ''بے مہری سیاست دوراں'' کے ہاتھوں پامال ہوتے ہوئے رشتوں، اجڑتے گھرانوں اور محبتوں کو نفرتوں کے زہر میں تبدیل ہوتے خوں آشام لمحوں کا نوحہ لکھ دیا ہے۔

مصنفہ نے، جو عظیم آباد (بہار) سے ہجرت کر کے سابق مشرقی پاکستان کو اپنا ملجیٰ و مسکن بنانے والے ایک علمی خانوادے سے تعلق رکھتی ہیں اور جن کے والد گرامی پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی جیسی ''گنجینہ معارف'' شخصیت کا وارثتی فیضان ان کی دیگر تصانیف بالخصوص ''مجاہدین صادقپور'' کا نشان امتیاز ہے، اپنے منفرد اسلوب نثر سے زیر نظر تصنیف کو ناقابل فراموش تاریخی اثاثہ بنا دیا ہے۔ ان کے قلم کی بوقلمونی، ان کے رواں دواں جملوں، بے ساختہ روزمرہ اور محاوروں، نیز ایک مخصوص ثقافت اور معاشرتی آداب کی عکاس بن گئی ہے۔ جس کا اعجاز یہ ہے کہ قاری خود اپنے ذہن وفکر اور محسوسات کو ناولٹ کے پیدا کردہ ماحول میں تحلیل ہوتا محسوس کرتا ہے۔ اسے ہر ہر مرحلہ پر ابھرتے ہوئے کردار کا غم اپنا غم اور خوشی اپنی خوشی محسوس ہوتے ہیں۔

زیر نظر تصنیف کی ایک اہم خصوصیت انسان وحیوان کی تخلیقی وحدت کے وہ سرچشمے ہیں جنہوں نے ہر دو مخلوق کو ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی اور پیار کے رشتوں میں منسلک کر دیا ہے۔ لندن میں تین سال قیام کے بعد ڈھاکہ واپس آ کر جس خاندان کی کہانی سے ناولٹ کا آغاز ہوتا ہے وہ از اول تا آخر بچوں، بڑوں اور گھریلو پالتو جانوروں سے والہانہ پیار اور جانوروں کی ایسی خوبصورت داستان ہے جن میں بچوں کا جانوروں سے والہانہ پیار اور جانوروں کی اہل خانہ سے وفاداری آئین فطرت پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں۔ ہر پالتو جانور کو ایک ایسا نام دیا گیا ہے۔ جو مخلوقات خدا کے درمیان خلیجوں کو پاٹتا نظر آتا ہے۔ مثلاً نواب اینڈ فیملی (مرغی اور مرغیاں) ایک اور مرغ جس کا نام بٹلر اور سفیدی ایک بکری، جیف نامی کتا، موں اور آدینہ سیامی بلیوں کے نام ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مصنفہ نے کتاب کا انتساب ان بچوں کے نام کیا ہے جن کے رفیق ان کے پالتو جانور رہیں...... اور جب تنکے بکھرنے لگے اور ڈھاکہ کے کوچہ و بازار ان مکینوں پر تنگ ہو گئے جنہوں نے ہجرت کی ہر صعوبت برداشت کر کے اپنے خوابوں کی جنت پاکستان کی سرزمین کو بوسے دیئے تھے تو جانور بھی ان مکینوں کی اس تازہ ابتلا میں برابر کے شریک تھے۔ ایسے ہی ایک لمحے کی تصویر کشی مصنفہ نے ان الفاظ میں کی ہے:

''ابو نے اتنے میں جھک کر جیف (کتے) کے پٹے سے زنجیر الگ کر دی اور پُرنم آنکھوں سے اس کے سر کو سہلایا۔ جیف کی چھٹی حس جیسے اسے سب کچھ بتا چکی تھی۔ اپنے دونوں اگلے پنجوں سے ابو کا پاؤں پکڑ کر اُس نے اپنا سر ابو کے بوٹ پر رکھ دیا۔''

محترمہ عمرانہ معز نے ناولٹ کے کرداروں کو ماحول اور فطرت کی صداقتوں کا اس طرح امین بنایا ہے کہ وہ تاریخ کے سنگین ترین لمحات کے معتبر گواہ اور معاشرتی حقیقتوں کے ترجمان بن گئے ہیں۔ مثلاً قدرت ماں اور فاطمہ ماں (گھریلو خادمائیں) جہاں خدمت و وفا کا سراپا نظر آتی ہیں، وہیں ایک کردار مطیع چچا کا بھی ہے جنہیں اپنے وطن میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی، جبکہ انکل نور محمد کا تو امریکہ میں پانچ سال قیام کے بعد لہجہ ہی بدل گیا تھا اور شمس العالم بدستور لکھنوی تہذیب کے نمائندہ بنے ہوئے تھے۔ ناولٹ میں کرداروں کا تنوع مصنفہ کے فکر و فن کی وسعت و ہمہ گیریت کا غماز ہے۔ خصوصاً ناولٹ کا آخری باب ''آشیانہ چھوٹ گیا...... تنکے بکھر گئے'' میں رقت انگیز واقعات و مناظر کو جس مہارت فن کے ساتھ سمیٹا گیا ہے، وہ مصنفہ کے قلم کا اعجاز ہے۔

(جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۹ء)

غزل کے رنگ

ڈاکٹر انور سدید

کتاب 'غزل کے رنگ' جو ''نقش ہائے رنگ رنگ'' سے آراستہ ہے ڈاکٹر انور سدید کے مذاقِ تنقید کا تازہ شاہکار ہے۔ ڈاکٹر صاحب بزرگانِ ادب میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ چھ دہائیوں سے بھی زیادہ مدت سے قلم بدست چلے آرہے ہیں اور ادب ہی نہیں اخباری صحافت میں بھی ان کا نام معتبر ہے اور سند سمجھا جاتا ہے۔ ادب میں تنقید و تحقیق ان کا خاص شعبہ ہے اور شاعری میں غزل کی صنف ان کی محبوبہ دائم البہار۔ فرماتے ہیں کہ ''مجھے اردو غزل سے ابتدائی تعارف نصاب کی کتابوں سے ہوا تھا'' اور فیضانِ تعارف یہ کہ آج وہ اپنے تنقیدی و تحقیقی اختصاص کے ساتھ ایک اُسلوب خاص کے شاعر بھی ہیں جن کا کلام عصری معنویت سے مملو نظر آتا ہے وہ غزل کے روایتی محاسن شعری کے بھی قائل ہیں۔ انہیں کے بقول: ''وہ مبہم کیفیت جو رمز و کنایہ سے پیدا ہوتی ہے درحقیقت غزل کی جان ہے'' گویا اس معاملہ میں ایسے سخن فہم ہیں جو غالب کے طرفدار بھی ہیں۔ مرزا نے کہا تھا

فکر میری گہراندوزِ اشارات کثیر　　کلک میری رقم آموز عبارات قلیل
میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح　　میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

''اردو ادب کی تحریکیں'' ڈاکٹر انور سدید کی معرف و مقبول تصنیف ہے جس سے ادب کے طلباء اور تحقیقی سطح کے مطالعات میں مصروف حضرات بھی استفادہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اس کتاب میں متعدد غزل گو شعراء کو زیر بحث لا چکے ہیں چنانچہ زیر نظر کتاب ان شعراء پر مختلف اوقات میں کہے گئے مضامین پر مشتمل ہے۔ شعراء کی اس فہرست میں ''مرأۃ الحکماء'' کے مصنف اور انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے ثلث اول کے نامور ادیب اور شاعر سید امداد امام اثر سرفہرست ہیں جن کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کی رائے کہ ''امداد امام اثر نے مغرب

کے مادی مزاج کو مشرق کی روحانی کیفیت سے دریافت کیا ہے'' ۲۸۷ صفحات پر مشتمل اپنی اس تازہ تصنیف میں ڈاکٹر انور سدید چار ابواب میں تقریباً دو درجن نمائندہ شعراء کو زیر بحث لاتے ہیں۔ ''غزل کے رنگ'' کے زیر عنوان باب میں سید امداد امام اثر کے علاوہ حسرت موہانی، نعیم صدیقی، جوہر نظامی، جعفر شیرازی، خالد محمود عارف اور فضا اعظمی پر مضامین شامل ہیں۔

ان ابواب سے قبل مصنف نے غزل کے حوالے سے نہایت اہم باتیں بھی کی ہیں۔ ''ریزہ خیالی'' کی ایک خوبصورت ترکیب وضع کر کے انہوں نے غزل کی ایک امتیازی خوبی کی نشاندہی کی ہے اور ولی دکنی، میر تقی میر کے ساتھ (سودا سے صرفِ نظر کرتے ہوئے) خواجہ میر درد کی متصوفانہ شاعری کو موضوع بنایا ہے۔ ان کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ ''درد چونکہ صوفی تھے اس لئے تمام عمر سچے مردانِ راہ خدا کی طرح حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ یہی جستجو اور کھوج ان کی شاعری کا امتیازی وصف ہے۔'' تاہم ہم سمجھتے ہیں کہ درد کی شاعری کا مطالعہ حسنِ مجازی کی پیوندکاری سے بھی مرصع ہے ورنہ خواجہ کے درج ذیل شعر سے یہ منطقی سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کے دور سے پہلے کس کا دور تھا؟'' شعر ہے:

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دُور نہ تھا پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا

بہرحال مصنف نے اپنے ابتدائی جائزے میں خواجہ آتش کو بھی شامل کیا ہے۔ وہ حالی و اقبال کے شعری رویوں کو صرف ایک خوبصورت جملے میں اس طرح کوزہ بند کر دیتے ہیں:

''حالی نے غزل کی زمین میں جدت کا جو پیوند لگایا تھا، اقبال نے اسے نقطۂ تکمیل تک پہنچا دیا''

چنانچہ اسی تسلسل میں وہ فیض کو لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''حالی و اقبال نے غزل کو جو نیا پیکر عطا کیا تھا فیض احمد فیض نے اسے غم دوراں اور غم جاناں کا ربط باہمی اجاگر کرنے کے لئے استعمال کیا۔ حسرت کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ ''حسرت کے احساسات اور تجربات چونکہ تمام تر ذاتی تھے اس لئے جب حسرت کا تخلیقی پیکر اس وسیع مطالعہ کے شعری پس منظر سے

مَس کرنے لگا تو اردو غزل کو ایک نیا لہجہ اور نیا ذائقہ ملا۔'' چنانچہ اس نئے لہجے اور نئے ذائقے کو حسرت کے درج ذیل اشعار میں محسوس کیا جاسکتا ہے یہی نہیں بلکہ بقول مصنف حسرت کی ''مصوری'' بھی دیکھی جاسکتی ہے جو حسرت کے لفظوں سے برش کا کام لینے سے وجود میں آتی ہے:

رونق پیرہن ہوئی خوبی جسم نازنین — اور بھی شوخ ہوگیا رنگ تیرے لباس کا
روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام — دہکا ہوا ہے آتشِ گُل سے چمن تمام
آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن — آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

''پاکستان میں اردو غزل کے ارباب اربعہ'' کے زیرِ عنوان باب میں ناصر کاظمی، حفیظ ہوشیار پوری، تابش دہلوی اور شکیب جلالی کو شامل کیا گیا ہے۔ شکیب کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید کا حسن نظر ملاحظہ ہو:

''شکیب جلالی ایک شعلہ مستعجل کی طرح رونما ہوا اور اپنی تخلیقی چھب دکھا کر شہاب ثاقب کی طرح ٹوٹا اور دور تک غبار نور پھیلتا ہوا غائب ہوگیا''۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے منتخب شعراء کے کلام میں جس بلاغت نظری کا اہتمام کیا ہے شکیب کے درج ذیل اشعار اس کا ثبوت فراہم کرتے ہیں:

وہاں کی روشنیوں نے بھی ظلم ڈھائے بہت — میں اس گلی میں اکیلا تھا اور سائے بہت
سوچو تو سلوٹوں سے بھری ہے تمام روح — دیکھو تو اک شکن بھی نہیں ہے لباس میں
تیز آندھیوں میں اڑتے پروبال کی طرح — ہر شے گزشتنی ہے مہ و سال کی طرح

آخری باب میں منتخب شعراء کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ وزیر آغا اور شہزاد احمد سے لے کر خورشید رضوی، افتخار عارف، ریاض مجید اور رشید قیصرانی تک متعدد شعراء ہیں لیکن ان تمام میں ترقی پسند شاعر خالد علیگ کا لب ولہجہ سب سے مختلف اور منفرد ہے۔ خالد کے بارے میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ اس نے ''علی گڑھ میں اس وقت تعلیم حاصل کی جب وہاں اسرار الحق مجاز موجود تھے۔ خالد کے باطن سے علی گڑھ کی شعری فضا ہی نے ایک فطری شاعر کو بیدار کیا۔''
خالد کے شعری مجموعہ ''غزال دشت سگاں'' سے مصنف کے منتخب کردہ اشعار میں سے چند:

حیرت تو یہ ہم آئینہ سازوں کے روبرو
شیشوں کو پتھروں کا مسیحا کہا گیا

پاؤں کی ایڑیوں میں تھی جن بزدلوں کی عقل
ان احمقوں کو عقل سراپا کہا گیا

خرد کے اپنے مشاغل، جنوں کا اپنا مذاق
کسے بتاؤں کہ اندوہِ آگہی کیا ہے

مانند حرفِ شوق مکرر نہیں ہوں میں
اپنے سوا کسی کا مقدر نہیں ہوں میں

افتادگانِ شوق میں میرا بھی ہو شمار
یعنی کسی کی راہ کا پتھر نہیں ہوں میں

خالد ہر انتسابِ صداقت کے باوجود
میں خود بھی جانتا ہوں پیمبر نہیں ہوں میں

یہ عہد کم نگہی، اس میں قدر جوہر کیا
غزالِ دشتِ سگاں ہوں مرا مقدر کیا

میں اُسی قبیلۂ کشتگاں کی صداقتوں کا امین ہوں
جسے لفظ لفظ سنا گیا جسے حرف حرف سزا ملی

اوراب دیکھئے کہ شاعرِ ''غزالِ دشتِ سگاں'' کو ڈاکٹر انور سدید کن شواہد کے ساتھ اور کن الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں:

''خالد علیگ اس دور میں شاعروں کی مقبول ترین آواز تھے۔ عصری حقیقت کا برملا اظہار کرتے اور پھر نہ صرف مشاعرہ جیت لیتے بلکہ ان کے اشعار کی خوشبو پنڈال سے باہر نکل جاتی اور مختلف شہروں میں پھیلتی چلی جاتی۔''

خالد علیگ کو مصنف کا یہ خراجِ تحسین پروفیسر رشید احمد مرحوم کے اس قول کی صداقت پر گواہی ہے کہ ''غزل صنفِ سخن ہی نہیں معیارِ سخن بھی ہے۔'' جس کا حوالہ کتاب کے آغاز میں دیا گیا ہے۔

(اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۹ء)

بیان (مجموعۂ کلام)

مسلم شمیم

زیرِ تبصرہ کتاب ہم تک قیمتاً پہنچی نہ عاریتاً بلکہ فاضل صاحبِ کتاب نے ہدیتہً بطور ''سرمۂ مفتِ نظر'' عنایت فرمائی چنانچہ پانچ سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل 'بیان' کا مطالعہ بصارت و بصیرت افروز ثابت ہوا بلکہ 'بیان' میں ایک 'امکان' بھی پوشیدہ نظر آیا جو جناب مسلم شمیم کا پہلا مجموعہ کلام ہے اور بیان دوسرا۔اس طرح بقول ڈاکٹر تاثیر مرحوم مشکل یہ آن پڑی کہ:

شکارِ ماہ کہ تسخیرِ آفتاب کروں   میں کس کو ترک کروں کس کا انتخاب کروں

بہر حال یہ مشکل بھی اس طرح آسان ہوگئی کہ 'بیان' کے حرفِ آغاز میں 'سخن ہائے گفتنی' کے زیرِ عنوان مسلم شمیم صاحب نے خود ہی ارشاد فرمادیا ہے کہ ''زیرِ نظر تصنیف میرا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔میرا پہلا شعری مجموعہ 'امکان' ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا تھا۔۔۔امکان اور بیان کی نگارشات میں میرے نزدیک کوئی بیّن فرق اور خطِ امتیاز نہیں ڈھونڈا جاسکتا۔اس قول کی صداقت کی ایک ہی بنیادی وجہ سامنے آئی کہ مسلم شمیم کا آدرش ترقی پسندانہ نظریہ ہے جس پر وہ ۱۹۵۲ء سے قائم و دائم ہیں بقول ان کے ''ترقی پسندیت کی نظریاتی اساس مارکسزم اور مارکسی فلسفہ پر استوار ہے'' لیکن ان کی خوش آہنگ شاعری سے یہ تاثر بھی ملتا ہے کہ وہ غزل کی کلاسیکی روایات و علامات نیز تشبیہات و استعارات اور تلمیحات کو ''جانِ سخن اور روحِ سخن'' سمجھتے ہیں اس طرح ان کے ہاں بیک وقت جگر و فیض کے اسلوب و آہنگ کا گہرا رچاؤ ہی نہیں ہر دو شخصیات سے ذاتی عقیدت بھی بین السطور دیکھی جاسکتی ہے۔مسلم شمیم کا کلام ان کے شعور و لاشعور کی مختلف جہتوں کا فطری امتزاج نظر آتا ہے اور جہاں وہ اپنے اس قول پر کاربند دکھائی دیتے ہیں کہ ''ادب کو پہلے ادب اور پھر کچھ اور ہونا چاہیئے'' وہیں یہ کہہ کر انھوں نے عصری معنویت پر بھی زور دیا ہے کہ ''روحِ عصر کی ترجمانی کا فریضہ انجام دینے والی شاعری ہی زندۂ جاوید شاعری کہلاتی ہے'' ان کی نظریاتی وابستگی

کا تقاضا ہے کہ ادب کو سماج میں تبدیلی لانے کا بنیادی کردار ادا کرنا چاہیئے۔ فیض کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے مسلم شمیم کہتے ہیں:

نئی رُتوں کا مغنّی نئی سحر کا نقیب　　بجھے دلوں کا مسیحا وہ تیرگی کا رقیب

چنانچہ فیض احمد فیض کا اسلوب شاعری اور فکر وفن کے اکثر زاویے مسلم شمیم کے اندازِ سخن سنجی میں جلوہ ریز نظر آتے ہیں مثلاً فیض کا یہ اندازِ گریز کہ 'اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا' مسلم شمیم کے ہاں اُن کی مخصوص ابلاغی جہت میں ڈھل گیا ہے

نفرت ہے فضا میں تو محبت بھی بہت ہے　　جینے کے لیے درد کی دولت بھی بہت ہے
ہے دستِ ستمگر کو اگر فرصتِ آزار　　دکھیاروں میں دکھ سہنے کی ہمت بھی بہت ہے
اب دستِ مسیحا کی کرامات ہیں دو چند　　مرہم بھی ہے سامانِ جراحت بھی بہت ہے
ستارے اور بھی ہیں ماہتاب اور بھی ہیں　　کہ میرے پیشِ نظر آفتاب اور بھی ہیں
خلا نورد ہوں میں کائناتِ امکاں کا　　مری کتاب محبت کے باب اور بھی ہیں

صاحب 'امکان' و 'بیان' کا لب ولہجہ غزل کی کلاسیکی روح کے حوالے سے نرم ولطیف اور دلپذیر ہے لیکن جب وہ خدایانِ قہر و جبر سے مخاطب ہوتے ہیں یا مزاحمتی فکر کے پر پرواز کھولتے ہیں تو اُن کے لہجہ میں طنز کی کاٹ پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اس لئے کہ مسلم شمیم ظلم واستبداد سے مفاہمت کا کوئی تصور اپنے ذہن میں نہیں رکھتے۔

قصور ہے کہ سرشتِ ستم سمجھتے ہیں　　یہ جرم ہے کہ رموزِ کرم سمجھتے ہیں
سکوتِ مرگ ہے ہر سو مگر ابھی کچھ لوگ　　وقارِ عظمتِ لوح و قلم سمجھتے ہیں
مسیحِ وقت ہیں سقراطِ عہد ہیں ہم لوگ　　کہاں لہو کی ضرورت ہے ہم سمجھتے ہیں
شعلے برس رہے ہیں لبِ جوئبار سے　　ہے مختلف بہار یہ کتنی بہار سے
زنداں کی تیرگی ہو کہ مقتل کی خامشی　　ہیں منسلک کسی نہ کسی اعتبار سے

طلسم جہل کی تہذیب کو نظر نہ لگے
ہے حکم تازہ فروغِ نظر کو قتل کرو

ہماری بے گنہی کی ہمارے قتل کے بعد
صلیب وقت پہ ابھریں شہادتیں کیا کیا

حکم حاکم ہے ان کو گل کر دو
جن چراغوں میں روشنی ہے بہت

کم نہ تھا جہل کا عذاب شمیم
اور اب کربِ آگہی ہے بہت

حریم جبر میں خاموش بھی رہا نہ گیا
سفیر شب کو نقیب سحر کہا نہ گیا

شب ستم کا بیاں جرم ہی سہی لیکن
گماں نہ ہو کہ سرِ بزم کچھ کہا نہ گیا

مسلم شمیم کی نظریاتی وابستگی شعر میں ان کی شناخت ضرور ہے لیکن اُن کا یہ تصور کہ ادب کو اولاً ادب ہی ہونا چاہیے اُن کے فکر وشعور کا ایک نمایاں زاویہ بن گیا ہے اور اُس کا اظہار وہ مکمل فنکارانہ مہارت کے ساتھ کرتے ہیں وہ کہیں یہ محسوس نہیں ہونے دیتے کہ نعرہ بازی اُن کا شیوہ ہے یا اُن کی شاعری ایک سیاسی اشتہار۔ قرینہ وسلیقہ اور فنکارانہ وقار اُن کا نمایاں وصف ہے ملاحظہ ہو:

ضمیر وقت کی آواز ہے مری آواز
میں منتظر ہوں مجھے آگ پر چلایا جائے

میں گھر گیا ہوں اجالوں میں خوش یقینی کے
بھٹک نہ جاؤں مجھے راستہ دکھایا جائے

میں شرمسار ہوں خود سے کہ آگہی مجھ سے
سوال کرتی ہے کیا جانے روشنی مجھ سے

چہار سمت دھندلکا چہار سمت سکوت
طلب کرے بھی تو کیا میری شاعری مجھ سے

کچھ نقوشِ دستِ قاتل کچھ شمیم خونِ دل
گلستاں دامن میں لے کر گلستاں تک آ گئے

اُگے ہیں زخم کے پودے کھلے ہیں داغ کے پھول
دل ایک دشت تھا گلشن بنا دیا میں نے

کسی مسیح کے قدموں کی آہٹیں سن کر
صلیب جھوم اُٹھی شاخِ آشیاں کی طرح

اور اب تلمیحی انداز کے سحر پرور استعمال پر شاعر کی قادرانہ گرفت کے ثبوت میں یہ ایک شعر ہی کافی ہے۔

جنت بدر ہوا کبھی مصلوب میں ہوا
ایسے کئی مقام مری داستاں میں ہیں

رہا شاعرِ 'بیان وامکان' کا یہ دعویٰ کہ ''مشاہدے اور تجربے کا امتزاج میرے نزدیک شعری جمالیات کے لئے نسخہ کیمیا کا درجہ رکھتا ہے'' تو ہم دیکھتے ہیں کہ کلاسیکی غزل کے عہد متوسطین کے دبستان میں ان کا وجدان حضرتِ جگر کو امام تسلیم کرتا ہے وہ کہتے ہیں:

جمالِ فن کا تصور ہے آتشِ گُل سے　　　غزل کے ساتھ جگر کا خیال آیا مجھے

چنانچہ ہم نے جب مسلم شمیم کی غزل کی مختلف جہتوں کا جائزہ لیا تو وہ غم جاناں سے بھی پوری والہانہ شیفتگی کے ساتھ ہم آغوش نظر آئے اور جگر اور ان کے معاصرین حسرت، اصغر، فانی وغیرہ نیز شاد عظیم آبادی جن سے اُنھیں 'جنم بھومی' کی نسبت کا شرف حاصل ہے ان کے اُفق فکر پر جلوہ بار دکھائی دیئے لہٰذا ان کے لہجہ واسلوب میں تبدیلی کا رخ اپنی پوری تابنا کی ساتھ منصۂ شہود پر آ گیا ہے ملاحظہ ہو:

وہ ہم کلام ہوا تھا کچھ ایسے لہجے میں　　　کہ جیسے شیشہ وساغر سے گفتگو کی تھی
وہ شخص آنکھوں سے دل میں اُتر گیا ہے شمیم　　　وہ جس کی آنکھوں سے اک بار گفتگو کی تھی
پلکوں پہ کوئی چاند سجا لیتی ہے اکثر　　　تنہائی تجھے آپ بلا لیتی ہے اکثر
دل ایک تھکا ماندہ مسافر ہے کہ جس کو　　　لوری ترے لہجے کی سلا دیتی ہے اکثر
میں سوچتا رہوں پہروں تجھے یہ سوچتا ہوں　　　اُفق پہ چاند ابھرتا رہے یہ سوچتا ہوں
تری جبیں کی وساطت سے میری آنکھوں میں　　　طلوعِ صبح کا منظر رہے یہ سوچتا ہوں
تری جنبشِ نظر میں مئے خوشگوار رقصاں　　　ترے گیسوؤں کے سائے میں بہار سو رہی ہے
شکست خوردگیِ حسن بھی قیامت ہے　　　وہ اپنی پلکوں پہ ہیں کہکشاں سجائے ہوئے
مسکراتی ہوئی آنکھیں وہ سلگتے ہوئے لب　　　ایسے ماحول میں مشکل ہے کوئی زندہ رہے
ذکرِ فردوسِ نگاراں ہی رہے آج کی شب　　　گفتگوئے دلِ پُرخوں کبھی آئندہ رہے

اور مزید ایک خوبصورت شعر جو شاعر کی غنائی فکر کا نمائندہ ہے:

آبِ رودِ خیال میں رادھا آج اشنان کرنے آئی ہے

مسلم شمیم کے ضخیم شعری مجموعوں میں مخصوص فکری ولفظی آہنگ پر مشتمل نظمیں بھی ملتی ہیں لیکن اُن کا حسن بھی شاعر کے متغزلانہ ذہن کا مرہونِ منت ہے البتہ ایک جملۂ معترضہ کہ کلام اول ''امکان'' کے دیباچۂ ثانی بعنوان ''سخن در سخن'' میں در آیا ہے خود بہ الفاظ شاعر یہ ہے کہ ''امکان میں میری تخلیقی زندگی کا جو ۱۹۴۹ء میں شروع ہوئی ۱۹۹۵ء تک کا منتخب کلام شامل تھا۔۔۔ پہلے عشرے یعنی ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۹ء تک کی تخلیقات میں سے ایک شعر بھی مذکورہ (زیرِ نظر) مجموعے میں شامل نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس عشرے کی شاعری وہ شاعری تھی جس کو مولانا الطاف حسین حالی نے سرے سے رد کر دیا تھا۔۔۔ چنانچہ اس عشرے کی اپنی شاعری کو سرے سے قابلِ اعتنا نہ جان کر اس کو امکان میں کوئی جگہ نہ دی گئی۔۔۔ (میں) مذکورہ عشرہ کو اپنی تخلیقی زندگی میں عہد جاہلیہ سے موسوم کرتا ہوں۔'' ہم اس سلسلہ میں صرف اتنا عرض کریں گے کہ وہ اپنے ماضی یعنی تاریخ میں تحریف وترمیم نہ کرتے تو مناسب ہوتا کہ یہ کام ادبی مورّخ کا ہے کہ اُن کے ایک عشرۂ حیات کو عہد جاہلیہ سے تعبیر کرے یا دورِ عرفان وآگہی سے۔

(جنوری۔مارچ ۲۰۱۰ء)

رسمیات مقالہ نگاری

پروفیسرڈاکٹرمعین الدین عقیل

مختصر لیکن نہایت اہم۔۔۔زیر نظر کتاب ''رسمیاتِ مقالہ نگاری'' جامعہ کراچی کے پاکستان سٹڈی سنٹر کی دعوت پر معروف و معتبر محقق اور معلم پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل نے تحریر فرمائی ہے جو پاکستان اور بیرون ملک کی موقر جامعات میں جلیل القدر علمی و تدریسی مناصب پر فائز رہ چکے ہیں ناظم مرکز ڈاکٹر سید جعفر احمد نے ''سرآغاز'' کے زیر عنوان اپنے تعارفی کلمات میں کہا ہے کہ عالمی سطح پر عمرانی علوم اور فنون میں تحقیق کی اہمیت کا ادراک و احساس جس انداز سے فروغ پا رہا ہے اس کے پیش نظر ایسی کتابوں کی ضرورت اظہر من الشمس ہے جن میں تحقیق کے اصولوں کی تسہیل و تفہیم طلبا و اہل تحقیق کے لیے معاون ثابت ہو سکے۔انھوں نے فاضل مصنف کو اس مقتضی الوقت تصنیف کی تکمیل پر ہدیۂ سپاس و تشکر پیش کیا ہے۔

زیر نظر کتاب نہ صرف مقالہ نگاری کی جدید ترین فنی ضرورتوں کے اعلیٰ ادراک و شعور کی عکاس ہے بلکہ اپنی موضوعی اور معنوی وسعت میں معاشرتی علوم و فنون کے علاوہ ادبیات بالخصوص اردو ادبیات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔یہ تصنیف اپنی جامعیت کے اعتبار سے بھی ممتاز و ممیّز کہی جا سکتی ہے کہ بلیغ اشارات و حوالہ جات کے ذریعہ ابلاغ کو دلنشین و موثر بنا دیا گیا ہے اور وہ خلاء جو اردو زبان و ادب کے تاریخی پس منظر میں تحقیق کے 'اصول وضوابط' طریقہ، تحقیق، 'اصول تحقیق' یا 'اسالیب تحقیق' کی جانب عدم توجہی کے باعث پیدا ہوا۔اسے مکمل تکنیکی مواد مہیا کر کے ''رسمیات تحقیق' کی نوتخلیق اصطلاح کے تحت پُر کرنے کی عالمانہ سعی کی گئی ہے۔اس پس منظر کو اٹھارویں صدی عیسوی سے مربوط کرتے ہوئے فاضل مصنف نے مغربی زبانوں میں لکھی جانے والی کتب میں حواشی و کتابیات کے اصول اور اشاریہ سازی کے رجحان کو نقطۂ آغاز قرار دیا ہے اور 'رائل ایشیاٹک سوسائٹی' کا حوالہ دیا ہے جس نے اپنی مطبوعات کو جدید رسمیات تحقیق سے مرصع

کر کے متعارف کرایا۔ پاکستان میں اس رجحان کی ترویج کے سلسلہ میں فاضل مصنف نے ڈاکٹر نجم الاسلام کے مقالے بعنوان ''رسمیات مقالہ نگاری'' کا حوالہ دیا ہے جو جامعۂ سندھ کے شعبۂ اردو کے تحقیقی مجلّے ''تحقیق'' (۱۹۸۷ء) میں شائع ہوا اس کے بعد ڈاکٹر عقیل نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ سہ ماہی ''اردو'' (کراچی اپریل ۱۹۸۸ء) میں اُن جدید تر رسمیات کی جانب توجہ دلائی جو مغربی دنیا میں رواج پا چکی تھیں۔ اسی تسلسل میں انھوں نے بعد ازآں اُن ضوابط کو مربوط و مرتب صورت میں ''اردو تحقیق'' کے موضوع پر اگست ۲۰۰۳ء میں پشاور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام منعقدہ سیمینار میں پیش کیا تاہم ان تمام نقیبانہ کاوشوں کو ڈاکٹر عقیل کی اردو سے والہانہ ارادت و محبت پس منظر فراہم کرتی ہے جس کے نتیجہ میں وہ اپنے عہد طالب علمی (ایم۔اے) ہی میں ''تحریک پاکستان کا لسانی پس منظر'' کے اہم موضوع پر بسیط ہو محیط مقالہ تحریر کر چکے تھے اور بعد میں مزید اضافوں اور تاریخ ساز حقائق پر مبنی اپنا ڈاکٹوریٹ کا مقالہ بعنوان ''تحریک آزادی میں اردو کا حصّہ'' مکمل کیا۔

زیرِ نظر کتاب میں ڈاکٹر معین الدین عقیل نے پوری فنی بصیرت اور تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے کم و بیش دو درجن ذیلی عنوانات کے تحت موضوع کا دانشورانہ احاطہ کیا ہے اور شہسواران عرصۂ تحقیق کی رہنمائی کرتے ہوئے انھیں یہ بتایا ہے کہ ''رسمیات تحقیق کیا ہوں؟ ان کے مآخذ اور ان کی اسناد کا حوالہ کس طرح دیا جائے؟ حواشی اور تعلیقات کس طرح لکھے جائیں؟ متن یا بین السطور اقتباس کس طرح نقل کیا جائے؟ مآخذ یا اسناد کی فہرست (کتابیات) کو کس طرح مرتب کیا جائے؟ اور یہ سارے بنیادی لوازم زیادہ سے زیادہ جامع، سائنٹفک، معیاری اور آسان کس طرح ہو سکتے ہیں؟

ہمیں فاضل مصنف کی اس رائے سے بھی کامل اتفاق ہے کہ ہائیر ایجوکیشن کمیشن کو جس کے فرائض منصبی میں تحقیقی سرگرمیوں کو معیار و اقدار سے ہمکنار و ہم آہنگ کرنا شامل ہے ایسے معیاری قواعد و ضوابط مرتب کرنے چاہئیں جو رسمیاتِ تحقیق کے ضمن میں ادبیات اور معاشرتی علوم

کے شعبوں میں استناد کی بنیاد فراہم کرسکیں اور ملک بھر کی جامعات پر ان کی پابندی لازمی قرار دی جائے۔فاضل مصنف نے ہر ذیلی عنوان کے تحت تسہیلِ فہم کے لئے نہایت جامع امثلہ بھی پیش کی ہیں جو زیرِ نظر تصنیف کی اہم ترین خصوصیت ہیں۔یہی نہیں بلکہ رموزِ اوقاف کے ضمن میں فاضل مصنف نے جس دقتِ نظر اور بلاغتِ فکر کا مظاہر کیا ہے اُس کا اندازہ درج ذیل عبارت سے کیا جا سکتا ہے۔

"زبان خصوصاً تحریر کی شائستگی، معنویت اور معیار کا تقاضا ہے کہ رموزِ اوقاف پر خاص توجہ دی جائے اور احتیاط اس حد تک روا رکھی جانی چاہیئے کہ اس کے استعمال میں سہو نہ ہو۔بعض اوقات ان کا لحاظ نہ رکھنے سے معنی بدل بھی سکتے ہیں اور معنویت پیدا بھی کی جاسکتی ہے۔"

ہم سمجھتے ہیں کہ محترم ڈاکٹر عقیل نے ایک اہم علمی و تحقیقی ضرورت کی نہ صرف نشان دہی فرمادی ہے بلکہ رہنما خطوط بھی مہیا کر دیئے ہیں اب یہ اربابِ اختیار کا فرض ہے کہ وہ طلباء و محققین بلکہ قارئین کے بھی مفاد اور علوم عمرانیہ و ادبیات کی بہتر تفہیم اور فروغ کے لیے اس تصنیف کو جامعات کی سطح پر مطالعات کا لازمی جزو قرار دیں۔

(جنوری۔مارچ ۲۰۱۰ء)

اسلامی اور مغربی تہذیب کی کشمکش (فکر اقبال کے تناظر میں)

ڈاکٹر محمد آصف

زیر نظر کتاب ڈاکٹر محمد آصف کے پی۔ایچ۔ڈی مقالہ پر مشتمل ہے بہاء الدین زکریا یونیورسٹی نے اس مقالے پر ڈگری عطا کی اور اشاعت کا بھی اہتمام کیا۔موضوع نہات فکر انگیز اور عالمی اہمیت کا حامل ہے۔صاحب مقالہ نے فکر اقبال کے تناظر میں موضوع کا عمیق و بسیط احاطہ جس جانکاہی اور بلاغتِ نظر سے کیا ہے اس نے ان کی اس علمی کاوش کی قدر و قیمت کو اور بھی فزوں تر کر دیا ہے۔انہوں نے تحقیق کے تمام تقاضے بحسن وخوبی پورے کیے ہیں جس کی گواہی پونے چھ سو صفحات پر محیط مقالے کے ایک ہزار سے زیادہ حواشی نیز کتابیات اور اخبارات و جرائد کی ایک طویل فہرست سے ملتی ہے۔ڈاکٹر آصف نے اپنا جاذب توجہ مقالہ جامعہ اسلامیہ بہاولپور سے وابستگی کے دوران مکمل کیا۔ بعد میں بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے اور بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر تا حال وابستہ ہیں۔انھیں اپنے اس کثیر الجہت تحقیقی منصوبے میں اپنے جن رفقائے کار اور بزرگ اساتذہ سے اعانت و رہنمائی ملی ہے اس کا برملا اعتراف اور اظہار تشکّر کتاب کے آغاز ہی میں ”ابتدائی مکالمہ“ کے زیر عنوان کر دیا گیا ہے۔انھوں نے جامعہ اسلامیہ بہاولپور کے ڈین فیکلٹی آف آرٹس، محقق و نقاد اور اپنے استاد ڈاکٹر نجیب جمال سے خاص طور پر، اظہار ممنونیت کیا ہے بلکہ اپنے ایک اور واجب التعظیم استاد اور نگرانِ تحقیق ڈاکٹر انوار احمد سے جو آج کل اوساکا یونیورسٹی (جاپان) سے وابستہ ہیں اپنی اس علمی کاوش کو معنون کیا ہے۔ڈاکٹر انوار احمد کے افتتاحیہ کلمات زیر عنوان ”مشرقی حکمت کا جوہر۔۔۔اک تربیت وجدانی“ سے بھی زیر تبصرہ کتاب مزین ہے۔

چیر پرسن شعبۂ اردو بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ڈاکٹر روبینہ ترین نے اپنی تقریظی تحریر کو ”ایک فکر انگیز تصنیف اور خیال انگیز، مصنف“ کا عنوان دے کر مقالے کو مقام استناد پر فائز کر دیا

ہے۔ جس کے باالاستعیاب مطالعہ سے تحقیقی مواد کی سلیقہ مندانہ ترتیب وتدوین کی توثیق ہو جاتی ہے۔ فاضل محقق نے اپنے مقالے کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے (۱) تہذیب کی ماہیت (۲) اسلام اور مغرب کے مابین روابط (۳) اقبال کی شخصیت۔ تہذیبی عوامل (۴) اسلامی اور مغربی تہذیب کی کشمکش (فکر اقبال کے تناظر میں)۔ ذیلی ابواب کی تعداد بھی کم وبیش ڈیرھ درجن ہے۔ تہذیب کی اس تعریف کے ساتھ کہ ''تہذیب کسی بھی قوم کے مجموعی طرز حیات کا نام ہے'' مصنف سر سید احمد خاں کو برصغیر میں اردو زبان وادب کا پہلا دانشور قرار دیتے ہیں جنھوں نے تہذیب کا وہ مفہوم جو انیسویں صدی میں رائج ہوا سب سے پہلے پیش کیا۔ اس تناظر میں وہ انسائیکلو پیڈیا آف سوشل سائنسز کے حوالے کے ساتھ ساتھ دیگر کے علاوہ فیض احمد فیض اور سیّد سبط حسن کے نظریات بھی پیش کرتے ہیں مصنف کے اخذ کردہ نتائج کے مطابق تہذیب کسی قوم یا معاشرے کی مشترک خصوصیت ہے جس سے نہ صرف وہ قوم پہچانی جاتی ہے۔ بلکہ دوسرے معاشروں اور قوموں کے درمیان امتیاز بھی تہذیب سے پیدا ہوتا ہے۔ تہذیبیں ثقافتی اکائی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ سیاسی نہیں یہی وجہ ہے کہ کسی ایک تہذیب کے اندر ایک سے زیادہ سیاسی ملک بھی ہو سکتے ہیں جیسے مسلم تہذیب میں مسلم ممالک۔ مغربی تہذیب میں مغربی ممالک اور ایک تہذیب میں ایک ملک جیسے جاپان، اسی تناظر میں وہ ہنٹنگٹن (Huntington) کا حوالہ دیتے ہیں جو مذہب کو تہذیبوں کی مرکزی شناخت قرار دیتا ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ کہتے ہیں۔ کہ کلچر عقیدوں سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح ول ڈیورنٹ (Will Durant) معاشی سہولت۔ سیاسی تنظیم۔ اخلاقی روایات اور علمی استعداد کو تہذیب کے عناصر ترکیبی قرار دیتا ہے۔ یہاں مصنف نے سید سبط حسن کے حوالے سے چار بنیادی عناصر یعنی طبعی حالات۔ آلات واوزار۔ نظامِ فکر واحساس اور سماجی اقدار کو تہذیب کے اجزائے ترکیبی بتایا ہے۔ اور مزید کہا ہے کہ مورخین وماہرین جن میں اسپنگلر (Spangler) ٹائن بی (Toynbee) اور ہنٹنگٹن (Huntington) شامل ہیں۔ تہذیبی تکثیریت کے قائل ہیں۔

اسلام اور مغرب کے درمیان روابط کے ضمن میں ڈاکٹر آصف اسلامی تہذیب کے طلوع کو

تہذیبوں کے مابین رابطے کا ایک اہم سنگ میل قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں مسلم تہذیب کے منصۂ شہود پر آنے کے بعد اسلام ایک عالمی نظام اور عالمگیر ریاست تو بن گیا لیکن دیگر قوموں کی تنگ نظری۔ جہالت اور تعصب کے باعث عالمی تہذیب نہ بن سکا۔ مغربی تہذیب ۷۰۰ء اور ۸۰۰ء کے لگ بھگ نمو پذیر ہوتی ہے اور اس طرح اس کی جڑیں یونان اور روم کی قدیم تہذیبوں میں پیوست ہیں اور اس کے اہم مراکز آج بھی یورپ شمالی امریکہ اور لاطینی امریکہ میں ہیں۔ ۱۵۰۰ء کے بعد سے آئندہ چار سو سال تک دوسری تہذیبیں مغربی تہذیب کے غلبہ میں آتی رہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد کمیونزم اور لبرل ازم کے مابین سرد جنگ شروع ہوئی جس کے نتیجہ میں دو سپر طاقتیں وجود میں آئیں۔

بعض مغربی دانشوروں کے مطابق سویت یونین کی شکست وریخت کے بعد اگلا نظریاتی چیلنج اسلام ہے اور رواں اکیسویں صدی تصادم کی صدی ہو سکتی ہے جس کے پس منظر میں صلیبی جنگیں۔ عثمانی دور کی وسیع ترین سلطنت جسے یورپ تک وسعت حاصل ہو گئی تھی نیز مغرب کا عہد اقتدار اور نو آبادیاتی نظام منطقی تسلسل کی شکل میں کارفرما نظر آتے ہیں۔ سید ابوالحسن ندوی نے بھی یہ کہہ کر کہ عالم اسلام سب سے زیادہ مغربی تہذیب کی زد پر رہا ہے اسلام اور مغرب کے درمیان ماضی کی مسلسل آویزش کی طرف اشارہ کیا ہے۔

باب سوم و چہارم میں صاحب کتاب موضوع پر اقبال کے حوالے سے اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں اور بتاتے ہیں علامہ نے اسلامی اور مغربی تہذیب کا باقاعدہ تقابلی مطالعہ قیام یورپ کے دوران کیا۔ تیرھویں صدی عیسوی میں سقوطِ بغداد کے بعد ہی سے اسلام کی بنیادوں میں اضمحلال کے آثار پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے اور سائنسی ترقی میں مسلمانوں کا جذبہ سرد پڑ گیا تھا۔ دوسری طرف سولہویں صدی عیسوی میں مغرب میں احیائے علوم اور اصلاح مذہب کی لہریں اُٹھیں۔ تاہم مسلمانوں میں جب زوال پذیر حالات کا احساس بیدار ہوا تو اٹھارویں صدی کے نصف آخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں مسلمانوں میں زندگی کے آثار پیدا ہونے لگے۔

ڈاکٹر آصف نے علامہ کے مشرق و مغرب کے فکری و نظریاتی مطالعہ پر بھرپور تحقیقی توجہ دی ہے۔ اقبال کے مطابق سیکولرازم میں دین و دنیا کی ثنویت کے نتیجے میں مغرب میں ایک طرف رہبانیت اور دوسری طرف مادیت کا غلبہ پیدا ہوا۔ ان کے تجزیاتی مطالعے میں جغرافیائی قومیت، مغربی جمہوری نظام، سرمایہ دارانہ نظام اور مادہ پرستانہ رجحانات پر بھی ارتکاز توجہ رہا۔ چنانچہ مغربی تہذیب کی تاریخی بنیادوں پر گہری نظر ڈالنے کے بعد اقبال اس نتیجے پر پہنچے کہ جدید مغرب روحانی واخلاقی روشنی اور نظریاتی بنیاد ہی سے محروم ہے جب کہ اسلامی تہذیب ایک ایسا نظام ہے جس نے خدا اور کائنات کے ساتھ انسان کے رابطوں کے اصول بیان کیے جو فکر و عمل کے تمام طریقوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہ اصول جامد نہیں متحرک ہیں رہبانی نہیں انسانی ہیں۔ اسلام نے انسان کو پاپائیت کی غلامی سے نجات دلائی اور بتایا کہ خدا تک پہنچنے کے لیے کسی پادری کی ضرورت نہیں۔ اسلام نے سیاست میں اجماع قوم (اصول انتخاب) کا آغاز کیا اور عقل استقرائی کی بدولت علم کی تلاش اور سائنسی فکر پر زور دیا۔ علامہ نے جب اسلامی اور مغربی تہذیبوں کا مطالعہ کیا تو اُس وقت تہذیبوں کے تصادم کی کوئی تھیوری موجود نہ تھی لیکن ان کی باریک بین نگاہوں اور ذہن رسا نے مغربی اور اسلامی تہذیب کے تصادم واشتراک کا عمیق و مدلل تجزیہ کر لیا تھا۔

ہنٹنگٹن (Huntington) کے مطابق پوری مغربی تاریخ میں پہلے ایک کلیسا اور پھر بہت سے کلیساؤں کا ریاست سے الگ وجود تھا۔ دین و سیاست کی یہ جدائی روح اور مادے کے تصور دوئی کے نتیجے میں عمل میں آئی۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینکا کے مطابق ''سیکولرازم سے مراد ریاستی سیاست یا نظم ونسق کی مذہب یا کلیسا سے علیحدگی ہے اور سیکولر تعلیم وہ نظام تعلیم ہے جس میں دینیات کی تعلم کو الگ کر دیا جاتا ہے''۔ ''سیکولرازم'' کا ذکر علامہ نے اپنے خطبۂ ''اجتہاد فی الاسلام'' میں کیا ہے اس خطبے کے مطابق چرچ اور کلیسا اور مقدس و غیر مقدس کی تقسیم ہی بے معنی ہے۔ مسلمان معاشروں میں تھیوکریسی کا سرے سے کوئی تصور ہی موجود نہیں۔ آج ساری دنیا جس فساد کی لپیٹ میں ہے اقبال کے نزدیک اس کا واحد علاج اخلاق و سیاست کی دوئی کا خاتمہ ہے۔

اقبال نے سیکولرازم کو تہذیب نوی کا تراشیدہ بت قرار دیا ہے اور مغربی وطنیت کو رد کر کے اسلامی وطنیت کی ایسی جدید انسانی توجیہ پیش کی ہے جو آج کثیر الاقوام دنیا میں قابل قبول بھی ہے اور اپنی دوامی و اصولی بنیادوں کو منہدم بھی نہیں ہونے دیتی۔ حضورؐ نے ہجرت کرنے کے بعد اشتراک ایمان کی بنیاد پر مہاجرین اور انصار کو ایک قوم بنا کر ایک ملت اور نظریاتی مملکت کی بنیاد رکھی۔ جس میں دین و سیاست ہم آہنگ تھے۔

اپنے مقالے کو سمیٹتے ہوئے ڈاکٹر آصف علامہ کی فکر کے تناظر میں درج ذیل نتائج اخذ کرتے ہیں۔

- اقبال کے نزدیک مغرب کا سیاسی نظام جو قومی تعصّبات پر مبنی ہے اقوام میں تفریق ملل پیدا کرتا ہے۔
- مغرب کا جدید انسان تمام تر کاروباری یا بیوپاری معاشرے کی پیداوار ہے۔
- آدمیت یہی ہے کہ آدمی کا احترام کیا جائے۔
- مغربی تہذیب الہامی بنیاد سے محروم مادیت وعقلیت کی پیداوار ہے جب کہ اسلامی تہذیب الہامی بنیاد کے ساتھ مادے کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کرتی۔
- اقبال تہذیبی تکثیر اور پر امن بقائے باہمی پر یقن رکھتے ہیں۔
- اقبال مشرق و مغرب اور اسلامی و مغربی تہذیب دونوں میں توازن کے قائل تھے نہ کہ تصادم کے۔

(جولائی۔ستمبر ۲۰۱۰ء)

کھرے سکّے (نقد ادب)

ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی

ایک کثیر الجہت (Versatile) اہل قلم کی حیثیت سے ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی ہرگز محتاج تعارف نہیں ہیں۔ اردو ادب کی نسبت اُن کی تحقیقی و تخلیقی کاوشوں کا دورانیہ نصف صدی سے بھی متجاوز مدت پر محیط ہے۔ انھیں ایک اختصاص یہ بھی حاصل ہے کہ وہ پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں رحمۃ اللہ علیہ جیسی عظیم المرتبت ادبی اور برگزیدہ روحانی شخصیت کے ممتاز ترین تلامذہ میں شامل ہیں اور ادب کی قلمرو میں اعتبار و احترام کے مستوجب سمجھے جاتے ہیں۔ زیر تبصرہ تصنیف ان کے انتقادی سفر کا پانچواں سنگِ میل ہے۔ اس سے قبل راجندر سنگھ بیدی۔ خدیجہ مستور۔ عصمت چغتائی کی افسانہ و ناول نگاری اور فیض احمد فیض کی شاعری پر ان کی تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کے نصف درجن سے زیادہ ناولوں سے ادبی دنیا متعارف ہو چکی ہیں۔ جب کہ اُن کے افسانوں کے مجموعے اپنی فنی اور موضوعی خوبیوں کے باعث قارئین و ناقدین ہر دو سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ یوں تو ڈاکٹر صاحب نے سندھی ادب سے اردو میں تراجم بھی کیے ہیں لیکن ان کی انشائیہ نویسی کا شاہکار مجموعہ ''شگوفے'' ہے جسے اردو اکیڈمی سندھ نے ۱۹۹۵ء میں شائع کیا۔

۴۵۰ سے زیادہ صفحات پر مشتمل زیر نظر کتاب ڈاکٹر صاحب کی فکری و فنی کثیر الجہتی کی مظہر ہے۔ ایک درجن سے زیادہ ابواب متعدد اصنافِ ادب کا احاطہ کیے ہوئے ہیں جن میں صرف ناول و افسانہ اور انشائیہ ہی نہیں بلکہ معاصر اہل قلم کی مختلف النوع شعری و نثری نگارشات پر ڈاکٹر حسرت کے پُر مغز و پُر معنی تبصرے شامل ہیں جو ان کے ذمہ دارانہ رویے اور اضافِ ادب پر حاکمانہ گرفت کی نشان دہی کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے نقد و نظر کی میزان مین نگارشات کے ساتھ ساتھ شخصیات کے اوصاف و اقدار کو بھی جانچا اور پرکھا ہے چنانچہ نقد ادب کو تراز و کرنے کے اس عمل میں ان کا طریق کار برملا طور پر معروضی ہے اور حقیقت پسندانہ۔

جن ناول نگار حضرات کی تخلیقات زیر تبصرہ آئی ہیں ان میں نسیم انجم کا ناول 'نرک' ابولمعانی عصری کا 'شنوزہ' اور قیصر سلیم کا ''نیا نگر بسا لیا ہم نے'' شامل ہیں۔ ''نرک'' جس میں نسیم انجم نے تیسری جنس کو موضوع بنایا ہے ڈاکٹر حسرت کے فنی تجزیئے کے مطابق کردار نگاری، پلاٹ کی بُنت اور اپنے اُسلوب کے اعتبار سے بھی منفرد ہے۔ افسانہ نگاروں میں نعیم صدیقی۔ پروفیسر عزیز جبران انصاری، گلزار جاوید، ڈاکٹر جمیل عظیم آبادی، قیصر سلیم، رئیس الدین طہور جعفری، جمیل عثمان، منظر عارفی اور ثاقبہ رحیم الدین کے افسانوی مجموعوں پر صاحب کتاب نے ناقدانہ بحث کی ہے اور نہایت متوازن رائے کا اظہار کیا ہے ان کے مطابق نعیم صدیقی نے اردو افسانے کو ایک نیا آہنگ دیا ہے جب کہ عزیز جبران انصاری کے ہاں مقصدیت کا رچاؤ قاری کے ذہن کو متاثر کرتا ہے۔ گلزار جاوید کے افسانوں کے فکری پہلو پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے حسرت کا سگنجوی ان کی موضوعی بصیرت کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں معاشی، معاشرتی اور اخلاقی مسائل پر افسانہ نگار کے ارتکاز توجہ اور سیاسی امور سے صرفِ نظر کرنے کے رویّے کو سراہتے ہیں۔ ان کی رائے میں ڈاکٹر جمیل عظیم آبادی کو کہانی کہنے اور سننے کا ڈھنگ آتا ہے ان کی کہانیاں اپنا راستہ خود بناتی ہیں جن میں نفسیات کے رموز و نکات سے افسانہ نگار کی آگاہی نمایاں عنصر ہے۔

اس باب میں افسانوی ادب کے موضوع پر بانو قدسیہ سے مکالمہ توجہ طلب ہے اور وہ اس لیے کہ سوال و جواب کی معنویت نے افسانہ اور افسانہ نگاروں کے فکری، فنی اور موضوعی تنوعات کو سیاق و سباق کے حوالے سے ایک خوبصورت اظہاریے کی شکل دیدی ہے۔ انشائیہ کے باب میں ڈاکٹر صاحب نے اکبر حمیدی اور غفار پاشا کے انشائیوں پر ان الفاظ کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے کہ ''انشائیے کے فن میں ہر روز اضافہ ہو رہا ہے۔ نئی نئی توقعات کی جا رہی ہیں اس کا کینوس وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے ہم ایک شاندار مستقبل کی توقع کر سکتے ہیں'' اور بیک وقت یہ بھی فرما دیا ہے کہ ''وزیر آغا ہوں یا اکبر حمیدی ہم سب ابھی سیکھنے کے عمل سے گزر رہے ہیں'' اکبر حمیدی کے انشائیوں کے بارے میں صاحبِ کتاب کی رائے ہے کہ وہ ہوا کا ایک تازہ جھونکا ہیں۔ اکبر حمیدی کے جملے ڈھلے ڈھلائے، بنے بنائے۔ ترشے ترشائے اور چست ہوتے ہیں۔ جب کہ غفار پاشا

بساطِ انشائیہ پر نو وارد ہونے کے باوجود بلا کے زود نگار ہیں اور معیار پر بھی نظر رکھتے ہیں

کتاب کی بسیکا و محیط نگارشات میں ایسے ابواب بھی شامل ہیں جو صاحب کتاب کی ارادت وعقیدت کے غماز ہیں مثلاً ''خیال رفتگاں'' کے زیرِ عنوان صاحب کتاب نے پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، سید رفیق عزیزی اور پروفیسر ڈاکٹر ابوالخیر کشفی (مرحومین) کی شخصیات اور فکروفن کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے۔ شعری تبصرہ وتنقید کے ضمن میں بھی ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی نے بعض شعراء کا محتاط انتخاب کیا ہے۔ جن میں دیگر کے علاوہ ڈاکٹر خیال امروہوی اور ماہر القادری کے اسماء نمایاں ہیں، ڈاکٹر خیال کے بارے میں فرماتے ہیں:

''خیال کی زندگی کے تمام رُخ ان کی شاعری اور نثر میں نمایاں ہیں ان کی جد و جہد ان کا علم، ان کی بصیرت کا عکس ان کی شاعری میں ہے''

ماہر القادری کی شاعری پر ڈاکٹر حسرت کی بلاغتِ نظر اور انتقادی جامعیت ملاحظہ فرمائیے۔

''ان کی شاعری میں اختر شیرانی کی سی رومان پسندی، جوش کا بہاؤ اور لغت والفاظ پر گہری گرفت اور حفیظ کی سی نغمگی پائی جاتی ہے۔''

اس تنقیدی جائزے میں ہماری نظر ماہر کے درج ذیل شعر پر پڑی جس سے ڈاکٹر حسرت کی رائے کی مکمل تائید ہوتی ہے:

میں ہر افق سے طلوع ہو کر جہاں میں ظاہر ہوا ہوں ماہر　　　کہیں مرا طرز ناصحانہ، کہیں مرا رنگ عاشقانہ

زیرِ تبصرہ کتاب میں ڈاکٹر حسرت کے بعض تحقیقی وتنقیدی مضامین بھی شامل ہیں جو جزواً کلاسیکی ادب کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان میں ''نثری نظم کا منفی رجحان'' کے زیرِ عنوان صاحب کتاب کے تاثرات دیکھنے کو ملے جن سے اندازہ ہوا کہ نثری نظم کی 'لایعنیت' پر ان کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا ہے۔ چند جملے ملاحظہ ہوں:

- ایک سوال بار بار ذہن میں آتا ہے کہ نثری نظم، نظم ہے بھی یا نہیں!
- جب اس شاعری کو تولا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ تو پیاز کے چھلکے ہیں
- نثری نظم کے تخلیقی کارناموں کی روشنی میں (اسے) ذہنی دیوالیہ پن بھی کہہ سکتے ہیں۔

○ نثری نظم گو کو یہ غلط فہمی بھی ہے کہ وہ اپنے دور کے سقراط و بقراط ہیں۔

حسب روایت زیر نظر تصنیف بعض تقریظ نگار حضرات کے عطا کردہ جواہر پاروں سے مزین ہے۔ اداریہ شبیر احمد انصاری نے تحریر فرمایا ہے جو کتاب ہذا کے ایک پبلشر ’حرا فاونڈیشن پاکستان، کے بانی ہیں۔ آغاز کلام اس طرح فرماتے ہیں:

”جس درخت سے جتنے زیادہ پھل ہاتھ لگنے کی امید ہوتی ہے۔ اس پر پتھر بھی اتنے ہی زیادہ برستے ہیں۔ یہی کیفیت یہی منظر نامہ ڈاکٹر صاحب کا ہے۔ اپنی کتابوں پر حروفِ امتیاز لکھوانے والوں کا ایک انبوہِ کثیر ہے۔ سینئرز بھی اور نئے لکھنے والے بھی ان کے گرد ڈیرہ ڈالے رہتے ہیں“

اس کے بعد جن حضرات نے مختلف عنوانات کے تحت تقاریظ تحریر فرمائی ہیں ان میں ڈاکٹر عزیز انصاری، ڈاکٹر احمد رفاعی، ابوسعادت جلیلی، ڈاکٹر جمیل عظیم آبادی اور سید محمد قاسم شامل ہیں۔ ان حضرات نے ڈاکٹر کا سگنجوی کی حکمت و دانش۔ علم وفن اور درویشی و منکسر مزاجی کو خراج تحسین پیش کیا ہے لیکن آخر الذکر نے اس کے علاوہ ان صاحبان تصنیف و تالیف کی نسبت جنھیں ڈاکٹر صاحب نے اپنے نقد و تبصرہ سے نوازا جو کچھ لکھا وہ انتہائی غیر متوازن بھی ہے اور صرف محلِ نظر ہی نہیں اُن سب کی توہین بھی ہے جن میں نو وارد بھی شامل ہیں اور صاحب تجربہ اہل قلم بھی۔ سید محمد قاسم لکھتے ہیں:

”اکثر و بیشتر علمی و ادبی اور تحقیقی کتابوں پر مقدمہ، پیش لفظ، تقاریظ و پیشوائی وغیرہ لکھوانے کے لیے ہاتھ میں کاسۂ گدائی اٹھائے شاعر، ادیب، مولف، مصنف، بلکہ تمام علوم وفنون سے تعلق رکھنے والے افراد ادب کے حیرت کدہ میں منزل کے سراغ کی تلاش میں گم ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔“

اس بے ربط عبارت کے فاضل مصنف سے ہم صرف یہ پوچھنا چاہیں گے کہ کیا علاّمہ اقبال کے ہاتھ میں بھی کوئی کاسہ گدائی تھا جب شیخ عبدالقادر مرحوم نے علاّمہ کے اولین شعری مجموعہ ”بانگِ درا“ پر پیش لفظ لکھا تھا؟

(جولائی۔ستمبر ۲۰۱۰ء)

دیدہ ور (انٹرنیٹ میگزین)

رضیہ مشکور

یقیناً یہ ایک احسان ہے اردو زبان وادب کے خوشہ چینوں پر اُن دیدہ ورانِ علم وحکمت کا جو چار دانگِ عالم میں ایک ایسی زبان کی شمعیں روشن کیے ہوئے ہیں جس کا ادب اپنے معیار۔ تنوع اور ہمہ گیرت کے اعتبار سے ادبِ عالیہ کے مقام پر فائز ہے۔ ''دیدہ ور'' سال ۲۰۰۷ سے انٹرنیٹ پر باقاعدگی سے شائع ہونے والے مجلّے کی حیثیت سے عالمی سطح پر 'یاران نکتہ داں' کے لیے 'صلائے عام' بنا ہوا ہے۔ اس کی پیش کش کا اعزاز ایک ایسی تنظیم یعنی ''علی گڑھ اردو کلب'' کے حصہ میں آیا ہے جس کی لفظی ومعنوی اشاریت سر سید وشبلی سے لے کر عہد حاضر تک بے شمار نابغۂ روزگار ہستیوں کا تابناک پس منظر وپیش منظر مہیا کرتی ہے۔ مجلّے کی تدوین وترتیب کی سعی مشکور مدیر شہیر محترمہ رضیہ مشکور کے مرہون منت ہے اور مدیرانِ اعزازی میں جناب محمد طارق غازی (کینڈا) اور پروفیسر محمد اویس جعفری (امریکہ) کے معتبر ومحترم اسمائے گرامی شامل ہیں۔

زیر نظر شمارہ اکتوبر ۲۰۰۸ سے اکتوبر ۲۰۱۰ء تک شائع شدہ شماروں کی منتخب نگارشاتِ نظم ونثر پر مشتمل ہے جو مجلّد تین سو سے زیادہ صفحات پر محیط ہے اور جسے امریکہ کی مشہور ریاست میساچوسٹس کے شہر ویک فیلڈ سے جاری کیا گیا ہے۔ یہ ضخیم وزعیم شمارہ آٹھ ابواب میں منقسم ہے۔ اداریہ میں محترمہ رضیہ مشکور ''ادب میں جھنجلاہٹ'' کی اصطلاح کے تعارف کے ساتھ فرماتی ہیں کہ ''اس وقت پوری انسانیت بالخصوص اُمتِ مسلمہ کو جو مسائل درپیش ہیں ان کا اندازہ بھی ہمارے قلم کاروں کو نہیں ہو رہا ہے اور جو چند ایک اس کی طرف غور وفکر کر رہے ہیں ان کی بے بسی اور جھنجلاہٹ ادب میں صاف سنی جاسکتی ہے''

''دیدہ ور'' کے مطالعہ کے دوران میں نے فاضل مدیرہ کی اس رائے کی صدائے بازگشت خود سنی ہے بالخصوص نثری حصّے میں۔ جناب حبیب الرحمٰن نے اپنے مضمون ''اردو زبان اوراس کا مستقبل'' میں اردو کی لسانی لچک اور جغرافیائی ماورائیت کے سیاق وسباق میں اُن بصیرت باختہ

تجاویز کو یکسر مسترد کر دیا ہے جن کے ذریعہ اردو رسم الخط کی تبدیلی پر اصرار کیا جاتا ہے۔ وہ بجا طور پر فرماتے ہیں:

''ہمیں اردو سے اس مخصوص رسم الخط کے ساتھ جذباتی لگاؤ نہیں بلکہ یہ ہماری تہذیب، تاریخ اور ثقافت کا سرچشمہ ہے۔ اس میں ہمارا دینی سرمایہ محفوظ ہے۔ یہ ہمیں اس لیے عزیز ہے کہ ہماری شناخت ہے۔ زبان اور رسم الخط کا تعلق روح و جسم کا تعلق ہے۔۔۔ اُردو کا کوئی وطن نہیں، کوئی مخصوص زمانہ نہیں۔ یہ اس کی بدنصیبی نہیں بلکہ اس کی خوبی ہے، یہ عالمگیر زبان ہے۔ جغرافیائی حدود سے ماورا پوری دنیا اس کا وطن ہے۔''

صاحبِ مضمون کے اس دعوے کی تصدیق سال ۲۰۰۸ء میں اقوامِ متحدہ کے ذیلی ادارے 'یونیسکو' کی اُس رپورٹ سے ہوتی ہے جس کے مطابق دنیا کی کم و بیش چھ ارب آبادی میں ایک ارب سے زیادہ افراد جس زبان کو بولتے اور سمجھتے ہیں اُسے 'ہندستانی' کا نام دیا گیا ہے حالانکہ 'ہندوستانی' نام کی زبان دنیا میں کہیں نہیں پائی جاتی بلکہ ہندوستان کی بھی جو قومی اور سرکاری زبان ہے وہ 'ہندی' ہے 'ہندوستانی' نہیں۔ حقیقتاً یہ اردو ہے جس کو خود 'یونیسکو' کے اعداد و شمار کی روشنی میں اقوام متحدہ کی سرکاری زبانوں میں شامل کیے جانے کا حق پہنچتا ہے۔ یقین ہے کہ 'دیدہ ور' عالمی سطح پر اور بالخصوص امریکہ میں اقوام متحدہ کے ادارے میں اس ناقابلِ تردید دلیل کو منوانے کے لیے موثر کردار ادا کر سکتا ہے۔

جناب محمد طارق غازی کے پُر مغز و پُر معنی مضمون بعنوان ''دوسری جنگ کی سیاست کا ادب'' کو میں نے بالاستعیاب مطالعہ کیا جو فاضل صاحب مضمون کی عمیق بصیرت۔ وسیع المطالعہ شخصیت تجربہ و مشاہدہ کی اصابت اور اعلیٰ تاریخی شعور کا مظہر ہے۔ یہ مضمون جس بلاغت فکر اور زبان و بیان کے اوصاف سے مملو ہے اُس نے 'دیدہ ور' کو اور بھی کشیدہ قامت بنا دیا ہے۔ مثلاً طارق صاحب کا بزرگ صحافی کلدیپ نیّر کی اخباری اطلاعات کے مطابق لاہور کے ایک اجلاس میں ''سب سے اہم تقریر'' پر مختصر ترین تبصرہ گنجینۂ معانی کی حیثیت رکھتا ہے اپنی تقریر میں نیر صاحب نے تشویش

ظاہر کی تھی کہ امریکہ کی سر کردگی میں عَولمہ (Globolization) کی تحریک کے ذریعہ ساری دنیا میں صرف ایک تہذیب اور ایک ثقافت کو رائج کرنے کی راہ ہموار کی جا رہی ہے۔ طارق صاحب فرماتے ہیں کہ ''میرے خیال سے کلد یپ نیر کو اظہار تشویش کرنے میں ۲۷ سال کی تاخیر ہوگئی'' اسی طرح ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ ''کشور ناہید کس پائے کی شاعرہ ہیں اس کا فیصلہ میں نہیں کرتا۔ مشفق خواجہ یعنی خانہ بدوش زندہ ہوتے تو وہ کرتے۔۔۔۔ مدیرۂ شہیرہ (کشور ناہید) لکھتی ہیں ''تشکر لا الہ'' ہے۔ چاہیں تو شمس الرحمٰن فاروقی انھیں بتا دیں کہ اگر وہ اردو زبان دانی میں کمزور ہیں تو سیدھا سادا 'اللہ کا شکر ہے' لکھ دیا کریں۔ اور یہ بھی بتا دیں کہ اقبال کے مصرعہ ''زباں سے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل'' کے لا الہ اور کشور ناہید کے لا الہ میں سمندروں کا فرق کیا ہے اور یہ بھی جتا دین کہ میں نے یہ ایک انگریزی محاورے کا تحت اللفظ ترجمہ کیا ہے''

''دیدہ ور'' کے اس جاذب توجہ انتخاب میں شامل کئی تحریروں کی معنویت و انفرادیت نے آگے بڑھنے سے بار بار روکا یعنی ''کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست'' تاہم میں جناب علیم خان فلکی کے وقیع مضمون بعنوان ''آزاد شاعری کی معنویت اور مقصدیت'' سے درج ذیل عبارت نقل کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ملاحظہ ہو:

''شعر سمندر کو کوزے میں بند کرنے کا فن ہے۔ شاعری فکر رسا کی متقاضی ہے۔ احساس و جذبات کی شدتیں چاہتی ہے لیکن ایک سطحی خیالات رکھنے والا عام آدمی اس سے محروم رہتا ہے اس لیے وہ شاعری جس سطح کی کر سکتا ہے اُسے آزاد شاعری کا نام دے دیتا ہے۔''

زیر نظر نگارشات کے حسن انتخاب کے علاوہ حسن ترتیب میں جو محرک کار فرما نظر آتا ہے اس کا اظہار آغاز کلام کے طور پر حمد و نعت کے باب سے ہوتا ہے۔ اویس جعفری صاحب کی ''دعائے نیم شب'' (مناجات) خضوع و خشوع کی جن کیفیات کی حامل ہے اور لفظ و معانی کا جو مودبانہ در و بست نظر آتا ہے اس کا اندازہ ان اشعار سے ہو سکتا ہے:

آہوں کو رسا کر دے نالوں کو اثر دیدے　　　ہر موج تنفس کو توقیر شرر دیدے

سینہ ہو مرا یا رب آماجگہ عرفاں　　ظلمت کدۂ دل کو تنویر سحر دیدے

شاعری کی دیگر اصناف میں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ غزل گوئی کا معیار عصری موضوعات پر توجہ مرکوز کرنے کے ساتھ ساتھ غزل کے اُسلوب و آہنگ کے حسن کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ ملاحظہ ہو:

کلیم حاذق:

سانس لینا بھی تو دشوار نظر آیا مجھے　　شہر کا شہر ہی بیمار نظر آیا مجھے

راشد آذر:

یہی سوچتے رہے رات بھر کہ بساط ہو تو دیا جلے　　غم عاشقی غم زندگی سے نجات ہو تو دیا جلے
ترا نام آئے زبان پر تو چراغ خانہ بھڑک اُٹھے　　ترا ذکر ہو تو ہو روشنی تری بات ہو تو دیا جلے

مبشر سعید:

بات دریا بھی کبھی رُک کے کیا کرتا تھا　　اب تو ہر موج گزرتی ہے کنارہ کر کے
اک دیا اور جلایا ہے سحر ہونے تک　　شب ہجراں ترے نام ایک ستارہ کر کے

ایک اور واضح رجحان جو مطبوعہ غزلوں سے مترشح ہوتا ہے وہ ہجرت کا دل شکن احساس ہے۔ مثلاً

عبداللہ جاوید:

سمندر پار آ بیٹھے مگر کیا　　نئے ملکوں میں بن جاتے ہیں گھر کیا
ہر اک رستے پہ چل کر سوچتے ہیں　　یہ رستہ جا رہا ہے اپنے گھر کیا

ولی عالم شاہین:

عذابِ نقل مکانی تو اک بہانہ ہے　　سگِ زمانہ جہاں ہے سگِ زمانہ ہے
بھری تھی آنکھ میں جو چاندنی شب رفتہ　　یقین کیسے کروں آج وہ فسانہ ہے

دیگر ابواب میں ’کلاسیکل گوشہ‘ کے زیر عنوان رفتگاں کی ایک کہکشاں سجی ہے جن میں سے

ہرایک افسانہ وناول کی شاہراہِ عظیم کا ایک سنگ میل ہے اور آج کے لکھنے والوں کے لیے چراغ راہ۔ عصمت چغتائی، قراۃ العین حیدر، منشی پریم چند، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی اور ممتاز مفتی کے فکروفن سے اُن کے معروف ومقبول شہ پارے یکجا کردیئے گئے ہیں جو مدیرانہ بصیرت کے غماز ہیں۔ اسی طرح معاصر افسانہ نگاروں کو بھی پوری فراخ دلی سے نمائندگی دی گئی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ وہ عصری موضوعات جو ہمارے کہانی یا افسانہ لکھنے والوں کی توجہ مبذول کراتے ہیں واضح انداز میں سامنے آگئے ہیں یہی نہیں بلکہ افسانے کے فن کو اختراعی ذہن نے کہیں کہیں جن تجربات کے تابع کیا ہے وہ ناقدین کی توجہ کا متقاضی ہے۔

آخر میں ایک بات کا مشورۃً عرض کردینا نہایت ضروری ہے کہ ایسی یادگار اور منفرد ادبی دستاویزات کو پروف خوانی کے تسامحات سے جسقدر بھی محفوظ رکھا جاسکے وہ اب اور آئندہ بھی قارئین کے لیے موجب تشکر ہوگا۔

(اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۰ء)

اردو ادب۔۔۔تہذیب وتنقید

ڈاکٹر شمیم طارق

تحقیق وتنقید دو ایسے شعبے ہیں جو ادب کے معیار و کردار کے پروردگار بھی ہیں اور حُرمت و عظمت کے ضامن بھی۔ ایک زمانہ تھا کہ اردو زبان وادب کے ان شعبوں کو بے بضاعتی پر محمول کیا جاتا تھا۔ لیکن اب اس ضمن میں ایک توانا وارتقا پذیر تسلسل نظر آتا ہے۔ البتہ تخلیقی رجحان معیار سے زیادہ مقدار پر مرکوز ہے جس کے اثرات نثر سے زیادہ شعری اصناف پر مرتب ہو رہے ہیں غالباً اس کا اہم سبب کلاسیکی ورثے سے خاصی بے خبری ہے۔ اس طرف نسلِ نو کو سنجیدہ توجہ دینا پڑے گی۔ ورنہ شعری دواوین کی تعداد تو بڑھتی رہے گی لیکن تنقید کے ارتقا پذیر معیار انھیں مسترد بھی کرتے رہیں گے۔

مجھے یہ احساس ڈاکٹر شمیم طارق کی زیرِ نظر کتاب کے مطالعہ سے ہوا۔ ان کا تنقیدی شعور پختہ اور وسعتِ مطالعہ سے مالا مال ہے۔ مصنفہ نے کتاب میں اپنے دس مطبوعہ مضامین شامل کئے ہیں جن میں سے بیشتر تنقید و تحقیق کی تاریخ کے جائزے پر مشتمل ہیں جن سے خاص طور پر جامعات کی سطح کے طلباء و طالبات استفادہ کر سکتے ہیں۔ کتاب میں اردو زبان وادب کے تدریجی فروغ کے متوازی عہد بعہد کی تخلیقات کا جس بلاغتِ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے وہ مصنفہ کی اصابتِ رائے کا مظہر ہے اس سلسلہ میں ان کا پہلا اور آخری مضمون خاصے اہم ہیں۔

ڈاکٹر شمیم نے زبان اور ادب کی نشو ونما میں صوفیاء اور اُمرا کے بنیادی کردار کو معتبر حوالوں اور مثالوں سے واضح کیا ہے۔ شیخ فریدالدین گنج شکرؒ کے ''ملفوظاتِ اولیاءؒ'' کا حوالہ شیخ شرف الدین بوعلی قلندرؒ کے دوہے۔ حضرت امیر خسروؒ کی فارسی و ہندی الفاظ کے امتزاج پر مشتمل مقبولِ خاص و عام شاعری ہی نہیں بلکہ مصنفہ نے کبیر اور گورو نانک کے کلام میں اسلامی عقائد و افکار کی طرف توجہ دلائی ہے اور اپنے دعوے کے ثبوت میں حافظ محمود شیرانی کی تحقیق ''پنجاب میں اردو'' سے بھگت کبیر سے متعلق درج ذیل عبارت نقل کی ہے:

"ہندی زبان کا درحقیقت پہلا بڑا شاعر ہے۔ اس کا کلام سادگی، تاثیر، صفائی، جدّت، معنی آفرینی، سوز و گداز اور شیرینیٔ ادا کے اوصاف سے آراستہ ہے۔"

اُمراء کی شعری و لسانی سرپرستی کے حوالے سے ڈاکٹر شمیم نے گولکنڈہ۔ اور بیجاپور کے بہمنی سلاطین کا ذکر کیا ہے جنھوں نے اہلِ قلم صوفیاء کی سرپرستی کی۔ عادل شاہ کے عہد میں حضرت برہان الدین جانم کی تصانیف "ارشاد نامہ" "منفعت الایمان اور "وصیت الہادی" قابل ذکر ہیں۔ بہمنی سلطنت میں فخر الدین نظامی کی مشہور مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' تخلیق کی گئی ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد میں اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت دی گئی۔ عادل شاہ کے دربار کا 'ملک الشعراء' نصرتی تھا۔ اسی کے دور میں سید میران شاہ ہاشمی کے قصائد اور مثنوی کے علاوہ غزل کی شہرت بامِ عروج کو پہنچی۔ بیجاپور کی سلطنت کے قیام کے تقریباً اٹھارہ سال بعد قطب شاہی سلطنت کی بنیاد پڑی اس سلطنت کے اکثر بادشاہ خود شاعر تھے۔ سلطان قلی قطب شاہ اردو زبان کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ اس کے دربار سے وابستہ شعراء میں شیخ احمد گجراتی اپنی مثنویوں "لیلیٰ مجنوں" اور "یوسف زلیخا" کے لیے بہت مشہور ہیں۔ قلی قطب شاہ کے دربار کا ملا وجہی "ملک الشعراء" تھا جس کی مثنوی "قلب مشتری" نثری تخلیقات "سب رس" اور "تاج الحقائق" معروف کتب ہیں۔

مصنفہ نے اپنے مقالے میں صوفیاء اُمراء کی ادب دوستی کے تقریباً تمام عنوانات کا اجمالاً جائزہ لیا ہے اور اہل علم میں دیگر کے علاوہ ابنِ نشاطی اور غواصی کی تخلیقات کے حوالے دیئے ہیں۔ انھوں نے میر و سودا کی شاعری کا بھی سماجیاتی جائزہ نہایت دقتِ نظر سے لیا ہے اور کہا ہے کہ "میر و سودا کا دور اُس انتشار کے دور سے تعلق رکھتا ہے جب برصغیر کی سلطنت میں اندرونی سازشوں کے ساتھ ساتھ نادر شاہ اور احمد شاہ جیسے وحشی حملہ آوروں نے دلّی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ یہ وہ حالات تھے جن میں میر اور سودا نے اپنے عہد کا کرب، انتشار اور اضطراب اپنے شعروں میں بیان کیا" میر کا درج ذیل شعر اسی حقیقت کی تصدیق کرتا ہے

شہاں کہ کُحلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی   اُنھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

مصنفہ نے ''لکھنوی تمدن اور اردو شاعری'' کے زیر عنوان لکھا ہے کہ ''لکھنوی معاشرہ ایک افسانوی معاشرہ تھا'' مصنفہ کا یہ جملہ ادب و شاعری کے اُس معروضی احوال کا ترجمان ہے جو سلاطین اودھ کے درباروں میں شعری ابتذال کی علامت بن گیا تھا۔ اور بقول رام بابو سکسینہ ''شعراء نے اپنے ہاتھوں خود کو ذلیل کرلیا'' ڈاکٹر شمیم نے لکھنؤ کی ہوس گزیدہ شاعری کے اس دور میں دیا شنکر نسیم کی مثنوی ''گلزارِ نسیم اور نواب مرزا شوق کی ''زہر عشق'' کو اردو شاعری کا بجا طور پر اثاثہ قرار دیا ہے۔ انھوں نے صنف مرثیہ میں انیس و دبیر کو خراج تحسین پیش کیا ہے جنھوں نے مرثیے کو معراجِ کمال تک پہنچایا۔

کتاب کے زیر نظر مضامین میں (۱) ''اکبر، اقبال اور تہذیبِ فرنگ (۲) ''نوآبادیاتی دور میں کلاسیکی اصناف کا زوال' (۳) سرسید تحریک اور ادبی تغیرات (۴) ترقی پسند انتقادی معیارات اور (۵) 'تحقیق و تدوین۔۔ بنیادی اصول اور مباحث' بصیرت افروز مضامین ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد کے حالات کا معروضی جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر شمیم طارق اُن تین طبقات پر توجہ مرکوز کرتی ہیں جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے ردِعمل کے طور پر ہندوستانی معاشرے میں واضح طور پر نظر آرہے تھے۔ پہلا طبقہ اجنبی تہذیب اور مقامی معاشرت میں ہم آہنگی کا خواہاں۔ دوسرا نئی تہذیب کو قبول کرنے سے منکر اور تیسرا نظام نو کا مخالف۔ رسالہ ''اودھ پنچ'' اس طبقہ کا ترجمان تھا اور سرسید کی تحریک کا شدید مخالف۔ اکبرالہ آبادی مشرقی تمدن کے قصرِ عالیشان کے انہدام پر سخت رنجیدہ تھے اور اسی وجہ سے سرسید کے مخالف تھے۔ اس سلسلہ میں مصنفہ نے ڈاکٹر وزیر آغا کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ اکبر کی مغرب پر تنقید کو ان کا احساس کمتری سمجھتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر تحسین فراقی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے۔

''اکبر کی شریعت کا اقبال تسلسل ہیں جس طرح حضرت عیسٰی سے پہلے یوحنا نے ظہور کیا، اقبال سے پہلے اکبر نے ظہور کیا''

اس قول کی تصدیق میں ڈاکٹر تحسین نے علامہ کے ایک خط کا حوالہ دیا ہے چنانچہ ڈاکٹر شمیم

کہتی ہیں:

''اقبال کا اکبر کو اپنا پیر و مرشد تسلیم کرنا اپنی جگہ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ تہذیب مغرب پر اقبال کی تنقید میں جو عمق اور وسعت ہے وہ ان کے پیش رو کے ہاں خال خال ہے۔''

مصنفہ کا مزید یہ کہنا کہ ''کسی بھی عہد یا خطہ میں مروج شعری اصناف کی تشکیل صرف بحور، عروضی نظام یا قوافی کی ترتیب کے باعث نہیں ہوتی بلکہ اس کے مزاج اور ماحول سے متشکل ہوتی ہے'' اپنی جامعیت کے اعتبار سے ایک عالمگیر صداقت کے مصداق ہے۔ اس سلسلے میں وہ دیگر نقادوں مثلاً ڈاکٹر عبادت بریلوی، مجتبیٰ حسین، گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر جمیل جالبی وغیرہ کی آرا پیش کر کے اپنے نقطۂ نظر کو کہ نو آباداتی دور میں کلاسیکی اصناف رو بہ زوال رہیں معاونت فراہم کرتی ہیں، وہ سر سید اور اُن کی تحریک کو خراجِ تحسین پیش کرتی ہیں۔ رہا ترقی پسند اقتصادی معیارات کا سوال تو مصنفہ یہاں بھی اپنے مطالعہ کی بنا پر اپنی رائے کا اظہار کرتی ہیں ان کے خیال میں ترقی پسند ناقدین میں سب سے اہم نام اختر حسین رائے پوری کا ہے جنھوں نے اپنی کتاب ''ادب اور انقلاب'' میں ترقی پسندی کا مفہوم واضح کیا۔ سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کے روح و رواں تھے اور بحیثیت ناقدین احتشام حسین اور مجنوں گورکھپوری کے نام بھی بہت وقیع اور معتبر ہیں۔ ان کے خیال میں علی سردار جعفری نے اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب'' لکھ کر خود کو تحریک کے لیے ناگزیر بنا لیا تھا۔ جب کہ ممتاز حسین کے بارے میں یہ قول نقل کیا ہے کہ انھوں نے ترقی پسندوں کی 'بوطیقا' (poetics) لکھی ہے تاہم اس سلسلہ میں عزیز احمد کے نام کو ڈاکٹر شمیم قابلِ قدر سمجھتی ہیں۔ عزیز احمد نے شاعری اور فکشن پر تنقید کی جب کہ وہ خود بھی ایک اعلیٰ پائے کے ناول نگار تھے۔

ڈاکٹر شمیم فیض صاحب کو بحیثیت شاعر ترقی پسندوں میں زیادہ معتبر سمجھتی ہیں اور ان کے مجموعہ مضامین ''میزان'' کو اُن کی ترقی پسندی کا ثبوت! دیگر ناقدین جن کا انھوں نے اس ضمن میں توصیفی ذکر کیا ہے ان میں آلِ احمد سرور، سید وقار عظیم اور ڈاکٹر عبادت بریلوی شامل ہیں۔

زیر نظر کتاب کا آخری باب ''تحقیق و تدوین'' سے متعلق ہے جس میں وہ ڈاکٹر عبداللہ سمیت دیگر اساتذۂ ادب کی آراء کی روشنی میں ادب میں تحقیق و تدوین کے بعض اہم اور بنیادی اُصول بیان کرتی ہیں جو یقیناً تحقیق کی دنیا کے نو واردوں کو بامعنی رہنمائی مہیا کر سکیں گے۔ ڈاکٹر شمیم طارق کی زیرِ تبصرہ کتاب کو بلاشبہ اُن کے فنی شعور کا درخشاں دیباچہ کہا جا سکتا ہے جس میں مستقبل کے بے پناہ امکانات کی نشان دہی ہوتی ہے۔

(جنوری۔ مارچ ۲۰۱۱ء)

بیسویں صدی کی اردو شاعری

ڈاکٹر انور سدید

''ڈاکٹر انور سدید پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ انھوں نے پڑھا زیادہ ہے یا لکھا؟ شاید ہی کوئی کتاب ہو جو اُن کی نظر سے نہ گزری ہو اور شاید ہی کوئی موضوع ہو جسے ان کے اشہب جہندۂ قلم نے پامال نہ کیا ہو۔''

عین ممکن تھا کہ میں ڈاکٹر انور سدید کے متعلق مرحوم مشفق خواجہ کی درجِ بالا رائے کو مبالغہ پر محمول کرتا لیکن حسنِ اتفاق کہ مجھے ہر دو شخصیات سے شرفِ تعاف و نیاز مندی حاصل ہے۔ خواجہ صاحب کی اصابت رائے اور محتاط و ذمہ دارانہ نقد و نظر کے روّیوں کا میں ہمیشہ معترف رہا ہوں محترم انور سدید سے قبل از تعاف کا عہد بھی ان کے علم و فن سے کچھ ایسی عدم شناسی کا دور نہ تھا کہ وہ نصف صدی سے بھی زیادہ مدت سے اقلیم ادب کے مشاہیر میں ایک نمایاں شخصیت ہوں اور میں اُنھیں نہ جانتا ہوں لیکن اُن سے ذاتی تعلق و ارادت کے بعد سے ان کے فکر و فن کی ہمہ جہتی بالخصوص ان کی انتقادی بصیرت کا میں دل سے معترف ہوں۔ زیرِ نظر کتاب کے مطالعہ نے مزید ثبوت فراہم کر دیا ہے کہ انور سدید ایک عہد بسیط کی مکمل آگہی کی علامت اور اس کی بوقلمونی کے چشم دید گواہ ہی نہیں بلکہ ایک معتبر شناخت بھی بن چکے ہیں۔ فاضل مصنف نے ۲۸۰ صفحات پر مشتمل کتاب میں اپنے مطبوعہ مضامین و مقالات کے ذریعہ شعرو ادب سے متعلق معروف و کم معروف اور بعض غیر معروف شخصیات کا انتخاب کر کے کم و بیش ایک صدی پر مشتمل معاصر رجحانات کی ترجمان شاعری اور نمائندہ ادب و صحافت کا معروضی جائزہ لیا ہے۔ مثلاً حکیم آزاد انصاری (۱۹۴۱۔۱۸۷۰ء) جن کا بقول مصنف اردو ادب کی تاریخوں میں تذکرہ کم کم ملتا ہے ان کی زندگی کے معلوم و نامعلوم گوشوں کو ذمہ دارانہ تحقیق کے بعد نہایت خوبصورتی سے متعارف کرایا ہے۔ مجھے خود یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ حکیم آزاد انصاری نے مالیر کوٹلہ اور تھانہ بھون کے

علاوہ میرے وطنِ مالوف گلاؤٹھی (ضلع بلند شہر) کے عربی مدرسے ''منبع العلوم'' میں بھی تعلیم حاصل کی جس کی بنیاد حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ (۱۸۸۰۔۱۸۳۲ء) نے ۱۸۶۷ء میں اپنے دستِ مبارک سے رکھی اور جسے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی گرانقدر کاوشوں اور عظیم مدبرانہ اور عالمانہ صلاحیتوں کے نتیجہ میں ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ ''دارالعلوم'' کا مقام و منصب حاصل ہوا۔اسی طرح ایک معروف شعر:

افسوس ! بے شمار سخنہائے گفتنی　　خوف فساد خلق سے ناگفتہ رہ گئے

کے خالق کا نام تحقیق طلب تھا اس کی نشاں دہی فاضل مصنف نے حکیم آزاد انصاری کی نسبت کر دی جو ایک زمانے میں عطارد تخلص کرتے تھے:

عطارد کوششِ کسبِ ہنر سے فائدہ کیا ہے　　ہنرمندوں سے بہتر آجکل ہیں بے ہنر دیکھو

انصاری صاحب کے تلامذہ میں منجملہٗ دیگر صفیہ شمیم ملیح آبادی۔محمود علی خاں ماہر دہلوی اور وقار انبالوی شامل تھے جن میں سے مجھے اپنے بچپن میں دہلی کے دو ایک مشاعروں میں جناب ماہر کو سننے کا موقع ملا جن کا یہ شعر میری لوح حافظہ پر آج تک نقش ہے۔

جھونکے حوادثات کے کام اپنا کر گئے　　ماہر چراغِ زیست کی لو تھر تھرا گئی

محترمہ صفیہ شمیم ملیح آبادی کو جو خانوادۂ جوش سے تعلق رکھتی تھیں متعدد بار پاکستان کے مشاعروں میں ترنم ریز دیکھا بھی اور ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ البتہ وقار انبالوی مرحوم سے اپنی انفارمیشن سروس کے دوران (۶۰۔۱۹۵۹ء) لاہور میں خاصا ربط وضبط رہا۔مرحوم بڑے باغ و بہار اور زیرک وطباع انسان تھے انور سدید صاحب نے آزاد انصاری کی شاعری کے مدوجزر جو پیش رو اساتذۂ شعر کے اسالیب کے مرہونِ منت تھے بڑی خوبصورتی سے واضح فرمائے ہیں اور انھیں بنیادی طور پر غزل کا شاعر قرار دیتے ہوئے اشعار کے حوالے دیئے ہیں۔ دو شعر ملاحظہ ہوں:

انسان کی بدبختی اندازے سے باہر ہے　　کم بخت خدا ہو کر بندہ نظر آتا ہے

مجھے آزاد اگر کوئی کسی قابل سمجھتا ہے　　　تو اس کا حسنِ ظن ہے ورنہ من آنم کہ من دانم

''فیض کی غزل میں نعت کا عنصر'' کے زیرِ عنوان صاحبِ تصنیف نے نہایت بلیغ انداز میں فیض مرحوم سے متعلق مذہب سے بیگانگی کا تسلسل سے جو ایک تاثر پایا جاتا رہا ہے اس کا معتبر حوالے سے ازالہ کیا ہے اور ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی کی گرانقدر تالیف ''نعت اور تنقید نعت'' کو بنیاد بنا کر ایسے اشعار پیش کیے ہیں جن میں نعتیہ شاعری کے نقوش نظر آتے ہیں۔ مثلاً:

شمع نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ　　　جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

اور پھر کشفی صاحب کا درجِ ذیل تجزیہ پیش کر کے بات کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا۔

''فیض صاحب کی زندگی اور ان کی شاعرانہ حیثیت میں مذہب کے گہرے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کے جیل کے ساتھیوں کی شہادت موجود ہے کہ وہ ایام اسیری میں درسِ قرآن حکیم دیتے تھے۔ پھر یہ روایت کہ وہ اپنی وفات سے پہلے اپنے آبائی وطن گئے اور وہاں نماز کی امامت کی''

مجھے یہ دیکھ کر بھی خوشگوار حیرت ہوئی کہ ڈاکٹر انور سدید نے ایک ایسے شاعر کو بھی اپنے ایک مقالہ کا موضوع بنایا ہے جو درویش منش۔ عزلت نہاد۔ منکسر مزاج ۔ مرنجاں مرنج اور مستغنی الفطرت تھا۔ بے نیازی کا یہ عالم کہ اپنے کمالات شاعری کو متعارف کرانے یا ذرائع ابلاغ تک رسائی کا خیال تک بھی کبھی ذہن میں نہ آیا اور ہمیشہ خود کو منتخب احباب تک محدود رکھا۔ ''عمر فیضی کی رباعی'' کے زیرِ عنوان اپنے مقالہ میں ڈاکٹر انور سدید نے یہ کہہ کر کہ ''رباعی کے لیے بحرِ ہزج کے جو چوبیس اوزان مقرر ہونے کے باوجود ہر سخن گو رباعی کہنے پر قادر نہیں''۔ عمر فیضی کی رباعیات کے مجموعے ''دشت جنوں'' پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے مرقومہ ''پیش لفظ'' سے یہ اقتباس بھی پیش کیا ہے کہ ''اردو شاعری میں کوئی ابو سعید ابوالخیر کوئی سرمد شہید اور کوئی عمر خیام نظر نہیں آتا''۔ لیکن مجھے جو محمد عمر خاں فیضی سابق متوطن قصبہ اورنگ آباد ضلع بلند شہر (یو۔ پی) اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے فیضان تعلیم و تربیت سے آراستہ ایک دلپذیر و شائستہ شخصیت سے پہلی بار ۱۹۵۶ء میں گورنمنٹ کالج

میانوالی میں متعارف ہونے کا موقع ملا جو بعد میں برسوں کی رفاقت ومحبت میں تبدیل ہو گیا اُس بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ فیضی صرف غزل و رباعی ہی کا نہیں بلکہ ایک کثیر الاصناف شاعر تھا جس نے بالخصوص غزل اور دوہا نگاری میں اُس صلاحیت کا مظاہرہ کیا جو بالعموم نظروں سے اوجھل رہا۔ عمر فیضی کی شخصیت اور شاعری کا نوٹس لینے پر جناب انور سدید کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے فیضی کے صرف تین اصناف شعری سے درج ذیل حوالے دینا چاہوں گا جس کے بعد صاحبان ذوق اور اہل نظر فیضی کے شعری گداز کی کیف پرور لطافت محسوس کر سکیں گے۔:

قطعہ

دلِ خوں گشتہ سدا صبر کی خاطر تر سے　　اشک آنکھوں میں جو بھر آئیں تو پی بھی نہ سکوں
مجھ سیہ بخت پہ اس درجہ عنایات نہ کر　　کہ کبھی تجھ سے بچھڑ جاؤں تو جی بھی نہ سکوں

غزل:

گردن میں تیرے ڈال کے باہیں خیال کی　　ہم نے لیا فراق کی راتوں سے انتقام

دوہا:

ہونٹ سلے پر من کی بپتا پھیلی جیسے بن کی آگ
تانت نہ باجی پھر بھی فیضی بوجھ لیا محفل نے راگ
جان سے پیارے تھے جوار ماں اب وہی جی کے لاگو ہیں
فیضی صاحب آپ نے خود ہی دودھ پلا کر پالے ناگ

''بیسویں صدی کی اردو شاعری'' کے فاضل مصنف نے جن نابغہ شخصیات کی نعت گوئی پر اظہار خیال کیا ہے ان میں مرحومین عاصی کرنالی، یزدانی جالندھری اور حفیظ تائب جیسی ہستیاں شامل ہیں۔ مجھے عاصی مرحوم سے بالخصوص ملتان کے دوران قیام اور بعد میں بالعموم جو قربت و محبت کا شرف حاصل رہا اُس کے پیش نظر مجھے فاضل مصنف کی اس رائے سے مکمل اتفاق ہے۔

''میں عاصی کرنالی کو ایسے شعراء میں شمار کرتا ہوں جنھوں نے مدحت نگاری کو اپنے فن کی

ایک روشن کرن قرار نہیں دیا بلکہ اُسے زادِ آخرت کے طور پر قبول کیا اور جب نعت کی وجدانی سرمستی سے گزرے تو اُس نہایت کو بھی پالیا جو صرف سوز دروں سے حاصل ہوتی ہے۔''

ثبوت کے طور پر صرف دو شعر ایک مدحت اور دوسرا نعت سے

ہاتھ کس کا شب کی زلفوں میں پروتا ہے نجوم　　　صبح کے رخسار پر سورج سجا دیتا ہے کون

خورشید جس کے نور کا اک اقتباس ہے　　　اس کا جمال میری نظر کا لباس ہے

یزدانی جالندھری کے بارے میں انور سدید کہتے ہیں کہ ''غزل کی طرف ان کی رغبت ان کی شاعری کی ضرورت تھی لیکن نعت کی طرف پیش قلمی ☆ ان کی روح کی آواز ہے''

برسا ہے ابر رحمتِ باری تمام رات　　　دامن کُشا رہا ہے بھکاری تمام رات

یزدانی رات نعتِ نبیؐ میں بسر ہوئی　　　عالم سُرور کا رہا طاری تمام رات

فاضل مصنف نے لکھا ہے کہ ''ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے حفیظ تائب کی والہانہ عقیدت اور محبت کا اعتراف کیا اور فرمایا کہ ''انھوں نے اپنے اکثر مضامین قرآن پاک سے لیے ہیں اور یہ ایسی سعادت ہے جو بہت سے نعت نگاروں کو نصیب نہیں ہوئی۔''

مجھے یہ سعادت نصیب ہوئی کہ جناب حفیظ تائب حافظ لدھیانوی مرحوم کے ہمراہ جو میرے مخلص رفیق تھے اسلام آباد میں میرے غریب خانے پر تشریف لائے اور اپنی نعت گوئی سے کیف سرمدی عطا فرما گئے:

انداز پذیرائی سے ہوا رنگ ان کی محبت کا گہرا　　　رحمت کے دریچے اور کُھلے رحمت کا تقاضا اور ہوا

زیرِ تبصرہ کتاب جس کا عنوان ڈاکٹر انور سدید کے اپنے ہی ایک مضمون سے ماخوذ و مستعار ہے دو درجن ابواب پر مشتمل ہے جن میں مولوی عبدالحق اور مولانا صلاح الدین احمد کی ادبی

☆ پیش قلمی کی ترکیب وضع کرنا نعت کے احترام کی طرف ایک بلیغ اشارہ ہے ورنہ ذہن پیش قدمی کی طرف جاتا ہے۔ (ادارہ)

صحافت پر نادر و یادگار مقالات شامل ہیں جی چاہتا ہے کہ ایک ایک سطر کا جو مطالعہ کی ہے اپنے اس جائزے میں احاطہ کروں لیکن ایسا ممکن نہیں تاہم میں اسے اپنی خوش بختی تصور کرتا ہوں کہ مجھے ۱۹۵۳ء میں بہاولپور میں کل پاکستان اردو کانفرنس کے موقع پر بابائے اردو کا دیدار نصیب ہوا اور اُس افتتاحی اجلاس کا جس کی صدارت مولوی صاحب نے فرمائی ناظم مجلس ہونے کا اعزاز بھی میرے حصے میں آیا۔ یہ افتخار بھی میرے لیے کم نہیں کہ پچاس ہی کی اوّل نصف دہائی میں مجھے مولانا صلاح احمد مرحوم کو حلقۂ ارباب ذوق کی ہفتہ وار نشستوں میں دیکھنے۔ سننے اور اُن اوصاف حمیدہ سے استفادہ کرنے کے مواقع میسّر آئے جن کا ذکر فاضل مصنف نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔

(جولائی۔ ستمبر ۲۰۱۱ء)

ذرا بارش کو تھمنے دو (نظموں کا مجموعہ)

امین راحت چغتائی

چغتائی صاحب سے تعارف و تعلق کو اب کئی دہائیاں بیت چکیں لیکن ان کی ثقہ و شائستہ شخصیت کا پاکیزہ و لطیف تاثر آج بھی اُسی طرح تر و تازہ ہے جیسا کہ پہلے دن تھا۔ وہ ایک ذمہ دار صحافی۔ صاحبِ بصیرت ادیب۔ حسّاس شاعر۔ معروضیت نہاد ناقد۔ مُحبِّ وطن دانشور۔ دقیقہ شناس محقق۔ کثیر المطالعہ تاریخ داں اور وسیع النظر مذہبی سکالر ہیں۔ ان تمام اوصاف کی یکجائیت نے جو اُنھیں ایک وصفِ خاص عطا کیا ہے وہ ہے اُن کی ضرب المثل منکسر مزاجی۔ بقول صائب:

فروتنی ست دلیل رسیدگانِ کمال　　　　که چوں سوار بمنزل رسد پیادہ شود

موصوف کی عمر عزیز کے ماہ و سال تحصیل علم، ترسیل علم اور تبلیغ دین میں بسر ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ ان کی تصنیفات و تالیفات کو اگر احاطہ کیا ئے تو محدود تعداد کے باوجود گرانقدر کہی جا سکتی ہیں۔ اور ان کی شخصیت کی جامعیت اُن کی ہر تحریر میں دیکھی جا سکتی ہے ''قرآن اور نظام کائنات'' کے زیرِ عنوان اُن کی ایمان افروز کتاب اور نعتیہ مجموعہ '' محراب توحید'' ان کے شعور و وجدان کے دو نادر شاہکار ہیں ''مغل مکتب مصوری سولہویں صدی عیسوی میں'' ان کا ایسا مطبوعہ تحقیقی مقالہ ہے جسے کوئی بھی جامعہ اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالات میں شامل کرنے کا اعزاز حاصل کر سکتی ہے لیکن صاحبِ مقالہ کی قناعت پسندی کہ ''ہر چہ گیرید مختصر گرید''

''دلائل'' اور ''ردِعمل'' کے زیرِ عنوان تنقیدی و تحقیقی مضامین پر مشتمل دو مزید مطبوعات فاضل مصنف کی علمی ژرف نگاہی کے معتبر شواہد ہیں۔ حمد و نعت اور نظم و غزل کی اصناف شعر پر اُن کی دسترس کے اہلِ علم معترف ہیں چنانچہ ان کے دو شعری مجموعوں ''بھید بھنور (۱۹۸۶ء) اور ''بامِ اندیشہ'' (۲۰۰۸) کے بعد نظموں پر مشتمل تازترین تصنیف (۲۰۱۱) ''ذرا بارش کو تھمنے دو'' کے بارے میں فلیپ نگار ڈاکٹر ناصر عباس نیّر کیا فرماتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

''عصری نظم نگاروں میں امین راحت چغتائی کا اپنا ایک مقام ہے وہ حسیاتی، نفسیاتی، عمرانی و تاریخی موضوعات سے اپنی نظم کے تاروپور بنتے ہیں اور غزل سے زیادہ نظم کو ''بت ہزار شیوہ'' سمجھتے ہیں لہٰذا اگران کی نظم کو اسی تناظر میں دیکھا جائے تو ابلاغ کے مرحلے آسان ہو جاتے ہیں۔''

ڈاکٹر تحسین فراقی نے بھی اپنے ''پیش لفظ'' میں شاعر کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے فرماتے ہیں:

''چغتائی صاحب نے بحیثیت مجموعی شاعری کے رموزی اور ایمائی پیرایوں کی خوبی سے پیروی کی ہے۔۔۔انھیں آتشدان سے چراغ کی آخری لوکو ربطِ خفی دینے کا ہنر آتا ہے''

مذکورہ بالا آراء سے قطع نظر بھی میں نے چغتائی صاحب کے زیر تبصرہ مجموعے میں مزید گوشے تلاش کرنے کی کوشش ہے اور دیکھا ہے کہ ان کا مؤثر ترین ہنر حُسنِ اُسلوب (Beauty of Diction) ہے جس کو انھوں نے اپنے ذخیرۂ معارف سے پُرشکوہ بھی بنا دیا ہے چنانچہ لفظ و معنی میں ربط و توازن کی کیفیت قاری کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔شاعر نے بعنوان ''حباب''، جس میں حمد باری تعالیٰ سے حسبِ معمول آغاز کلام کیا ہے وہ حسنِ اسلوب کا ایک نادر مرقع ہے۔ چند سطور ملاحظہ ہوں

یہ آرزوئے نمود تیری
کہیں طلوعِ سحر کا منظر دکھا رہی ہے
کہیں گلابوں کا رنگ بن کر
حیائے عارض میں رچ گئی ہے
کہیں افق پر
شفق کے رنگوں میں ڈھل گئی ہے
کہیں بہاروں کے پیرہن کی مہک میں تحلیل ہو گئی ہے

کہیں گھروندوں میں روشنی کی رمق سے تعبیر ہو رہی ہے
کہیں محبت کی وادیوں میں
دلوں کے غنچے کھلا رہی ہے

حمد کے فوراً بعد ایک دعائیہ نظم (جب صبح کے آنگن میں) ہے جس میں اُسلوب کا حسن اور بھی نکھرا نکھرا نظر آتا ہے شاعر نے اس حسن کو خوبصورت لفظیات کا زیور پہنا کر اور بھی جاذب نظر بنا دیا ہے۔ چند سطور:

جب صبح کے آنگن میں تہلیل پرندوں کی	توفیق اطاعت سے ضوریز بناتی ہے
تہذیب سماعت سے روحوں میں اترتی ہے	کرتی ہے گلی کوچے معمور درودوں سے
تکبیر اذاں بن کر کتنی ہی جبینوں کو	محسوس یہ ہوتا ہے پھر کوئی دعا پہنچی

دوسری اہم بات جو کسی بھی محویت سرشت قاری کو متوجہ کرتی ہے وہ الفاظ کے پس منظر میں شاعر کا وسیع مطالعہ و مشاہدہ اور متنوع لسانی گرفت ہے جسے اردو کے علاوہ عربی و فارسی الفاظ نے جمالیات کا مرقع بنا دیا ہے۔ امین راحت کے فکر و فن کا یہ رنگ و آہنگ آپ کو اُن کی تمام شاعری پر جلوہ بار نظر آئے گا۔ ان کا زیر نظر کلام ننا وے (۹۹) نظموں پر محیط ہے لیکن انھوں نے اپنے مجموعے کو جو نام دیا ہے وہ اسی مجموعہ میں شامل ایک نظم کے عنوان (ذرا بارش کو تھمنے دو) سے بوجوہ ماخوذ ہے جس کے لیے قاری کو رمزیت و اشاریت کے مہین پردوں کے دوسری طرف جھانکنا ہوگا۔

ذرا بارش کو تھمنے دو
نئی کلیوں کو کھلنے دو
بہت کچھ دیکھنے سننے کو مل جائیگا باغوں میں
اگر غنچے چٹکنے کی کہیں مدھم صدا آئے
اسے بھیگی رتوں کا ایک اسلوب بیاں کہہ لو

اگر نکھرے ثمر شاخوں پہ جھولا جھولتے دیکھو
دعا کو ہاتھ اُٹھاؤ
زینتِ گلشن انھیں سے ہے
اگر چہکار چڑیوں کی
کہیں کانوں میں رس گھولے
اُسے سرشار روحوں کی ثنا سمجھو

چنانچہ امین راحت کا یہی اُسلوب ان کی تمام نظموں میں ''گنجینۂ معنی کا طلسم'' بن کر دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ نظم ''نقشِ ارژنگ'' شاعر کے حُبِ وطن کا لازوال شاہکار ہے جسے انھوں نے موزوں ترین لفظوں میں میزان کر دکھایا ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو:

سرخیِ عارضِ گل تیری شفق کی غماز — رنگ اندازِ تبسم تری صبح خنداں
باعثِ راحت و آرام جہاں دھوپ تری — چاندنی جلوۂ انوارِ رخ سیم براں
تیرے ہر کنج میں لہرائے بہار تازہ — خاک گلیوں کی تری زہرہ وشوں کا غازہ

حُب وطن کے تقاضے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ شاعر کو جذبہ واحساس کے عجیب تر تنوعات سے دوچار کر دیتے ہیں۔ آیئے نظم ''بے نور وسعتیں'' میں ہم بھی شاعر کے ساتھ ''مرگِ تبسم'' پر آنسو بہائیں اور عصری تلخ حقیقتوں سے اپنے قومی ادراک کو جھنجھوڑیں:

آؤ حدیث مرگِ تبسم سنائیں ہم — اک شہر ناشناس پر آنسو بہائیں ہم
اے بزم میکدہ کے رفیقو تمھی کہو — کس کس کو بادِ موسم گُل میں رلائیں ہم
زخم نظر کہ زخمِ جگر، چارہ گر بتا — اک فرصت نفس میں تجھے کیا دکھائیں ہم
ہر کنجِ گلستاں پہ ہے صیاد کی نظر — کسی شاخ گُل پہ اپنا نشیمن بنائیں ہم
پھر سوچتے ہیں کوئی تو دستک گھروں پہ دے — گلیوں میں شب کے پچھلے پہر پھیل جائیں ہم

امین راحت کے ہاں قنوطیت حادثوں کے فوری ردِعمل کے طور پر تو ایک فطری اظہار کا روپ دھار لیتی ہے لیکن اُنھیں سرنگوں نہیں ہونے دیتی۔ رجائیت ان کی شخصیت کا توانا تر پہلو ہے۔ جس کی جھلک آپ ان کی نظم ''ردِعمل'' میں دیکھ سکتے ہیں جس کا آخری بند یہ ہے:

اوڑھ لو موت کا بے رنگ کفن چارہ گرو　　　زندگی اُٹھی ہے خود درد کا درماں لے کر
اب نہ اندھیارے اجالوں سے کبھی اُلجھیں گے　　　صبح نو آئے گی پیغامِ بہاراں لے کر

اگر طوالت مانع نہ ہوتی تو میرا دل چاہتا تھا کہ میں اس مجموعہ میں شامل اور کئی نظموں سے حوالے دیتا کہ قدرت نے شاعر کو کس قدر فکر ونظر کی وسعت اور عروسِ سخن کی مشاطگی کا سلیقہ عطا کیا ہے۔ ان نظموں میں خاص طور پر ''خامشی آبروسماعت کی''۔ ''ابدی شعلے'' ''مارَقیتَ اِذ رَمَیتَ'' (۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور واشنگٹن میں پینٹا گون پر طیاروں کے حملے سے متاثر ہو کر کہی گئی نظم)۔ ''وجدان'' (گوانتانا موجزیرے کے اسیروں کی نذر)۔ ''آتش نمرود'' اور ''شہر آشوب'' نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا جن میں جذبہ واحساس کی شدتوں کو امین راحت چغتائی نے مکمل بلاغتِ فن کے ساتھ اشعار کے قالب میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ کتاب میں ایک نظم ''نذرِ فیض'' بھی شامل ہے جو جناب فیض احمد فیض پر کہی گئی اور ۱۶ فروری ۱۹۵۴ء کو روزنامہ 'امروز' لاہور میں شائع ہوئی۔ لگتا ہے کہ اردو وفارسی کے جن اساتذۂ شعر نے جناب امین راحت کو اپنا گرویدہ بنالیا ان میں حافظ و بیدل اور غالب واقبال کے بعد فیض ہیں جن کی نذر کی جانے والی نظم کے آخری بند میں جو عہد جناب چغتائی نے کیا ہے وہی ان کی حیاتِ ادبی کا نصب العین بن گیا ہے:

ہم آج پھر سے تری رہبری کی کھا کے قسم　　　نگارِ فن کو سنواریں گے عہد کرتے ہیں
حیاتِ نو کو رچائیں گے شعر ونغمہ میں　　　شعورِ دہر نکھاریں گے عہد کرتے ہیں

(جولائی۔ ستمبر ۲۰۱۱ء)

سخن اس کے ستارے ہیں (شعری مجموعہ)

عائشہ مسعود ملک

عائشہ مسعود ملک کی نگارشاتِ نظم و نثر سے میرا تعارف بالکل نیا نیا ہے حالانکہ زیرِ نظر تصنیف ان کا چوتھا منظوم کلام ہے اور اگر ''حرفِ نگفتہ و سخنِ ناشنیدہ'' کو بھی شامل کر لیا جائے تو وہ غالب کے لفظوں میں ''عندلیب گلشنِ ناآفریدہ'' بھی کہی جا سکتی ہیں کہ ان کی ایک درجن تصانیف میں تقریباً نصف درجن وہ ہیں کہ جنھیں ابھی منصۂ شہود پر جلوہ گر ہونا باقی ہے۔ مصنفہ ایک معروف کالم نگار بھی ہیں۔ اس لئے صحافی بھی اور افسانہ نگار بھی کہ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ بعنوان ''بالکنی'' زیورِ طباعت سے مرصع ہونے کے مراحل سے گزر رہا ہے چنانچہ بحثیت اہل قلم ان کے فکر و فن کی کثیر الجہتی پر میں انھیں آفرین ہی کہہ سکتا ہوں۔

''سخن اُس کے ستارے ہیں'' عائشہ مسعود کی ایک غزل کے مطلع سے مستعار لیا گیا ایک ایسا حسنِ استعارہ ہے جس نے کتاب کے سرورق کو صوری و معنوی اعتبار سے اور بھی جاذب فکر و نظر بنا دیا ہے۔ مطلع یہ ہے:

کبھی دیکھو شب فرقت یہی منظر ہمارے ہیں کبھی دیکھو لب خنداں سخن اس کے ستارے ہیں

چنانچہ میں نے یہیں سے ان کی شاعری میں ان کے فکری زاویوں کی تلاش شروع کی۔ البتہ ایک کٹھن مرحلہ سے بھی گزرنا پڑا کہ زیرِ نظر شعری مجموعہ میں تقریظ دیباچہ یا پیش لفظ نام کی کوئی چیز ہاتھ نہ آئی۔ تاہم مصنفہ کا تحریر کردہ ایک سہ ورقی افتتاحیہ بعنوان ''لڑکیاں زندگی سے ملتی ہیں'' نظر سے گزرا جس نے بہت سی گتھیاں سلجھا دیں کہ یہ ایک جگ بیتی ہی نہیں بلکہ آپ بیتی کا بھی مرقع ہے جس کا اختتام ایک ایسے جملے پر ہوتا ہے جو غزل جیسی ایمائیت لیے ہوئے ہے:

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

ایک لفظ ایسا ہے کہ جسے ابھی گویائی کی خلعت پہنانا ہے اور ایک دن آئے گا کہ میں وہ لفظ

ضرور ادا کروں گی۔"

مگر میں نے اس 'لفظ بے صوت و صدا' کی گونج عائشہ کے پیش نظر کلام میں محسوس کی ہے ان کا ارتقا پذیر شعور پختہ تر ہونے کے شواہد مہیا کر رہا ہے۔ مزاحمانہ فکر کے ابلاغ میں اُن کے اسلوب کی جامعیت ان کی ڈھال بن گئی ہے۔ ان کے حسیاتی تلازمات غزل کے مزاج سے ہم آہنگ ہو چکے ہیں۔ قدیم و جدید کا امتزاج ان کا اختصاص بن گیا ہے۔ ان کے تروتازہ لہجہ میں عصری معنویت کا تاثر عمیق سے عمیق تر ہوتا دکھائی دے رہا ہے اور وہ صنف نازک کے عمرانی تصور کو انقلابی فعالیت سے ہمکنار کرنے کے لیئے کوشاں نظر آتی ہیں۔

چشمِ تر سے ہم نے دل کے موسموں کو نم کیا — کس نے ایسا امتزاج شعلہ و شبنم کیا
کر دیئے گل کس نے حرف وصوت کے سارے چراغ — کس نے بے آواز میرے شہر کا موسم کیا

میں مانگ لوں گی ترا وصل چاندنی سے بھی — دعاؤں کی ہے گھڑی چاند نصف رات میں ہے
بہت سے لوگ یہاں خوش کلام ہیں لیکن — کوئی تو شے ہے کہ اُس دلربا کی بات میں ہے

عائشہ مسعود کا اگر غالب رجحان صنفِ غزل کی طرف ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس پری کے سحرِ سامری سے آج تک کون محفوظ رہ سکا ہے؟ عائشہ کے ہاں مطالعہ کا فیضان نمایاں ہے لیکن تخلیقی کاوش تقلید کو بہت پیچھے چھوڑ گئی ہے۔ انھوں نے نئی اور مشکل ردیفیں وضع کی ہیں۔ ان کی غزل کا درج ذیل شعر یقیناً غالب کی اُس غزل کی جانب ذہن کو منتقل کر دیتا ہے جس کے مطلع کا مصرعہٗ اول ہے کہ "غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ یوں"

لیکن عائشہ نے اپنی تخلیقی انفرادیت قائم رکھی ہے۔ ملاحظہ ہو:

خاک بسر ہے زندگی بجھنے لگی ہے روشنی — میں نے یہ کب کہا کہ یوں میں نے نہیں کہا کہ یوں
تیز ہوا کے رقص میں بکھرے ہیں رنگ چار سُو — مثلِ حنا دروں بُروں میں نے نہیں کہا کہ یوں

مزید دیکھیئے

گلاب رنگ ہے اس کا جمال بیش نہ کم
کہاں ملی ہے کسی کو مثال بیش نہ کم

بہت دنوں سے ہے دل کا عجیب سا عالم
بہت دنوں سے ہے اس کا خیال بیش نہ کم

کسی کے ہاتھ سے تزئین پا رہے تھے گلاب
کسی کے لمس کا ہے یہ کمال بیش نہ کم

وہی ایک عالمِ رنگ و بو نہ یہ شب نئی نہ یہ دن نیا
مرے چار سُو وہی چار سُو نہ یہ شب نئی نہ یہ دن نیا

وہی جبر و جور کے ضابطے وہی سانحے وہی حادثے
ہے وہی رسن ہے وہی گلو نہ یہ شب نئی نہ یہ دن نیا

نہ ترا مزاج بدل سکا نہ مرا مزاج بدل سکا
وہی تیری خُو وہی میری خُو نہ یہ شب نئی نہ یہ دن نیا

بہت مشکل تھا کارِ عشق میں یہ فیصلہ کرنا
ضروری کیا نہیں تھا اور کیا ہونا ضروری تھا

وہ پتھر ہم نے دانستہ جو اپنے ہاتھ سے پھینکا
نشانہ جو بھی اپنا تھا خطا ہونا ضروری تھا

میں نے عائشہ کی نظموں کا بھی بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے اور مجھے محسوس ہوا ہے کہ بہ اعتبار اُسلوب ان کی نظمیں افسانوی دروبست سے پوری طرح لیس ہیں جس کے سبب تاثر توانا تر ہو گیا ہے۔ موضوعات کا تنوع ان کی وسعتِ نظر کا غماز ہے۔ نظم ''دھنک'' اپنے آہنگ و اُسلوب میں منفرد دکھائی دیتی ہے۔

شب کے آنچل سے لپٹی جھلملاتی زندگی
سرگیں پردوں میں چھپتی گنگناتی زندگی

بھیگتے جاتے تھے منظر اُس شب مہتاب کے
مرمریں ترشے سبک سیماب قطرے آب کے

کانپتے جھونکے ہواؤں کے نمی سے چور تھے
اس جہاں کے لوگ بھی ہم سے بہت ہی دور تھے

سرد کمرے کی فضاؤں میں رکی تھی خامشی
ریشمیں پلکوں کی جھالر پر رُکی تھی خامشی

شور کرتی تھی مگر چوڑی کی ہلکی سی کھنک
دیر تک ٹھہری رہی تھی اس کی چاہت کی دھنک

اسی طرح زیرِ تبصرہ مجموعے میں عائشہ کی کئی شاہکار نظمیں شامل ہیں جو یقیناً عہدِ آئندہ میں اُن کے بلند مقام کی ضامن ہونگی جب کہ ان کی معاصر نظم گو خواتین میں اُن کے نمایاں مقام و مرتبہ کو دھندلایا نہیں جا سکتا ثبوت کے طور پر یہاں میں ان کی نظم ''میں عورت ہوں'' سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔

میں عورت ہوں جہانِ ہست کی تفسیر ہوں گویا — تمدن کا نشاں تہذیب کی تصویر ہوں گویا
جبیں وقت پر لکھی ہوئی تحریر ہوں گویا — سلگتی شام کے منظر کا میں روشن ستارہ ہوں
میں اپنا خود سہارا ہوں، میں اپنا خود سہارا ہوں

آخر میں بہترین دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ عائشہ مسعود کا ایک شعر:

ابھی تو ہم نے ترے لفظ چھو کے دیکھے تھے — اک اور عمر گزرتی تو معرفت کرتے

(جولائی۔ستمبر ۲۰۱۱ء)

صریرِ خامہ (شعری مجموعہ)

سید نواب حیدر نقوی

سید نواب حیدر نقوی۔۔۔ شعر کی دنیا میں نسبتاً ایک نو متعارف نام، تخلص راہی۔۔۔ ایک قدیم روایت کا غماز اور بحیثیت شاعر شناخت کا ایک استعارہ لیکن ''صریرِ خامہ'' کے آئینہ میں نوائے سروش' کے دوش بدوش 'مضامینِ غیب'' کا ایک گنجینۂ معانی۔ 'آورد' سے بے نیاز اور 'آمد' کے جلال و جمال سے سرفراز:

محبتوں کا سفر ہم نے طے کیا راہی　　　　مثالِ بادِ صبا، گردِ کارواں کی طرح

زیرِ نظر شعری مجموعہ جو دو صد غزلیات پر مشتمل ہے تین معروف و مستند اہل قلم کی میزانِ نقد و نظر سے گزر کر قارئین تک پہنچا ہے۔ پروفیسر فتح محمد ملک کی رائے میں ''پروفیسر نواب حیدر نقوی کی غزل میں کلاسیکی رکھ رکھاؤ بھی ہے اور عصری شعور کی ترجمانی بھی'' لیکن بیک وقت موصوف نے یہ بھی فرما دیا ہے کہ وہ ''جتنے بڑے ماہرِ اقتصادیات ہیں اتنے ہی بڑے شاعر بھی ہیں'' چنانچہ ہمیں اس جملے میں ابہام کے حسن نے اتنا ہی متاثر کیا جتنا کہ ''صریرِ خامہ'' کے بیشتر اشعار میں رمزیت و اشاریت نے۔ بقول غالب:

فکر میری گہراندوزِ اشارات کثیر　　　　کلک میری رقم آموز عباراتِ قلیل
میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح　　　　میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

گویا بحیثیت قاری راقم الحروف پر بھی یہ لازم آیا کہ وہ پروفیسر نقوی کی شاعرانہ عظمت کا تعین کرنے سے پہلے ان کے ماہرِ اقتصادیات کی حیثیت سے آگاہی حاصل کرے ورنہ ''من آنم کہ من دانم'' کے مصداق شاید یہ مرحلہ طے نہ ہو سکے۔ زہے نصیب یہ جان کر کہ ''صریرِ خامہ'' کے شاعر پاکستان کے مایۂ ناز ''نیشنل پروفیسر'' ہیں اور بین الاقوامی شہرت یافتہ ماہرِ اقتصادیات ہیں بے حد خوشی ہوئی کہ غالب کے الفاظ میں صرف ''شاعری ذریعہ عزت نہیں'' پروفیسر ڈاکٹر معین

الدین عقیل بھی ایک حد تک پروفیسر ملک کے ہمنوا نظر آتے ہیں کہ ان کے خیال میں بھی یہ شعری مجموعہ ''روایت اور جدت دونوں کا حسین مرقع کہا جا سکتا ہے'' لیکن برادر محترم افتخار عارف کا تاثر شاعر کے فکر و فن کی گیرائی میں گہرائی کی تلاش کے بعد یہ ہے کہ ''زبان و بیان کی پختگی اور بے ساختگی نے ان کی شاعری میں ایک ایسی تاثیر پیدا کر دی ہے جو پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے'' چنانچہ راقم الحروف کو اس نفسیاتی گرفت میں آجانے کا اعتراف ہے۔ صریر خامہ کا مطالعہ کیا تو درج ذیل شعر عنوان نظر بن گیا۔

اک شمع آرزو بھی مری انجمن میں ہے
بجھتے ہوئے چراغوں کا ماتم نہ کیجئے

''صریر خامہ'' کے مطالعہ کے دوران محسوس ہوا کہ یہ مجموعہ جہاں شعری تلازمات سے مرصّع ہے وہیں فکری تنوعات کا بھی مرقّع ہے۔ شاعر کے عصری شعور پر فن کی گرفت خاصی مضبوط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ داخلی ارتعاشات ہوں یا خارجی عوامل شاعر کا اُسلوب غزل کی لطافت کو مجروح نہیں ہونے دیتا۔ عصری معنونیت کو تغزل کے لطیف پیرائے میں ڈھال دینے کے فن پر ''صریر خامہ'' کا شاعر پوری طرح قادر ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

دل میں پیوست ہیں نشتر نہیں دیکھے جاتے
زخم ہیں اور بھی دل پر نہیں دیکھے جاتے

منہ چھپاتا ہوا سورج ہو کہ گھٹتا ہوا چاند
ڈوب جانے کے یہ منظر نہیں دیکھے جاتے

موجزن اشکوں کے دریا ہیں پس جاں لیکن
خشک آنکھوں کے سمندر نہیں دیکھے جاتے

سکوتِ بیکراں مشکل، صدا کرنا بھی مشکل ہے
نواحِ یار ہیں شورِ انا کرنا بھی مشکل ہے

بڑھا ہے رفتہ رفتہ قرض اتنا زندگانی کا
ادا کرنا بھی لازم ہے ادا کرنا بھی مُشکل ہے

یہ مانا ہمکو زنجیر روایت توڑنا ہوگی
مگر دل سے روایت کو جدا کرنا بھی مشکل ہے

خون آغشتہ انقلاب بھی ہیں
ساتھ ان کے سنہرے خواب بھی ہیں

آسماں پر زمین زاد نہیں
فرش پر آسماں جناب بھی نہیں

''آسماں جناب'' کی خوبصورت ترکیب قابل داد ہے اور شاعر کے تخلیقی ذہن کی عکاس

بھی۔ دراصل جہاں نوع بہ نوع مضامین تک ذہن کی رسائی اور نکتہ آفرینی ایک تخلیقی عمل ہے وہیں اسلوب کا حسن اُس سے بھی بڑا کارنامہ ہے۔ نقوی صاحب کی شخصیت کا جو عکس ان کے کلام میں دیکھا جاسکتا ہے وہ یقیناً ''فیضانِ نظر'' کا کرشمہ ہے اور شعبۂ اقتصادیات میں ان کے امتیازات ''مکتب کی کرامت'' دکھائی دیتے ہیں۔ یعنی ان کی شاعری آمد ہے اور اقتصادی ماہرانہ حیثیت 'آورد'

'صریرِ خامہ' میں شاعر کی فکری انفرادیت نمایاں ہے۔ خود آگہی جناب نقوی کے فن کی اساس ہے۔ طنز و تنقید ہو یا تجربہ و مشاہدہ کی صداقت، وہ ابلاغ و اظہار کی کثیر الجہتی پر قادر ہیں جس میں عاشقانہ وقار کا رنگ غالب ہے چند مثالیں:

کچھ ان کا طرزِ تخاطب کچھ اپنی طبع رسا　　یقیں کی بات ہو شک کا گماں گزرتا ہے
ہمیں سلیقۂ خود آگہی اگر آجائے　　عجب نہیں کہ کوئی فن کوئی ہنر آجائے
نگاہ شوق نے تاروں کا حسن دیکھ لیا　　اب آسماں پہ کہیں چاند بھی نظر آجائے
ہم سرِ شام جو ڈوبے تو ستارے کم تھے　　دستِ گرداب سے بچنے کے سہارے کم تھے
زندگی آگ کے دریا سے گزرتے گزری　　پھر بھی سینے میں محبت تھی شرارے کم تھے
اَن گنت لوگ تھے سمجھا تھا شناسا جنکو　　وقت پڑنے پہ جو دیکھا تو ہمارے کم تھے
زندگی درہم و دینار نظر آتی ہے　　اک مصیبت میں گرفتار نظر آتی ہے
جو سماعت کے بھی پردوں کو جلا کر رکھدے　　آپ کی شوخیِ اظہار نظر آتی ہے
کیسا سورج کہ شعاعوں سے اندھیرا برسے　　کیسا مہتاب کہ بستی میں اجالا بھی نہیں
ہم بھری بزم میں تنہا ہی کھڑے ہیں راہی　　اتنے چہروں میں کوئی ایک شناسا بھی نہیں

راہی کی شاعری میں برملا حقیقت اور فکری تازگی کے مظاہر ہی ان کا طرۂ امتیاز نہیں بلکہ اشاریت و رمزیت کا حسن بھی تشبیہ و استعارہ پر اُن کی مشاقانہ گرفت کا فیضان ہے۔ ان کے مزاج میں تغزل اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ رچا بسا ہے جسے وہ اپنی تہذیبی و تمدنی سلیقہ مندی سے

شعر کے پیکر میں ڈھال دیتے ہیں۔ مُشتے نمونہ از خروارے:

خواب میں پھیلا ہوا دشتِ عدو دیکھا ہے
نوکِ ہر خار پہ بس اپنا لہو دیکھا ہے

کوزہ گر چاک کی گردش کو ذرا تیز ہی رکھ
میں نے بڑھتا ہوا احساسِ نمو دیکھا ہے

ہوس ہے جاہ و حشم کی ہمارے سینے میں
چھپے ہیں سانپ کئی آرزو کے زینے میں

کم آگہی کی رُتیں گھر کے آگئیں راہی
ہے ہجرتوں کی فضا علم کے مدینے میں

چھپائے رکھے گلستاں نے نقشِ پا لیکن
ہے خونِ ناب سرِ نوکِ خار کیا کیجے

بلاشبہ راہی کی غزل ''روایت و جدت'' کا مرقع ہے لیکن انھوں نے روایت کو تطہیر کے عمل سے گزار کر عصری افکار سے ہم آہنگ کیا ہے۔ ان کے یہاں رقیب و ناصح جیسے کردار کہیں نظر نہیں آتے۔ یہ اُن کی عاشقانہ عظمت ہی نہیں بلکہ شاعرانہ خود اعتمادی بھی ہے۔:

کوئی ستارہ جبیں میرا میہماں بن جائے
تو آسمان مرا سنگ آستاں بن جائے

کبھی تو بام تمنا سے چاند سے اتریں
کہ صحنِ جاں مرا تصویر کہکشاں بن جائے

گلوں کے رنگ میں شامل مرا لہو بھی ہو
نمی صبا سے ملے جوششِ نمو بھی ہو

ہے اضطراب کہ سر منزلِ سخن ہو اگر
تو پھر تعین عنوانِ گفتگو بھی ہو

کہیں سے جرأت نظارہ مانگ ہی لیں گے
مگر وہ صورتِ خورشید روبرو بھی ہو

دشت غربت میں زندگی کا پتہ
اس کی آواز پا سے ملتا ہے

سرسری سی گفتگو اور اَن کہی باتوں کے ہیں
کتنے احسانات ہم پر اُن ملاقاتوں کے ہیں

سید نواب حیدر نقوی اپنی ذکاوت و ذہانت کے ساتھ ساتھ وجدان و ادراک کی نزاکتوں سے بھی بہرہ مند ہیں۔ ہر باریک بیں قاری کی توجہ ان کے نظام شعری میں تاریکی و روشنی اور خموشی و صدا سے متعلق ان کی توانا حسیّت پر مرتکز ہو جانا ناگزیر ہے۔ ایسی بہت سی مثالوں میں سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہو ماہتاب شوق کہ خورشیدِ آرزو
تاریکیوں میں گم ہے کبھی روشنی میں ہے

شہر صدا میں ان کی خموشی کی دھوم ہے   ڈوبی ہوئی ہماری صدا خاموشی میں ہے

بے صدائی کی اسیری سے رہائی مانگے   دل مرا ولولۂ شعلہ نوائی مانگے

یہ تو تھی ''صریر خامہ'' کے شاعر کی طاقتور حسیّت کی مثال اور اب آخر میں رجائیت بدوش خود اعتمادی کا طنطنہ بھی دیکھئے:

روشنی چاروں طرف اہل نظر کر دی ہے   رات یہ کٹتی نہ تھی ہم نے سحر کر دی ہے

چراغِ جاں کو شب انتظار میں راہی   دلیلِ صبح فروزاں بنا دیا ہم نے

(اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۱ء)

دل کے سنبھل جانے تک، (شعری مجموعہ)

ابنِ محمود

"۔۔۔میں حقیر ہوں میں فقیر ہوں" حمد یہ شاعری میں عبدیت کے اظہار و اعتراف کے لیے یہ اُسلوب اور لب ولہجہ شاعر کی اُس ذہنی وروحانی کیفیت کا غماز ہوتا ہے جہاں وہ معبود حقیقی کی بارگاہ میں اہتمام بندگی کے طور پر سربسجود ہو جاتا ہے چنانچہ زیرنظر شعری مجموعہ کا خالق بھی خلاق عالم کے حضور اپنا نقدِ سخن پیش کرتے ہوئے حمد سے آغازِ کلام کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

تو خدائے عزّ وکمال ہے میں حقیر ہوں میں فقیر ہوں　　تری مثل ہے نہ مثال ہے میں حقیر ہوں میں فقیر ہوں
تو عظیم ہے تیری خلق ہوں یہی کم نہیں ہے مرے لیے　　مری جاں خوشی سے نہال ہے میں حقیر ہوں میں فقیر ہوں

ربِّ کائنات نے بھی اپنے کلام کا آغاز حمد وثنا ہی سے فرمایا ہے یعنی "الحمد للّٰہِ رب العالمین۔۔۔" اور خود جواز عطا فرما دیا ہے کہ بندگانِ خدا اُسی کے روبرو دست بدعا ہوں۔ لہٰذا شاعر کی شعری تخلیقات کا دوسرا مرحلہ مناجات سے مزین ہے۔ وہ اپنے خالق و مالک کے حضور عرض گزار ہے:

میرے مالک مرے اوصاف حمیدہ کر دے　　علم و ایمان و حیا میرا نصیبہ کر دے
اک حسیں نقش کہ ہوں جس میں حروف توحید　　ہاں وہی نقش مرے دل پہ کشیدہ کر دے

"دل کے سنبھل جانے تک" کے شاعر ابن محمود ہیں جو تازہ واردانِ بساط شعر میں شامل سہی لیکن ایک وقیع شعری ورثہ کے امین اور وارث کے طور پر منصۂ شہود پر آئے ہیں آپ کے جدّ امجد حافظ نصیر الدین مُخرّم (ولادت احمد پور شرقیہ ۱۲۸۹ھ وفات بھاولپور ۱۹۵۱ء) ریاست بہاولپور کی شعری تاریخ میں ایک ممتاز مقام ومرتبہ رکھتے تھے اور خواجہ غلام فرید کے بعد سرائیکی زبان کے منفرد شاعر تھے۔ فارسی زبان پر عبور حاصل تھا۔ بیشتر کلام فارسی اور سرائیکی میں ہے۔ کافیاں بھی کہیں۔ مجموعۂ کلام جو "گنج شائگاں" کے نام سے مرتب کیا گیا وہ بدقسمتی سے آج تک

اشاعت پذیر نہ ہو سکا۔ امید کی جانی چاہیئے کہ ابنِ محمود جلد اپنے اس 'فرضِ نسبی' کی طرف توجہ دے سکیں گے۔ خرم کا ایک شعر جس سے اُن کی غزل کے معیار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ !

خطِ شعاع میں ورقِ آفتاب پر عنواں لکھا گیا ترے عہدِ شباب کا

چنانچہ تیسری نسل تک منتقل ہوتے ہوتے غزل کی روایت جس رنگ و آہنگ کے پیکر میں ڈھلتی ہے اُس کا اندازہ ابنِ محمود کے درجِ ذیل اشعار سے کیا جا سکتا ہے:

اُس چھنکتی ہوئی پائل کا خیال آتا ہے آج پھر اپنے ہی قاتل کا خیال آتا ہے
عشق کو ہم نے صلیبوں پہ سجائے رکھا ہم نے جینے سے سدا ہاتھ اُٹھائے رکھا
کس نے خوشیوں کے اجالوں پہ لگائی قدغن کس نے ظلمت کی بساطوں کو بچھائے رکھا
جب کبھی روح میں اس درد کی لہریں اُٹھیں اُن کو آدابِ محبت نے دبائے رکھا

'آدابِ محبت' شاعر کا نسبی ورثہ ہے جس کی واضح جھلک ان کے کلام میں موجود ہے تاہم فکری ارتقا بھی زمان و مکاں سے ہم آہنگ ہے۔

دل پہ جو گزرے رقم کرتے ہیں ہم نہیں لکھتے قصیدے لوگو
اے دردِ مرا نخلِ تمنا نہ فنا کر سمٹا ہوا کچھ دیر تو سینے میں رہا کر
آندھی سی اک اُٹھی ہے تمنا کی حدوں سے لے جائے نہ دل کے خس و خاشاک اڑا کر
جن کی آنکھوں میں پڑے سوتے ہیں گونگے سپنے کاش اُن کو بھی جگانے ترا سورج آئے

تشبیہہ و استعارہ کا نکھرتا ہوا انداز زیرِ نظر شعری مجموعہ میں جا بجا دیکھا جا سکتا ہے۔ غزل میں روایت کا رنگ غالب سہی لیکن عصری آگہی بھی شاعر کو جھنجوڑتی رہتی ہے جس میں درد و کرب کی کیفیات شعری محاکات کا روپ دھار لیتی ہیں جیسے:

حالات کے قدموں میں سامان کھلونا ہے انسان کے ہاتھوں میں انسان کھلونا ہے
پاؤں میں آبلے ہیں احساس کے سفر میں رستے اجاڑ دیکھے پھولوں کے اس نگر میں

اور کہیں کہیں یہ درد وکرب وصال وہجر کے جذباتی دھاروں کا رخ اختیار کر لیتا ہے:

شبِ تاریک میں طوفاں نے ڈرا رکھا ہے
گو بہ گو دل کو اندھیروں نے دبا رکھا ہے
تو نے دیکھا ہے کہاں آ کے تماشا دل کا
جب سے اشکوں کے چراغوں کو جلا رکھا ہے

درد بن کر ہی رہ گئے ہم تم
غم کی شورش میں بہہ گئے ہم تم
جب ہوا سامنا تو دل کی بات
آنکھوں آنکھوں میں کہہ گئے ہم تم

تو نہیں پاس تو اکثر یہ گماں ہوتا ہے
کتنا بے کیف بہاروں کا سماں ہوتا ہے

رنگ لائی تھی کیا دعا مت پوچھ
دل سے اب دل کا ماجرا مت پوچھ

سب جلیسوں کو، مسیحاؤں کو، دل والوں کو
اک مرے قتل نے قاتل کا طرفدار کیا

اور اب دیکھئے کہ شاعر عشق وجنوں کو کس رنگ میں پیش کرتا ہے۔ یہ اسلوب اور انداز نظر فکری ارتقا کی طرف تیز قدمی کا واضح رجحان ہے:

یہ خمار ہے یا فریب عشق ہمیں شام اپنی سحر لگے
بڑی دلکشا ہے مگر فضا نہ کسی کو اس کی نظر لگے
تجھے کیا بتاؤں کہ کیا مزہ ہے جنوں میں آبلہ پائی کا
یہاں بڑھ کے تیری بہشت سے مجھے اپنا دشتِ سفر لگے

ہم شعر کی قلمرو میں ابنِ محمود کے پہلے نقشِ پا کا خیر مقدم کرتے ہیں اور ان کے اُس نظریاتی خلوص کو بھی خوش آئند جانتے ہیں، جس کا اظہار انھوں نے درجِ ذیل شعر میں کیا ہے۔

ابنِ محمود نئے دور میں اقبال کے بعد
دیکھئے کس کو یہاں حکم اذاں ہوتا ہے

(اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۱ء)

صوراسرافیل (شعری مجموعہ)

سید قاسم جلال

سرزمین بہاولپور کی تاریخ شعروحکمت۔ادب وثقافت اور تہذیب ومعاشرت کے ساتھ ساتھ اسلامی روایات کے عظیم الشان ورثہ کی امین بھی ہے۔اس نے نہ صرف ان شعبوں میں نامور ہستیوں کو جنم دیا بلکہ برصغیر کے اکناف واطراف سے بھی مشاہیر علم وفن کے لئے ہمیشہ اپنی آغوش عاطفت کو کشادہ کیے رکھا۔یہی وجہ ہے کہ اس سرزمین کا ماضی امتدادِ زمانہ کی سردمہری کی باوجود علماء وحکماء اور ادباء وشعراء کی ایک کہکشاں سے منور نظر آتا ہے۔ان ہستیوں میں شامل خواجہ غلام فریدؒ، حافظ عبدالقدوس قدسی، مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی، مرزا اشرف گورگانی جن کے شاگردوں میں نواب سائل دہلوی، نواب مائل دہلوی، بسمل دہلوی شامل تھے۔منشی محمد انور صادق جنھوں نے شاعری میں حالی اور آزاد کی طرز کو اپنایا۔میر ناصر علی جنھوں نے اپنی نظمیہ شاعری کو مستحکم اخلاقی اور اصلاحی بنیاد فراہم کی، حالی کی طرز پر طویل مسدس لکھنے والے دبیرالملک مولانا عزیز الرحمٰن، بہاولپور میں عدالتی نظام کی عہد ساز علمی و ادبی شخصیت اور اقبال شناس سر عبدالقادر، شہزادہ محمد اشرف بزمی گورگانی، میر واجد علی زار بلگرامی اور محسن الملک مولوی غلام حسین نیز ایسی ہی متعدد نابغۂ روزگار ہستیاں ہمارا سرمایۂ افتخار ہیں۔

مجھے ازحد خوشی ہے کہ بہاولپور کے اس پُرتوقیر پس منظر کو جلا بخشنے والوں میں ایک اور پُر اعتماد نام سامنے آیا ہے۔'صوراسرافیل' کے شاعر سید قاسم جلال سے مجھے ذاتی تعارف حاصل نہیں لیکن یہ تعلق بھی کیا کم ہے کہ بہاولپور میں شعروادب کے قافلے کے حُدی خوانوں میں شامل رہنے کا شرف مجھے بھی حاصل ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ اس سرزمین کے مجھ پر اور میرے اہلِ خاندان پر ناقابلِ فراموش احسانات ہیں۔زیرنظر شعری مجموعہ کا عنوان اور انتساب شاعر کے دینی واخلاقی نظامِ فکر کا اشاریہ ہے۔شاعرمشرق حکیم الامت حضرت علامہ محمد اقبالؒ کے لیے انتسابی اشعار جلال

کا منفرد جمالیاتی خراج تحسین ہے۔

صاحب عرفاں خودی کا رازداں اقبال تھا   جذبۂ عشق و جنوں کا ترجماں اقبال تھا
اس کی دولت حُبِ شاہ انبیاء تھی اے جلال   آشنائے روحِ اسرار جہاں اقبال تھا

زیر نظر مجموعہ کے مطالعہ سے ایک ناگزیر تاثر یہ ابھرتا ہے کہ شاعر شعر کی تخلیقی، تہذیبی اور تادیبی قوت کو مقصدیت۔ اخلاقیات اور دینی اقدار کی ترویج و تبلیغ میں اقبالیات کا تناظر مہیا کر کے بھرپور طریقے سے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ صور اسرافیل کا پہلا ہی شعر اس حقیقت کا غماز ہے۔

اے وہم زدہ! شہپر افکار جواں کھول   ہاں! برف کے بازار میں شعلوں کی دکاں کھول

بات کہنے کا یہ پُر تمکنت انداز جہاں اُسلوب کی بلند آہنگی کو ظاہر کرتا ہے وہیں شعر کی روح توانا تر بنا دیتا ہے۔ چنانچہ ایسی مثالیں کلام میں جابجا دیکھی جاسکتی ہیں۔

فغاں کہ سجدے شناسا نہیں جبینوں سے   انگوٹھیاں ابھی محروم ہیں نگینوں سے
غریب شہر کے خوں کا حساب کیا لیں گے   ٹپک رہا ہے لہو جن کی آستینوں سے
ہے دل میں پیار تو آنکھوں میں نفرتیں کیوں ہیں   یہ روشنی کے دیئے ہیں کہ تیرگی کے چراغ
لازم نہیں کہ لوگ کریں مدعا بیاں   چہروں پہ جو لکھا ہے اُسے بھی پڑھا کرو
پتھر اُٹھاؤ تم بھی تو یاروں میں ہو شریک   ہاں تم بھی آج حق رفاقت ادا کرو
صبر جن کا شیوہ ہے حوصلے سے جیتے ہیں   سوزنِ تبسم سے دل کے زخم سیتے ہیں
مر کے بھی شہیدوں کو موت آ نہیں سکتی   زندگی جو ہارے ہیں اصل میں وہ جیتے ہیں

جلال کے فن کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے فلسفہ و حکمت کو سہل ممتنع میں ڈھال دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کہیں اُن کا انداز جارحانہ ہے اور کہیں واعظانہ لیکن اقبال کے تتبع کا فیضان کہ سوز دروں چھپائے نہیں چھپتا۔ وہ لہجہ و اسلوب میں بھی کہیں سادگی سے کام لیتے ہیں اور کہیں پُرکاری سے صرف قافیہ پیمائی کو توہین سمجھتے ہیں۔ شاعر کے فکر و فن کی پختگی اور بلاغت نظر نے اُن

کے کلام کے مجموعی تاثر کو کہیں محو نہیں ہونے دیا چاہے وہ اُن کے طنز کا تیر ہو یا شانہ تنقید:

پہنچ گئے ہیں وہاں زندگی کے معمولات
جہاں فغانِ سحر ہے نہ آہِ نیم شبی

کیوں فن کو پرکھنے کے آداب سے عاری ہیں
تحقیق کی میزانیں تنقید کے پیمانے

جسموں نے تو پہنی ہیں زربفت کی پوشاکیں
محرومِ تجلی ہیں روحوں کے ضیاخانے

جس نے آنکھوں پہ لگائی ہے ہوس کی عینک
کس طرح قوم کو پاکیزہ نگاہی دے گا

سوچ کر کیجئے دعویٰ سخن آرائی کا
شاعری نام نہیں قافیہ پیمائی کا

طنز و تنقید کے باوجود ''صورِ اسرافیل'' میں اعتدال فکر کے رویے بھی خاصے نمایاں ہیں اس لیے کہ شاعر یاسیت پسند نہیں بلکہ رجائیت ہی اُس کا جزوِ ایمان ہے۔

شامِ غم ہی میں نہاں صبح مسرت بھی ہے
نوحۂ درد میں خوشیوں کی بشارت بھی ہے

درحقیقت ہے وہی شعر مکمل جس میں
تابش فکر بھی جذبوں کی حرارت بھی ہے

دھند چھٹتے ہی جلال اک روز سورج کی طرح
مطلع اذہان پر اُترے گی تیری شاعری

اب ایک اور زاویہ کلام جلال کے انتقادی جائزے کا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عصری معنویت کا اہتمام جس کے بغیر تمام شاعری معلق یا خلائی ہو کر افادی پہلو کھو بیٹھتی ہے کہاں تک کیا گیا ہے میں اسے مزاحمتی شاعری کا نام تو نہیں دونگا البتہ جلال و جمال کی امتزاجی کیفیات پر ضرور محمول قرار دونگا۔ یہاں مجھے حقیقتاً شاعر کی آرزومندی کے ساتھ ساتھ سلیقہ مندی کا بھی احساس ہوا ہے۔

بانی شہر ستم مظلوم کیسے ہوگیا
کل جو مجرم تھا وہ اب معصوم کیسے ہوگیا

محتسب سچ سچ بتا خلوت میں کیا سودا ہوا
مدعی انصاف سے محروم کیسے ہوگیا

قوم کا قائد ہے وہ جو اس کا خدمتگار ہے
جس نے خدمت ہی نہ کی مخدوم کیسے ہوگیا

یہ بہار آئی ہے کیسی باغ ہست وبود ہیں
بلبل و گل ہم سخن ہیں لہجۂ بارود میں

اس سے پہلے کہ کوئی حکم سنایا جائے
مجھ کو انصاف کا مفہوم بتایا جائے

اب چھلکنے کو ہے مظلوم کا پیمانۂ صبر　　　اب ذرا سوچ کے ہاتھ اس پہ اٹھایا جائے

غزل اور غنائیت روایتاً لازم وملزوم سمجھے جاتے ہیں اور میں نے محسوس کیا ہے کہ قاسم جلال روایت کے محاسن کے معترف ہیں اور آمادۂ بغاوت ہرگز نہیں۔ تاہم خال خال ہی سہی وہ اس طرف بھی توجہ کرتے ہیں لیکن احتیاط کو حسنِ اسلوب کا پیرہن پہنا کر:

اتنا نہ بخل کیجئے کچھ مسکرایئے　　　وہ آفتاب کیا جو اجلا نہ کر سکے

بارش کے باوجود سلگتا رہا مکاں　　　آنسو بھی دل کی آگ کو ٹھنڈا نہ کر سکے

لیکن دیکھئے کہ اسی غزل میں ان کے عظمت فن کا شعور بیدار ہوتا ہے اور اپنے غرور خود نگہی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

نام ونمود کی ہمیں خواہش تو تھی مگر　　　بے روح شہرتوں کی تمنا نہ کر سکے

گو پُرکشش تھی پیش کشِ تاجرانِ فن　　　ہم آبروئے شعر کا سودا نہ کر سکے

مجھے سید قاسم محمود کی دیگر تخلیقات کو دیکھنے کا تو موقع نہیں مل سکا البتہ 'صور اسرافیل' کی بنا پر ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے مصداق انھیں ایک صاحب بصیرت اہل قلم سمجھتا ہوں اور ان کے لیے دعا گو ہوں کہ وہ اپنے اس یقین وایمان پر ڈٹے رہیں جس کا برملا اظہار انھوں نے درج ذیل شعر میں کیا ہے۔

ہر چیز ہے فانی مگر اللہ کا قانون　　　ناقبل تنسیخ ہے، نا قابلِ ترمیم

(جنوری۔مارچ ۲۰۱۲ء)

زہے مقدر (نعتیہ مجموعہ)

نورین طلعت عروبہ

محبت جب عقیدت کی منزلت کو پہنچتی ہے تو نعت کا محرک بنتی ہے۔ یا اقبال کے الفاظ میں:

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق　　　شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

''زہے مقدر'' کے مطالعہ نے مجھے عجب نوع کے ایک کیفِ سرمدی سے ہم آغوش کر دیا ہے گویا زبان گنگ ہے اور لفظ اظہارِ عجز میں سرنگوں۔ اپنے دوست اور رفیق دیرینہ انوار فیروز کی خوش نصیب بیٹی نورین طلعت کا نعتیہ کلام پڑھ کر محسوس ہوا جیسے اُس نے حُبِ رسولؐ سے سرشار ہر قاری کے جذبات کو زبان عطا کر دی ہو اور اُس بارگاہ میں حاضری کا شرف بھی حاصل کیا اور ہدیۂ عقیدت بھی پیش کیا جہاں زر و مال اور وسائل کی دولت نہیں صرف مقدر کی پرواز ہی یہ سعادت عطا کر سکتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ربِّ کائنات نے اُس کی یہ آرزو پوری کر دی:

مدینہ تیری فضاؤں کی دھول ہو جانا　　　ترے چمن کی بہاروں کا پھول ہو جانا

میں چاہتی ہوں درِ مصطفیٰؐ سے مَس ہو کر　　　کسی دعا کی طرح سے قبول ہو جانا

یہی نہیں بلکہ لفظ و معنی کا یہ سلیقہ اور اُسلوب و اظہار کا یہ قرینہ بھی اُسی دربار کی دین لگتا ہے۔ شاعرہ کے اپنی عقیدت و ارادت پر بے پناہ اعتماد نے اُسے اُس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں یہ ممکن ہے کہ ''خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے''۔ یہی حمدیہ انداز عروبہ نے بھی اپنایا ہے وہ کہتی ہیں۔

کیا جانیئے کہ کوئی عمل یوں قبول ہو　　　خود رب کہے کہ آمرے باغ ارم میں آ

آ کے حروفِ حمد کو انوار بخش دے　　　صحن حرم کی روشنی نوکِ قلم میں آ

عجب نہیں کہ صحنِ حرم کی روشنی نے عروبہ کے نوکِ قلم میں تجلیات کو مرتکز کر دیا ہو اور وہ ادب گاہ جو آسمان تلے عرش سے بھی برتر و عظیم مقام تقدیس کا مرتبہ رکھتی ہو اور جہاں جنیدؒ و بایزیدؒ جیسی

برگزیدہ ہستیاں حواس وہوش کھو بیٹھیں وہاں نعت کہنا کس طرح پل صراط کے عمل سے گزرنے سے سہل تر ہوسکتا ہے۔؟

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش اولیٰ تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ اینجا

شاعرہ کے بخت کی سرفرازی دیکھیئے کہ وہ کتاب کے آغاز میں خود لکھتی ہیں کہ ''زہے مقدر کی زیادہ تر نعتیں میں نے مدینہ منورہ میں کہیں:''

علم کے شہر کو جانا کوئی آسان نہیں
وہی جائے جسے تہذیب نظر حاصل ہو

ہوسکتا ہے کہ شعر گوئی کی وراثت عروبہ کے والد کا فیضان نظر ہو جو ایک خوش خصال شخص اور خوش خیال شاعر ہیں لیکن نعت میں کیف واثر اور جذب ووجد کی لطیف کیفیات روضۂ رسولؐ کی قربت کا عطیہ ہی ہوسکتی ہیں ورنہ نعتیہ فکر واحساس میں یہ سرمدی انداز کہاں ہر ایک کو میسر آتا ہے۔

عطائے رب ہے یہ الفاظ کا خزینہ بھی
ثنائے احمدؐ مختار کا قرینہ بھی

مدینہ پہلی تمنّا ہے آخری بھی یہی
مسافتوں کا یہیں اختتام ہوتا ہے

خالقِ کُل کی ہے اس در پہ عنایت ایسی
گُل کی خواہش لیے پہنچے تو گلستان ملے

لب پہ تھا ان کا نام میں لکھتی چلی گئی
آنسو بنے کلام میں لکھتی چلی گئی

موقع ملا مجھے کہ صبا تھی پیام بر
بس حال دل تمام میں لکھتی چلی گئی

بکھرے ہوئے تھے اتنے اجالے قدم قدم
حیرت زدہ تھے دیکھنے والے قدم قدم

چشم فلک نے رشک سے دیکھا زمین کو
ایسے تھے رنگ ونور کے حالے قدم قدم

جس کا فقط خیال ہی کارِ محال تھا
تعبیر میں وہ خواب بھی ڈھالے قدم قدم

یہ تو تھا میرا وجدانی تأثر اور بے ساختہ ردعمل جسے شاید نقد ونظر کے معروضی زاویوں سے میزان نہ کیا جاسکے لہٰذا اب میں اجمالاً شاعرہ کے فکروفن کا تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کرونگا۔

نورین طلعت عروبہ کا ایک اور نعتیہ مجموعہ ''حاضری'' بھی اس سے قبل منظر عام پر آچکا ہے لہٰذا میں اپنی یہ غلط فہمی بھی دور کیے لیتا ہوں کہ وہ اس میدان میں نووارد ہیں تاہم اُنھوں نے اپنے فکروفن کا جو نقش اول ثبت کیا ہے وہ میری نظر سے نہیں گزرا یہی وجہ ہے کہ مجموعۂ ثانی میں وہ اشعار بھی نظر

پڑے جو فکری پختگی اور فنّی مہارت کے آئینہ دار ہیں۔ مثلاً

آپ کی مدح کی توفیق جو ارزانی ہو لفظ قرطاس پہ آجائے تو نورانی ہو
بارش نور میں ڈوبا ہو مدینہ کا نگر نعت کا لہجہ مرا روکش خاقانی ہو
گلی مہکی مہکی وہ در مہکا مہکا مدینہ کا سارا نگر مہکا مہکا
مرے گھر سے گنبد کی چھاؤں تلک تھا مرا سارا شوق سفر مہکا مہکا

محاسن شعری میں تکرار لفظی کو اگر فنی مہارت کے تابع نہ کیا جائے تو کلام میں تکدر پیدا ہو جاتا ہے۔ "مہکا مہکا" کی ردیف میں شاعرہ نے جس طرح لطیف و مترنم الفاظ کا استعمال کیا ہے اُس نے اشعار کے آہنگ میں ایک دلپذیر کیفیت پیدا کر دی ہے جو قابلِ داد ہے خصوصاً یہ مصرع کہ "مرا سارا شوق سفر مہکا مہکا" مزید دو اشعار ملاحظہ ہوں:

ہونٹوں پہ اک نیا گُل وحدت کھلا ہوا بامِ فلک پہ جیسے ستارہ سجا ہوا
مجھ کو بھی کوئی حرفِ تمنا نصیب ہو روضے کی رفعتوں کی طرح بولتا ہوا

ان اشعار میں تشبیہ و استعارہ کا حسن صرف لفظ یا الفاظ تک محدود نہیں ہے بلکہ پورے پورے مصرع کو صوت و معنی کا دلپذیر مرقع بنائے ہوئے ہے یہی نہیں بلکہ تمام مجموعے میں شاعرہ نے تلمیحی اُسلوب کو بھی نہایت سلیقہ مندی سے پیش کیا ہے۔ اور اس طرح پس منظر میں نہ صرف شخصیات کو آنحضرتؐ کی نسبت سے اجاگر کیا ہے بلکہ عہد نبویؐ کے واقعات کی ایمان افروز تصویر کشی بھی کی ہے۔

آخر میں عروبہ کے لیے بہترین دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ سرور کائنات کی خدمت میں اُنہی کے ایک شاہکار شعر پر

جہاں فضا کا مقدر بنی ہوائے کرم وہیں سے اوڑھ کے آئی ہوں میں ردائے دم

اختتامِ کلام کرتا ہوں۔

جب تلک یہ نظامِ دنیا ہے ہر زمانہ ترا زمانہ ہے

(جنوری۔ مارچ ۲۰۱۲ء)

گوشۂ صحرا (اخباری کالم)

امجد قریشی

صحافی، ادیب اور شاعر امجد قریشی جن کے فکر وفن اور حیاتِ مستعار کا مرکز ومحور اور بنیادی نکتہ بہاولپور ہے گذشتہ نصف صدی سے بھی متجاوز مدت سے قلم بدست چلے آرہے ہیں۔اور کم و بیش اتنی ہی مدت پر محیط ان سے میرے مراسم کی تاریخ ہے۔ جو اخلاص، رفاقت اور مروت سے عبارت ہے۔ وہ کافی عرصے سے صاحب فراش ہیں۔ان کی شفایابی اور صحت کے لیے دل کی گہرائیوں سے دست بدعا ہوں اور احباب وقارئین سے بھی ملتمس کہ ان کے حق میں دعا فرمائیں۔

''گوشۂ صحرا'' ان کی صحافتی زندگی کی تلخیص بھی ہے اور تفصیل بھی کہ صحافت ان کا خاندانی ورثہ اور ان کے اپنے شب وروز کا غالب ترین پہلو ہے۔ساڑھے چار سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل یہ تصنیف کم وبیش ڈیڑھ سو اخباری کالموں پر مشتمل ہے جو مختلف اخبارات وجرائد میں ۱۹۸۵ء سے ۲۰۰۲ء تک سترہ سال کی مدت میں لکھے گئے۔ ان اخبارات و رسائل میں لاہور کے روزنامہ 'مشرق'، 'دن' اور 'پاکستان' کے علاوہ روزنامہ 'نیا دن' ملتان روزنامہ تعبیر بہاولپور اور پندرہ روزہ حقیقت بہاولپور شامل ہیں۔ اپنی اس زندۂ جاوید کاوش کو انھوں نے بہاولپور کے معروف ومحترم صحافی اور اپنے والد گرمی جناب عبدالحمید صحرائی مرحوم اور دیگر اہل خانہ سے معنون کیا ہے۔اس خانوادے کا بہاولپور کے صحافتی مدّ وجزر کی تاریخ میں نمایاں کردار رہا ہے۔ چنانچہ مختلف اوقات میں رسائل وجرائد کا اجراء جن میں ہفت روزہ 'بیباک' پندرہ روزہ 'عزم' نوائے بہاولپور۔ ماہنامہ خاتون۔ ماہنامہ تبلیغ۔ سہ روزہ جمہور اور ہفت روزہ دفاع شامل ہیں۔ صحرائی خاندانی کا مرہون منت ہے۔

امجد قریشی کے بارے میں یادش بخیر بہاولپور کے اُسی عہد عتیق کے ہمارے ایک ساتھی اور ہم قلم سید تابش الوری کی ایک نہایت جامع تحریر کتاب میں شامل ہے جس میں ان کی کالم نگاری کا

تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔اور کالم نگاری کے ایک صنف کے خدوخال میں ڈھل جانے پر تو اتفاق کیا گیا ہے لیکن آج تک کسی متفق الیہ تعریف وضع نہ ہوسکنے کا سبب بجا طور پر اس صنف کے مسلسل وسعت پذیر ارتقا کو ٹھہرایا گیا ہے۔ میرے خیال میں یہ صنف تو یقیناً ہے لیکن یہ نہ صنفِ سخن ہے نہ صنف ادب بلکہ اسے اگر صنفِ صحافت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ جس طرح صحافت یا اخبار نویسی معیشت و معاشرت۔ادب و سیاست اور تہذیب و ثقافت ہر موضوع کا احاطہ کرتی ہے اسی طرح کالم نویسی کا میدان بھی اُتنا ہی ہمہ گیر اور متنوع ہونے کے ساتھ تنقیدی و تجزیابی اعتبار سے کہیں زیادہ تاریخ ساز بھی ہے۔ میں نے زیرِ تبصرہ کتاب میں قریشی صاحب کے اندازِ تحریر میں بدلتے ہوئے رنگ و آہنگ اس طرح دیکھے ہیں کہ جن میں راست گفتاری بھی ہے طنز و کنایہ اور رمز و اشارہ بھی۔ جارحانہ لب و لہجہ کے ساتھ نرم و لطیف پیرائے بھی ہیں۔اور توصیف و تحسین کی گُل پاشیاں بھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی بوقلمونی ایک زیرک و حقیقت پسند صحافی کی شناخت ہوتی ہے چنانچہ برادرم تابش نے بھی جن الفاظ میں امجد قریشی کا سراپا تراشا ہے نہ وہ ترش ہے نہ شیریں بلکہ حقیقت پسندانہ مصوری ہے:

''امجد قریشی بنیادی طور پر ایک اچھے انسان ہیں۔ایک نظریاتی صحافی اور محبِ وطن شہری ہیں۔ان کی یہ کرداری صفات اکثر تحریری صفات کا روپ دھار لیتی ہیں اور کالم کے بین السطور خوشبو کی طرح محسوس کی جاسکتی ہیں''۔

میرے علم، مشاہدے اور تجربے کے مطابق امجد صاحب کی بہاولپور میں ادبی خدمات بھی اُن کی کثیر الجہت قرطاس و قلم کی زندگی کا ایک اہم حصہ ہیں۔ چنانچہ گزشتہ صدی کے دوران پچاس کی دہائی میں حلقۂ 'اربابِ ادب' کے قیام کے ساتھ ہی جن اہلِ قلم نے بہاولپور کی ادبی تاریخ میں انقلاب برپا کیا ان میں امجد قریشی بھی شامل تھے۔تابش بھی اور یہ حقیر بھی اور یہ قبیلہ جس کے ناقابلِ فراموش ناموں میں شہاب دہلوی مرحوم جیسی ثقہ و ذی وقار ہستیوں کے ساتھ ساتھ علی احمد رفعت، ادیب واثقی، دلشاد کلانچوی۔ محی الدین شان۔ معین الدین حاوی۔ حفیظ گل۔ غلام شبیر بخاری اور

پروفیسر محمد اعظم اُس عہد کے نمائندہ نام شامل ہیں۔ میری یادداشت کے مطابق امجد قریشی حلقہ کے سکریٹری کی حیثیت سے ہفتہ وار تنقیدی اجلاسوں کے روداد نگار بھی تھے۔ اور حلقہ کے زیر اہتمام مئی ۱۹۵۴ء میں منعقد ہونے والی اُس آل پاکستان اردو کانفرس کے مخلص کارکنان میں بھی شریک جنھوں نے اس یادگار اور تاریخی کانفرس کے مہمانوں بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم۔ میجر آفتاب حسن۔ مولانا فرید ہاشمی، شجاع احمد زیبا۔ خواجہ محمد شفیع دہلوی، حیدر دہلوی۔ علّامہ قابل گلاؤٹھوی۔ ظہیر کاشمیری۔ ماہر القادری۔ ادیب سہارنپوری۔ نازش حیدری۔ راغب مراد آبادی۔ رقیہ بنتِ خلیل عرب۔ بیگم عبدالحفیظ۔ بیگم شریف الحسن نیز دیگر مشاہیر کی میزبانی کا شرف حاصل کیا۔ ادیب واثقی مرحوم سے ان کی رفاقت وشاعرانہ شراکت نے مقامی مشاعروں میں جان ڈال دی تھی۔ ادیب باغیانہ ذہن کے شاعر اور عوامی فنکار تھے۔ لہجہ میں تندی وتیزی اور بلا کی آتش فشانی تھی۔ ایک نمائندہ شعر:

یہ بڑے لوگ جو مصروفِ دل آزاری ہیں　　　برس کے داغ ہیں طاعون کی بیماری ہیں

یہ ایک قدر مشترک تھی جس کا ثبوت زیرِ تبصرہ کتاب میں امجد کی درج ذیل تحریر سے ملتا ہے۔

''میں غربت اور ثروت کی غیر منصفانہ تقسیم کا نوحہ گرہوں اور احساس کے زاویوں کا وہ انداز میری تحریروں اور کالموں میں جھلکتا بھی ہے۔''

مزید ثبوت اُن کے ایک ہم عصر اور جامعہ اسلامیہ بہاولپور کی فیکلٹی آف ایجوکیشن کے ڈین پروفیسر ڈاکٹر اسلم ادیب کے زیرِ نظر کتاب ''گوشۂ صحرا'' میں شامل مضمون بعنوان ''امجد قریشی کی کالم نگاری۔۔ سکوت شب سے شور خیال تک کا سفر'' سے مہیا ہوتا ہے۔ فاضل مضمون نگار امجد قریشی کو اس طرح خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

''امجد قریشی ایک شخص نہیں بلکہ ایک رویہ اور تحریک ہے۔ وہ ایک بڑا تخلیق کار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑا انسان بھی ہے۔ اس کا تہذیبی رکھ رکھاؤ قابل تقلید اور شائستگی وشرافت قابل دید ہے۔ صحافیانہ بیباکی۔ عالمانہ متانت اور مفکرانہ انداز ان کی شخصیت کو پُر اثر بناتا

ہے۔"

اس دعائے مکرّر کے ساتھ کہ امجد قریشی جلد صحت یاب ہوں اور ادب و شعر و صحافت کی مزید خدمت انجام دے سکیں کہ:

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق   ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

(جنوری۔مارچ ۲۰۱۲ء)

بارے غالب کا کچھ بیاں ہو جائے

پرتو روہیلہ

مجھے ابتداء ہی میں یہ اعتراف کر لینا چاہیئے کہ زیرِ تبصرہ کتاب کے عنوان کو بیک نظر دیکھنے کے بعد جو تاثر قائم ہوا وہ درست نہیں تھا۔ غالب کے مصرع میں تحریف کہ خود غالب کو 'آموں' کا مترادف قرار دے دیا جائے تحریر کے 'ہلکے پھلکے' ہونے کی طرف تو اشارہ ہو سکتا ہے تحقیق و تدقیق کی طرف نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اکثر تذکرہ نگاروں نے غالب سے لطائف و ظرائف بھی منسوب کیے ہیں اور مرزا کی بدیہہ گوئی و بذلہ سنجی پر بہت کچھ لکھا ہے لہٰذا اس تاثر کے قائم ہونے کا امکان موجود تھا۔ ہر چند کہ آموں کی تعریف میں غالب نے اپنے قلم کو واقعی 'نخلِ رُطب فشاں' بنا دیا تھا لیکن کتاب کے بالاستیعاب مطالعہ نے ثابت کر دیا کہ پرتو روہیلہ کا خامۂ زرنگار بقول حالی تحقیق کی ''راہ راست پر پڑ جانے'' کے بعد'' راہ کے نشیب و فراز'' کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا۔

فاضل مصنف نے بقولِ خود مرحوم و مغفور مشفق خواجہ کے اصرار پر جس ''قصرِ طلسمات'' میں قدم رکھا تھا اُسی قصرِ طلسمات کے در و دیوار کو دیکھتے اور ایک ایک نقش کو حیرت سے تکتے وہ بیسویں صدی کی آخری دہائی سے اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں داخل ہو چکے ہیں اور باہر کا دروازہ نہیں مل رہا۔۔۔ غالب کے فارسی خطوط کے تراجم کا آغاز انھوں نے سید اکبر علی ترمذی کی مرتبہ و مدوّنہ کتاب ''نامہ ہائے فارسی غالب'' سے سال ۱۹۹۹ء میں کیا اور پھر سال ۲۰۰۸ء تک انھوں نے قاضی عبدالودود کی ''مآثر غالب' وزیر الحسن عابدی کی ''باغ دودر'' مجلس یادگارِ غالب کی مرتبہ 'آہنگ پنجم'' سید مسعود حسن رضوی کی ''متفرقات غالب'' اور خود مولفہ ''کلیات مکتوبات فارسی'' کے عدم النظیر تراجم کر کے اُس بے مثال شہرت کا بجا طور پر اعزاز حاصل کیا جو ہر محقق و مترجم اور متعلقہ اداروں کے لیئے باعث رشک ہے غالب فہمی کے سلسلہ میں اس کے باوجود کہ شارحین غالب کی ایک کہکشاں آسمان ادب پر بدستور جلوہ بار ہے پرتو روہیلہ نے غالب کے منتخب مشکل اردو اشعار کی شرح لکھی جو سال ۲۰۰۸ء میں طبع ہو کر سند بن گئی۔

اور اب زیر تبصرہ کتاب جسے انجمن ترقی اردو پاکستان نے سال رواں میں شائع کیا ہے اُن کے مختلف اوقات میں لکھے گئے مقالات کا اعادہ ہے جن کے بارے میں انجمن کے معتمد جمیل الدین عالی فرماتے ہیں کہ ''پرتو روہیلہ کی اس کتاب میں ان کے متفرق تحقیقی وتنقیدی مضامین شامل ہیں جن سے غالب شناسی کے کئی رُخ سامنے آتے ہیں اور اس باب میں پائے جانے والے کئی اشکالات کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے''

پرتو صاحب نے غالب کی زندگی کے جن تین اہم فیصلوں کا ذکر کیا ہے ان میں اُسلوبِ بیدل یعنی 'مشکل گوئی' کو ترک کرنا دوسرے کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ کے قیام کے دوران آغا میر سے ملاقات کے لیئے شرائط پیش کرنا اور مصنف کے الفاظ میں تیسرا فیصلہ وہ ہے جو انھوں نے دہلی کالج کی مدرسی سے انکار کی صورت میں کیا۔ فاضل مصنف مرزا کے اس رویے کو بوجوہ ناواجب قرار دیتے ہیں حالانکہ اُس دور کے معاشرتی آدابِ زندگی کے تناظر میں اور خود مرزا کے مرتبہ ومقام اور ان کی تہذیبی وتمدنی نشو ونما کے پیش نظر اُن کی استقبال و پذیرائی کی توقعات ایسی بھی کچھ بے جواز نہیں تھیں جن کا ترجمان مرزا کے اس شعر کو کہا جاسکتا ہے۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ وخود بیں ہیں کہ ہم — اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

راقم کی عاجزانہ رائے میں فاضل مصنف کی جانب سے غالب کو ''خود پسند۔ مغلوب الانا۔ انفرادیت گزیدہ'' قرار دینا نظر ثانی چاہتا ہے کیونکہ فاضل مصنف نے مرزا کے فکر وفن اور شخصیت پر جتنا کثیر الجہت کام کیا ہے اس کے پیش نظر ایک عظیم المرتبت شاعر کی حیثیت سے آج بھی تاریخ کے تناظر میں دیکھا جائے تو مرزا عالمی سطح پر بھی ایک ارفع مقام پر فائز نظر آتے ہیں۔

حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے — آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

البتہ غالب کی مشکل پسندی پر جناب پرتو نے جو وسیع تر مواد مہیا کیا ہے وہ ادبی تحقیق کے طالب علموں کے لیئے ایک نادر تحفہ ہے تاہم غالب کے فکری وفنی سیاق وسباق میں یہ امر بعید از یقین دکھائی دیتا ہے کہ غالب نے اپنی رباعی جو انھوں نے حکیم آغا جان عیش دہلوی کی رباعی کے جواب میں کہی تھی ایسا بودا اور غیر معیاری مصرعہ کہا ہو جیسا کہ ''ہوتے میں ملول جس کو سن کے

جاہل'' کیونکہ لفظ 'جاہل' غالب کے نصاب تہذیب و شائستگی سے مطابقت نہیں رکھتا۔ مرزا کی رباعی کی اصل شکل یہی معلوم ہوتی ہے کہ

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل　　سن سن کے جسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش　　گویم مشکل و لے نہ گویم مشکل

غالب کی افتادِ طبع تو یہ تھی کہ:

تھی نو آموزِ فنا ہمت دشوار پسند　　سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

میں اپنے محترم جناب پرتو روہیلہ سے بصد ادب یہ بھی گذارش کرونگا کہ وہ اپنے درجِ ذیل جملے پر بھی نظر ثانی فرمائیں۔

''مرزا کی نشوونما اور حالات زندگی میں احساس کمتری کے نفسیاتی اصول کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔''

جناب پرتو نے غالب کی انشاء نگاری و فارسی نامہ نویسی پر نہایت بسیط و بلیغ باب رقم کیا ہے اور غالب کی فارسی نثر کے جو اجزائے ترکیبی بیان کیے ہیں وہ اُن کی تحقیقی بصیرت کا ثبوت ہیں یعنی ان اجزائے ترکیبی میں ''خودنمائی، قدرتِ بیان کا طنطنہ و طمطراق۔ سرہ نویسی کی کوشش اور دستوری تلازمات، سجع نگاری و محاورات شامل ہیں۔''

ترجمہ و تحقیق فاضل مصنف کا نمایاں اختصاص سہی لیکن اُن کی فکر کے دوسرے زاویے بھی اہل نظر کے لیے دامنِ کش دل ہیں یعنی اُن کی شاعری کے سات دواوین جو منصۂ شہود پر آچکے ہیں اُن کی غیر معمولی اور متنوع شعری صلاحیتوں کے مظہر ہیں وہ ایک کثیر اللسانی اہل قلم ہیں یعنی اردو اور فارسی کے علاوہ اُن کی تخلیقات پاکستانی زبانوں میں ایک اہم اور باثروت زبان 'پشتو' میں بھی ہیں دوہا نگاری بھی اُن کی شناخت ہے۔ پرتو روہیلہ ہمارا ایک قیمتی علمی و ادبی اثاثہ ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہماری جامعات اُن کے علمی اعزاز کا حق اُن تک پہنچانے کی طرف توجہ دیں۔ اشعار کو جذبہ و احساس کی آنکھ سے دیکھیے اور وجدانی کیفیات کا لطف اُٹھائیے۔

اس قدر تم کو پا کے خوش ہیں ہم　　فرطِ جذبات سے ہیں آنکھیں نم

(جولائی۔ ستمبر ۲۰۱۲ء)

شورِ دروں

اسحاق شور

بیک وقت نظم ونثر پر مشتمل زیر نظر کتاب ''شور دروں'' کو مصنف وشاعر اسحاق شور مرحوم کی صاحبزادی پروفیسر شوکت سعید نے اپنے پیش لفظ کے ساتھ مرتب کیا ہے اور اختتام درج ذیل شعر پر کیا ہے جو مرحوم شاعر کی فکری وفنی عظمت کا ایک نہایت بلیغ استعارہ ہے۔

شور سا شوریدہ سر آیا تھا شاید اس طرف　　　یہ جو سرخی سی نظر آتی ہے نوک خار پر

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ اسحاق شور مرحوم کو احسان دانش مرحوم سے دوگونہ تعلق و رفاقت کا امتیاز حاصل تھا یعنی دونوں کا آبائی وطن یو۔ پی (انڈیا) کا مردم خیز خطہ ضلع مظفر نگر تھا اور جب قیام پاکستان سے قبل احسان صاحب کے بہت بعد شور صاحب بھی لاہور آئے تو رہائش بھی مشترک میسر آئی بلکہ مسائل ومصائبِ حیات کی یکسانیت بھی۔ چنانچہ زیر نظر کتاب کے مطالعہ سے واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ احسان دانش کے فکروفن اور نظریات سے ہم آہنگی اسحاق شور کی شاعری کا نمایاں اختصاص ہے جہاں ہئیت اور اُسلوب میں مماثلت ہے وہیں فکروفن کے زاویے بھی ہم آغوش دکھائی دیتے ہیں۔ 'شور دروں' کا تمام کلام شاعر کی پختہ گوئی کا برملا ثبوت ہے جس کا عکس درج ذیل اشعار میں دیکھا جاسکتا ہے۔

زباں سے آشنا رکھا ہے ہجومِ آہ و فغاں کو میں نے
مصیبتوں سے نظر کے سانچے میں ڈھالا اپنی زباں کو میں نے
زباں پہ ہر بلبل حزیں کے مری وفاؤں کے ہیں ترانے
پلا کے کانٹوں کو خون اپنا دکھا دیا باغباں کو میں نے

بنایا شبنم کو شعلہ ساماں سکھایا لالے کو خوں اُگلنا
غرض کہ اس مسند چمن سے اُٹھا دیا باغباں کو میں نے
بجا ہے اے شور ہاں بجا ہے جناب احسان کا یہ مصرعہ
''بدل دیا اپنی شاعری سے فضائے ہندوستاں کو میں نے''

اک حسین اتفاق یہ بھی کہ زیرِ نظر تصنیف کی طباعت واشاعت کا اہتمام بھی اُس ادارے کی جانب سے کیا گیا جس کے موسس و مہتمم خود جناب احسان دانش تھے۔ کتاب پر قیمت کے عدم اندارج پر مجھے غالب کا نہایت برمحل شعر اچانک یاد آ گیا جو اہل ذوق کے لیے ایک 'قیمتی نوید' ہے:

سرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے کہ رہے چشم خریدار پہ احساں اپنا

مقدمہ نگار معروف اہل قلم خلیق احمد خلیق ہیں جن کی تحریر درج ذیل اہم نکات پر مشتمل ہے۔

۱۔ خطاطی۔ مصوری اور شعر گوئی جیسی نازک اصناف میں دسترس اور کمال حاصل کرنا اسحاق شور جیسے ہفت پہلو اور جامع الصفات شخص ہی کا کام تھا۔

۲۔ انھوں نے بطور شاعر کلاسیکی رومانویت کی روایت کو اپنایا۔

۳۔ جذبات کی شدت، احساس کی تیزی اور جمالیاتی ادراک ان کی نظموں کا طرۂ امتیاز ہے۔

۴۔ اسحاق شور نے فرسودہ ستم پیشہ اور انسان دشمن سماج پر شدید ترین تنقید سے بھی گریز نہیں کیا۔

۵۔ اسحاق شور کی نظم کی اہم خصوصیت مناظرِ فطرت کی عکاسی ہے۔ میر انیس۔ جوش ملیح آبادی اور احسان دانش کے بعد مناظر فطرت کی اتنی بھرپور اور سچ مچ مصورانہ عکاسی ہمیں صرف اسحاق شور کے ہاں ملتی ہے۔

۶۔ وہ فطرتاً ایک نظم گو شاعر ہیں۔ غزلیں انھوں نے ضرور کہی ہیں مگر غزل اُن کا پسندیدہ میدان نہیں تھا۔

مجھے صرف آخری نکتے سے اختلاف ہے۔ کتاب میں۔۔ ۲۶ نظمیں اور ۱۵ غزلیں شامل ہیں۔ میں نے سب کا بغور مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ بہ اعتبار مقدار نظموں کی تعداد زیادہ سہی لیکن معیار کے لحاظ سے اُن کی غزل گوئی ایک ارفع مقام پر فائز ہے۔ وہ غزل کے فن اُس کے آہنگ و اُسلوب اور موضوعاتی کثیر الجہتی پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ اور ایک غزل گو کی حیثیت سے اُن کے مرتبہ و مقام کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ملاحظہ ہو:

سینہ پہ دست موت ہے آنکھوں پہ دست ناز — اب زندگی کی کوئی ضرورت نہیں مجھے
شاید بہار چاک گریبانیاں سکھائے — آنسو بہا رہا ہوں کہ فرصت ہے آجکل
جو عمر بھر فریب وفا ٹوٹنے نہ دیں — ان دشمنوں کی مجھ کو ضرورت ہے آجکل
تری موجودگی میں اپنے غم خانے کے ذروں پر — تصدق ہوتے دیکھی ہے عموماً چاندنی ہم نے
سننے والا بھی مقدر سے کوئی مل جائے گا — آنسوؤں کے ساتھ نغمے گنگناتے جایئے
خدا کی دین ہے اے شور عشق کی توفیق — رہِ حرم سے نہ کوئے بتاں سے ملتی ہے
الم مسلسل الم نہیں ہے خوشی مسلسل خوشی نہیں ہے — میں ایسے جینے سے باز آیا یہ زندگی زندگی نہیں ہے
مہارت تھی بہت ہی حسن کو بھی عشق میں لیکن — ہرا کر جان و دل آخر یہ بازی جیت لی ہم نے

حقیقت یہ ہے کہ اسحاق شور کی نظموں کا حُسن بھی اُن کی غزل گوئی کی کا مرہون منت ہے۔ تراکیب۔ تشبیہ و استعارہ اور غزل جیسی رمزیت و اشاریت نے ان کی نظموں کی اثر پذیری کو دوبالا کر دیا ہے بلکہ بعض نظموں پر تو ایک خوبصورت غزل کا گمان ہوتا ہے جیسے ان کی نظم ''وادیٔ غربت میں پہلا قدم'' جس کا آغاز اِس شعر سے ہوتا ہے۔

غربت میں وحشتِ دل سوزاں نہ پوچھئے — ہر ہر قدم پہ یورشِ پیکاں نہ پوچھیئے

ایک اور شعر ملاحظہ ہوں

زلفِ شب مغرب کے کاندھوں پر پریشاں ہوگئی — میری شام زندگی شام غریباں ہوگئی

کتاب کا دوسرا حصہ پانچ کہانیوں پر مشتمل ہے جو منجملہ دیگر فنی محاسن حسنِ بیان وکلام کا مرقع ہیں۔ چند مثالیں

۱۔ ''ایسی ہی میری بھی اک بھابی تھی۔ دس بارہ خاندانوں میں پہلی دلہن جیسے جھیل میں کنول۔ باغیچے میں کیوڑے کا پھول خوابوں میں آنیوالی پری'' (بھابی)

۲۔ ''مجھے اپنے مکان کی چھت سے اپنی دلہن کو دکھادے میں گلے لگا کر نہ سہی اپنی نگاہوں سے اس کی پیشانی پر پیار کی افشاں چن دونگی'' (بھابی)

۳۔ ''یہ شخص بھیانک راستوں کے نشیب وفراز کو اُس کے شباب کی قندیل سے منور کرتا ہوا اسٹیشن پہنچا (بھابی)

۴۔ میں نے وفاداری کا عہد نامہ اپنے خون سے لکھ کر اُسے پیش کر دیا۔ اُس نے اپنے ہونٹوں سے مہر ثبت کی۔'' (نامہ بر)

۵۔ ہم صبح کے انتظار میں امیدوں کے فانوس روشن کر کے بیٹھ گئے۔ (خورشید)

۶۔ '' ماں اپنے بچوں کی ہر خطا معاف کر دیتی ہے لیکن اپنے شوہر کی کسی بھی لغزش سے چشم پوشی نہیں کر سکتی'' (نوشہرہ کیمپ)

شور مرحوم بڑے خوش نصیب تھے کہ اللہ نے اُنھیں ایسی باشعور اولاد عطا فرمائی جس نے ان کے کمالات کو مرتب ومحفوظ کر کے آئندہ نسلوں کو ایک گراں مایہ تحفہ پہنچا دیا اور ان کے فکر وفن کے شہ پاروں کو تاریخ کی گرد میں روپوش ہونے سے بچالیا۔ ورنہ بقول غالب:

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم   تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

(جولائی۔ ستمبر ۲۰۱۲ء)

خواب سارے سنبھال رکھنا (شعری مجموعہ)

شمع سیّد

زیرِ تبصرہ شعری مجموعے کی شاعرہ شمع سیّد نے 'اپنی بات' کے زیرِ عنوان جو کلمات تحریر کیے ہیں ان سے دو مختصر اقتباسات کا پیش کیا جانا از حد ضروری ہے۔ کہ یہ اقتباسات شمع کے شعری رویّوں کو سمجھنے اور حیات و کائنات کے بارے میں ان کے تصورات سے متعارف ہونے میں مدد گار ہو سکتے ہیں ملاحظہ ہوں:

(الف) ''شاعری سوچ کے بہاؤ اور لفظوں کے الاؤ کا نام ہے۔۔۔ جو اندر ہی اندر بھڑکتا رہتا ہے۔''

(ب) ''فطرت کے سب رنگ انسانوں کے رویے اور اُن کے احساسات سے گندھے نرمل کومل جذبے جب روح کی سرزمین پر پھوٹتے ہیں تو ان پر بہار بھی آتی ہے اور خوشبو بھی چارسُو بکھرتی ہے۔۔۔ فطرت کے یہ سب رنگ احساسات کی صورت میں مجھ میں بھی موجود رہے ہیں۔''

''خواب سارے سنبھال رکھنا'' میں شاعرہ کا رجحان غزل کی طرف زیادہ ہے جب کہ نظم کی صنف میں بھی لہجہ و اُسلوب کا وہی سلیقہ نظر آتا ہے جو غزل میں ہے۔ جذبہ و احساس کو نرم و نازک الفاظ میں اس طرح میزان کر کے ابلاغ کے سانچوں میں ڈھالا گیا ہے کہ شمع کی شاعری اس کے سوچ کے بہاؤ اور لفظوں کے الاؤ کی تصویر بن گئی ہے۔ مثلاً

مرے لبوں پر ہیں چپ کی صورت وفا کے نغمے ۔۔۔ تڑپ رہے ہیں سوال سارے جواب سارے
یہ رات ڈر سے سحر کے پہلو میں جا گری ہے ۔۔۔ یہ کس کی یادوں میں جل بجھے ماہتاب سارے

اردو شاعری کے موضوعات اور اسالیب میں گذشتہ نصف صدی میں جو وسعت آئی ہے

اُس کی لطیف وحسین پرچھائیاں زیرِ نظر مجموعے میں دیکھی جاسکتی ہیں جو تصنع وتکلف سے مبرا اور جذبوں کی صداقت کا دل آویز گلدستہ ہے جس کا ثبوت درج ذیل خوبصورت شعر سے ملتا ہے:

میرے آنچل پہ تم نے جو ٹانکے
چاندنی گم ہے اُن ستاروں میں

شمع نے کہا ہے کہ فطرت کے سب رنگ احساسات کی صورت میں مجھ میں موجود رہے ہیں چنانچہ زیرِ نظر کلام اس سچ کی برملا گواہی دے رہا ہے بلکہ معاصر شاعرانہ فکر کو نرم ونازک اظہار کے نظر نواز سانچے بھی مہیا کر رہا ہے۔ کلاسیکی اسالیب اور موضوعات ہمارا قیمتی سرمایہ سہی لیکن ارتقاء کا عمل تیز رفتار لمحوں کے قدم بہ قدم جو حرف وصوت کے نئے پیکر تراش رہا ہے اس کی بھرپور نمائندگی شمع سید کے کلام میں دیکھی جاسکتی ہے:

سانس کو صندل بدن کو چندن کر دو نا
آنکھ کو کاجل زلف کو ناگن کر دو نا

دھنک دھنک سا جسم ہے میرا دیکھو تو
رنگوں کو تم میری اُترن کر دو نا

مجھ سے لپٹ کر کہتی ہے یہ بادِ صبا
چمپا چنبیلی میرا دامن کر دو نا

کھل کر برسو کبھی تو میرے صحرا پر
ہر پہلو سے خود کو ساون کر دو نا

بکھری ہیں جو پھول اور کلیاں سوچوں کی
اُن کو سمیٹو پھر سے گلشن کر دو نا

اک لڑکی پاگل پاگل سی انجانی سی لگتی ہے
آنکھوں میں اُس کے دیکھو کچھ حیرانی سی لگتی ہے

عشق کے رنگ میں رنگ لیا ہے سنا ہے تن من کو
اُس کو کچھ بھی ہوش نہیں ہے دیوانی سی لگتی ہے

شمع کی شاعری کو پڑھ کر احساس ہوا کہ وہ سچے جذبوں کی شاعرہ ہے جدید لفظیات پر قدرت حاصل ہے اور غزل کے عصری مزاج وآہنگ سے واقف۔ اس نے سچ کہا ہے کہ فطرت کے سب رنگ، انسانوں کے رویے اور اُن کے احساسات سے گندھے نرل کومل جذبے جب روح کی سرزمین پر پھوٹتے ہیں تو ان پر بہار بھی آتی ہے اور خوشبو بھی چارسو بکھرتی ہے۔ ذرا دیکھیے:

چلا ہے قافلہ کس سمت آج پھولوں کا
بہار دیتی ہے کس کو خراج پھولوں کا

وہ فصل کانٹوں کی تھی ہم نے خود ہی کاٹی ہے　　کسی کے سر پہ رکھا ہم نے تاج پھولوں کا
ہوا میں گھولی ہے یہ زہر انک بُو کس نے　　ہوا ہے شمع جو برہم مزاج پھولوں کا

شیشے جیسا خواب تھا اک تعبیر تھی اُسکی مٹی کی
ہیرے جیسی آنکھ میں پھر تصویر تھی اس کی مٹی کی
عشق نے کر دی سنگ وہی تقدیر تھی اُس کی مٹی کی
پتھر کا تھا رانجھا خود اور ہیر تھی اُس کی مٹی کی
سیم و زر کا سوداگر تھا ساتھ جو اس کے رہتا تھا
اب تک خالی ہاتھ رہا جاگیر تھی اس کی مٹی کی
لفظوں کے سب سپنے تھے اور محل بھی سارے لفظوں کے
عشق زمیں پر پھیلی ہوئی تحریر تھی اُس کی مٹی کی

زیرِ نظر مجموعہ کی شاعرہ سچے جذبوں اور نازک احساسات کی شاعرہ ہونے کے ناطے اپنے کلام کو صنائع بدائع اور دیگر فنی محاسن سے آراستہ کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔ صداقت و سلاست اور برجستگی ہی اُس کے محاسنِ کلام ہیں۔ البتہ ایسا بھی نہیں کہ اس کا قلم صرف داخلیت پر مرتکز ہو شمع کے یہاں معروضیت اور عصری معنویت کی خوبصورت مثالیں بھی موجود ہیں:

یہ بستی خدا کی بستی ہے دستور پرانا ہے اس کا　　جب وقت بدلتا ہے تو پھر انسان بدل ہی جاتے ہیں
کتنے معصوم ہیں دکھ درد اٹھانے والے　　یہ سمجھتے ہیں کہ مخلص ہیں زمانے والے
اب مرے قتل پہ چپ چاپ کھڑے ہیں وہ بھی　　جن کا دعوی تھا وہ ہیں جان لٹانے والے
میں تو تنہائی کی دہلیز پہ دم توڑ چکی　　کس لیے روٹھ گئے پاس بٹھانے والے

اہلِ دنیا سے شکوہ و شکایت اپنی جگہ لیکن ''خواب سارے سنبھال رکھنا'' میں جو چیز قاری کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ شمع سید کے کلام میں ترنم اور موسیقی کی ایک دلپذیر فضا ہے۔ لگتا

ہے کہ اس باب میں بھی ان کے اُفقِ ذہن پر چھا جانے والی گھٹاؤں کی رم جھم کا فیضان ہے:

دریچوں پہ خوشبو لٹا کر تو دیکھو
کبھی میرے آنگن میں آ کر تو دیکھ
پسِ دل ہے رقصاں وہ یادوں کا جنگل
مُدھر گیت چاہت کا گا کر تو دیکھو
اپنی سوچ میں شامل کر کے
رکھ دو مجھ کو پاگل کر کے
موتی جیسا رقص کروں میں
یاد کو تیری جنگل کر کے
برسو گے کب دل پر میرے
اپنے پیار کو بادل کر کے
جو غم کا لمحہ تھا ٹل گیا ہے
جنوں مشیت میں ڈھل گیا ہے
وہ جس کی رم جھم میں بھیگتے تھے
وہ سارا ساون بدل گیا ہے
ایک اُجلے گلاب جیسے ہیں
دل کے رستے بھی خواب جیسے ہیں
دل کی دھرتی ہے کہکشاؤں تک
کتنے دھوکے سراب جیسے ہیں

مختصراً یہ کہ شمع سید کا مجموعۂ کلام منظرِ عام پر آنے کے ساتھ موجودہ شاعری کی کہکشاں میں ایک تجلی بار ستارے کا اضافہ ہوا ہے۔ قارین کو میرا مشورہ یہ ہوگا کہ مفہوم و معانی اور فنی باریکیوں سے ماورا ہو کر اشعار کو جذبہ و احساس کی آنکھ سے دیکھیئے اور وجدانی کیفیات کا لطف اُٹھایئے۔

(جولائی۔ستمبر ۲۰۱۲ء)

جہان اسلام

ڈاکٹر خلیل طوق اُر

''مجھے تاریخ کے قدِ آدم آئینہ کے سامنے ایک نوع بشر کی حیثیت سے کھڑا ہو کر بار بار دیکھنا بہت پسند ہے۔''

یہ الفاظ ''کلماتِ آغاز'' کے طور پر فاضل تُرک مصنف اور استنبول یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر نشین پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوق اُر نے اپنی تازہ تصنیف ''جہانِ اسلام'' کے پیش لفظ میں تحریر فرمائے ہیں۔ کتاب کے مطالعہ کے بعد ان الفاظ کی معنویت اور بلاغت کی سحر آفرینی قاری پر ماضی کا آئینہ خانہ کھول دیتی ہے جو سلطنت عثمانیہ کے عروج و زوال کی داستان بھی ہے اور برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے جذبۂ حُریّت و اخوت کی ترجمان بھی۔ فاضل مصنف کے وہ اوصافِ حمیدہ جو اُن کی شناخت بن چکے ہیں اُن میں سرِ فہرست اُن کی پاکستان سے گہری محبت اور اردو زبان سے والہانہ عشق ہے۔ انھوں نے عہد عثمانیہ کے آخری دور میں استنبول سے شائع ہونے والے ترکی۔ عربی۔ اردو اخبار ''جہانِ اسلام'' کو برصغیر اور ترکی کے فرزندان توحید کے درمیان اخوت و محبت پر مبنی تاریخی تعلقات کا گواہ بنایا ہے چنانچہ زیر تبصرہ کتاب کا بیشتر مواد اس اخبار کے اُن شماروں سے ماخوذ ہے جو اُنھوں نے انتہائی محنت و کاوش اور تحقیق و جستجو کے بعد حاصل کیا۔

محترم ڈاکٹر صاحب کی اس تحقیق کے نتیجہ میں برصغیر پاک و ہند اور ترکی کی صحافت کا ناقابلِ فراموش کردار بھی سامنے آیا ہے۔ ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے اردو اخبار ''جامِ جہاں نما'' کا اجراء ہوا پھر ۱۸۳۶ء میں ''دہلی اردو اخبار'' کے اشاعت شروع کرنے کے بعد سر سید احمد خاں اور ان کے بھائی سید محمد خاں کا ''سید الاخبار''۔ سید جمیل الدین کا ''صادق الاخبار'' اور ''قران السعدین'' ''فوائد الناظرین''۔ ''ہُمائے ہند'' اور ''خورشید پنجاب'' جیسے اخبار نکلنا شروع ہوئے اس ضمن میں فاضل مصنف نے ڈاکٹر انور سدید اور پروفیسر مسکین علی حجازی کی تالیفات سے درج ذیل

اہم حوالے بھی دیئے ہیں۔

١ ''١٨٥٧ء میں سقوطِ دہلی نے مسلم صحافت پر ضربِ کاری لگائی تھی۔ بیشتر اخبارات بند کردیئے گئے جنگ آزادی کے بعد ٣٥ میں سے ١٢ اخبار بچے جن میں سے صرف ایک اخبار کے مدیر مسلمان تھے'' (اردو ادب کی مختصر تاریخ از ڈاکٹر انور سدید)

٢ ''١٨٥٧ء سے ١٩١٤ء تک یعنی ٥٧ برس میں برصغیر کی صحافت کئی انقلابی تبدیلیوں سے دوچار ہوئی۔ مگر بیسویں صدی کے آغاز میں مولانا ظفر علی خان، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے جری اور نڈر صحافیوں نے صحافت کو دوسری انتہا پر پہنچا دیا۔ پچاس، پچپن برس میں صحافت کا خوشامد سے بغاوت اور مبارزت کی حد تک پہنچ جانا کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ روزنامہ زمیندار، کامریڈ۔ الہلال اور ہمدرد نے صحافت کا معیار قائم کیا'' (صحافت، از مسکین علی حجازی)

زیر تبصرہ تصنیف 'جہان اسلام' نہ صرف اپنے موضوع کے اعتبار سے نہایت جامع اور معتبر تحقیق ہے بلکہ اس کے مندرجات عالم اسلام کی تاریخ کے اُن گوشوں کا بھی احاطہ کرتے ہیں جو صرف عروج و زوال ہی کی داستان نہیں بلکہ اپنے اندر، بقول ڈاکٹر طوق اَر، 'ہم سب کو ماضی کی مانند مستقبل کے بارے میں گہرے تفکر سے پرانی غلطیوں کو بار بار نہ دہرانے میں مددگار ثابت ہوگی' چنانچہ وہ تاریخی پس منظر میں اُن مراحل اور واقعات پر توجہ مرکوز کرتے ہیں جو مستقبل میں اسلامیان عالم کو اپنا کردار متعین کرنے میں غلطیوں کے ارتکاب سے بچا سکتے ہیں۔ ان سنگ ہائے میل میں شامل ہے ١٨٥٧ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد انگریزوں کی مسلمان دشمنی، انگریز حکومت کی پالیسی میں ١٨٧٠ء سے منافقانہ تبدیلی، ایک انگریز افسر (ہیوم) کے ہاتھوں ١٨٨٥ء میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کا قیام (جس سے سرسید نے مسلمانوں کو دُور رہنے کا مشورہ دیا) اور ١٩١٥ء میں تقسیم بنگال کے بعد ہندوؤں کے احتجاج پر تقسیم کی منسوخی۔ غرض ١٨٥٧ء سے پہلی جنگ عظیم تک برصغیر کے مسلمانوں کو ابتلا و مصائب کے بدترین دور سے گزرنا

پڑا دوسری طرف سلطنت عثمانیہ بھی سخت ترین آزمائش سے دوچار رہی۔ ۱۸۷۶ء میں عبدالحمید ثانی ترکی میں مسند نشین مملکت ہوئے ڈاکٹر طوق اُر کے الفاظ میں یہ دور عثمانی عہد کے سیاسی انقلاب کے آغاز اور انجام کا دور ثابت ہوا۔ اس سے قبل عہد عباسیہ میں مسلمان افراتفری کا شکار رہے۔ البتہ تاریخ شہادت دیتی ہے کہ چودھویں صدی عیسوی سے اٹھارویں صدی عیسوی کے آغاز تک عثمانیوں کو عروج حاصل رہا پھر ۱۸ویں اور ۱۹ویں صدیاں بہت کٹھن ثابت ہوئیں۔ عالم اسلام کا مشرقی بازو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد کٹ چکا تھا۔ مغربی بازو کی قطع بُرید پر مغرب شروع ہی سے کمر بستہ تھا چنانچہ ویانا کے صلح نامے کے بعد سے پولینڈ ہنگری اور رومانیہ ہاتھ سے نکلے۔ ۱۸۷۵ء میں روس کی پشت پناہی میں ہرزگوونیا اور ۱۸۷۶ء میں بلغاریہ میں غدر برپا ہوگیا۔ پھر روس کی شہ پر سربیا اور مونٹی نیگرو میں شورشیں ہونے لگیں۔ ۱۸۷۷ء میں بدنظمی کو بہانہ بنا کر روس نے عثمانیوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا چنانچہ روس سے مجبوراً صلح کے نتیجہ میں رومانیہ سربیا، مانٹی نیگرو اور بلغاریہ نے خودمختاری حاصل کر لی ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر دیا لیکن ترکی کے بہادر جرنیلوں مصطفےٰ کمال پاشا، انور پاشا اور عصمت پاشا نے خفیہ طور پر طرابلس پہنچ کر مقامی عرب قبائل کو فوجی تربیت دی اور اٹلی کی پیش قدمی روک دی۔ اس دوران یونان۔ بلغاریہ اور سربیا کی فوجوں نے عثمانیوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ دوسری طرف بلقان میں جنگ چھڑی تو حکومت عثمانیہ نے اٹلی سے صلح کر کے طرابلس کو خیر باد کہہ دیا اور سربیا کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔

عالم اسلام کے لیے شکست و ریخت کا یہ منظر نامہ بالخصوص مسلمانان برصغیر کے لیے سلطنت عثمانیہ کے سقوط کا یہ کربناک تجربہ ناقابلِ برداشت تھا۔ فاضل مصنف ڈاکٹر طوق اُر لکھتے ہیں کہ حکیم الامت حضرت علامہ محمد اقبال کی شہرۂ آفاق نظم ''شکوہ و جواب شکوہ'' اسی پس منظر کے ساتھ کہی گئی۔ اس روح فرسا حادثے کے بعد عثمانیوں نے 'اتحادِ اسلامی' کی حکمتِ عملی وضع کی چنانچہ سید جمال الدین افغانی کی تحریک (Pan-Islamism) اسی کا منطقی نتیجہ تھی۔ صحافت

پر جو اثرات مرتب ہوئے وہ کہیں زیادہ مغرب کے لیے باعثِ تشویش تھے لیکن برصغیر کی مسلم صحافت اور خود ترکی میں اردو صحافت کے احیاء میں اتحادِ اسلامی کی گونج سنائی دے رہی تھی۔

شاید تمھیں نصیب ہوائے کشتگانِ شب   روئے اُفق پہ صبح کے آثار دیکھنا

ترک پارلیمنٹ کی تائید و حمایت سے جو اخبارات منصۂ شہود پر آئے تھے ان میں 'پیک اسلام' سب سے زیادہ انگریزوں کے لیے باعث تشویش ثابت ہوا کیونکہ اس اخبار نے ترک اور ہندی مسلمانوں کے درمیان رشتۂ اخوت کو مضبوط کرنے اور خیر سگالی کی فضا کو فروغ دینے میں موثر کردار ادا کیا اور عثمانی خلافت کو تمام دنیائے اسلام کا محور و مرکز قرار دیا یہی کردار برصغیر کے مسلم اخبارات زمیندار۔ الہلال ہمدرد اور کامریڈ وغیرہ نے بھی انجام دیا۔ اس صورت حال سے گھبرا کر برطانوی حکومت نے چوبیس گھنٹے میں 'پیکِ اسلام' کی بندش کا مطالبہ کر دیا اور اخبار بند ہو گیا۔ 'جہانِ اسلام' کے علاوہ 'الدستور' بھی انجام کو پہنچا البتہ 'اخوت' جو ۱۹۱۵ء میں شروع ہوا تین سال تک جاری رہا۔ 'جہانِ اسلام' کے مدیر شہیر ابوسعید العربی الہندی کے جو حریّت پسندوں میں ایک متحرک شخصیت تھے 'زمیندار' کے مولانا ظفر علی خاں اور 'الہلال' کے مولانا ابوالکلام آزاد سے قریبی مراسم اور دوستی تھی۔ ان کے خیری برادران (عبدالجبار خیری اور عبدالستار خیری) سے بھی ذاتی تعلقات تھے۔ عبدالجبار خیری انگریزی اخبار Brotherhood کے ایڈیٹر تھے جو جنگِ عظیم کے اختتام تک جاری رہا۔

طوق اُر صاحب کی زیرِ نظر تازہ تصنیف کے مطالعہ سے جو ایک ناگریز تاثر قائم ہوتا ہے وہ مسلمانانِ برصغیر سے تحریک خلافت کے دوران اُن کے تاریخ ساز ولولۂ حُریّت اور بے مثال مظاہر اخوت پر اظہار تشکر کرنا ہے جو اُن کی پاکستان دوستی کا بھی برملا ثبوت ہے خدا کرے کہ اہل پاکستان کے دل بھی اپنے تُرک بھائیوں کی محبت میں اُسی طرح دھڑکتے رہیں جس طرح تاریخ ماضی کے حوالے سے بھی اس حقیقت کا برملا ثبوت مہیا کرتی ہے آمین!

(اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۲ء)

قومی زندگی میں قومی زبان کا مقام۔۔۔حدیث دیگراں

محمد اسلام نشتر

اپنے قیام کی تین دہائیوں سے متجاوز مدت کے دوران مقتدرہ قومی زبان نے آئینِ پاکستان کے آرٹیکل ۲۵۱ کی ذیلی دفعات (۱) اور (۲) کے تحت ملک میں قومی زبان اردو کے بحیثیت زبان دفتری نفاذ کے لیے جو اقدامات کیے ہیں وہ اس قدر بامعنی اور جامع ہیں کہ اگر قومی ہئیت مقتدرہ آج فیصلہ کرلے تو کل سے ملک بھر میں اردو کو بحیثیت زبان دفتری بھی عملاً نافذ کیا جا سکتا ہے۔ اس دعویٰ کی ذمہ داری میں اپنے ذاتی تجربہ و مشاہدہ کی بنیاد پر قبول کرسکتا ہوں۔ ۱۹۷۳ء میں ایک متفق علیہہ دستور کے نفاذ کے وقت ۱۵ سال کی مدت کا تعین کیا گیا تھا جس کے دوران اردو کو بطور زبان دفتری نافذ کرنا لازم قرار دیا گیا تھا۔ بعدازاں اس مدت میں دس سال کا اضافہ کردیا گیا جو ۱۹۸۸ء میں ختم ہوگیا گویا اب گزشتہ رُبع صدی سے آئین پاکستان کی تقدیس اور اُس کے منشاء و مقصد کی مسلسل بے حرمتی ہورہی ہے جس کی ذمہ داری گذشتہ پچیس برسوں میں یکے بعد دیگرے برسر اقتدار رہنے والی حکومتوں پر عائد ہوتی ہے۔

ایک خوش قسمتی کہ جس سے ہماری بدقسمت قوم استفادہ نہ کرسکی وہ یہ تھی کہ ۱۹۷۹ء میں مقتدرہ کے تاسیس و قیام سے آج تک جو ہستیاں صدر نشین کے منصب پر فائز رہیں جن میں موسسِ مقتدرہ اور صدر نشین اوّل جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم سے لے کر برادران گرامی پروفیسر فتح محمد ملک اور جناب افتخار عارف تک سب ثقہ و صاحبِ علم۔ صاحب بصیرت، باصلاحیت اور محبِ وطن ہستیاں تھیں ان سے کما حقہ، استفادہ نہیں کیا گیا۔ ۱۹۸۰ء میں مقتدرہ کی جانب سے حکومت کی خدمت میں موثر و قابل عمل، کثیرالجہت اور مرحلہ وار نفاذ اردو کے لیے پیش کردہ سفارشات سے قطع نظر 'جو صدا بصحرا' ثابت ہوئیں مقتدرہ کی خدمات کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۸۱ء ہی میں کتب حوالہ اور فرہنگ و لغات نیز اصطلاحات کی تالیف و ترجمہ

کے کام کا آغاز کر دیا گیا جس کے نتیجہ میں اب تک چھ سو سے زیادہ کتب طبع کی جا چکی ہیں۔ اردو ٹائپ رائٹروں کے لیے ایک معیاری کلیدی تختہ تیار کیا گیا جسے ۱۹۸۰ میں کابینہ ڈویژن نے منظور کر لیا۔ ۱۹۸۲ء میں ایک دارالترجمہ تشکیل دیا گیا۔ ۱۹۸۶ء سے درسی کتب کے تراجم کے لیے ایک علیحدہ شعبۂ درسیات قائم کیا گیا ایک اور اہم کام ''اردو کوڈ پلیٹ'' کی معیار بندی ہے جسے یونی کوڈ کنسور شیم ۲۰۰۰ء نے تسلیم کر کے اردو کو دنیا کی کمپیوٹرائزڈ زبانوں کے شانہ بشانہ لا کھڑا کیا بعد آزاں یہ عظیم منصوبہ مائکروسافٹ جیسے بین الاقوامی ادارے نے بھی تسلیم کر لیا۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے تعاون سے قائم کردہ مراکز میں اب تک ہزاروں افراد کو اردو ٹائپ کاری اور مختصر نویسی کی تربیت دی جا چکی ہے۔ ۱۹۸۰ء کی سفارشات کے بعد مقتدرہ نے سفارشات کی ایک مزید قسط حکومت کو ۲۰۰۵ء میں بھی پیش کی۔ اس میں 'منجملہ دیگر امور' مقابلے کے امتحانات میں نیز عدالتی زبان کے طور پر اردو کو اختیار کیا جانا، ملکی تقریبات اور استقبالیوں میں اردو کا استعمال، دفاتر میں سرکاری خلاصے اردو میں تحریر کیے جانا۔ سینٹ اور قومی اسمبلی کے مباحث اردو میں، ذریعہ تعلیمات اور اردو کو کمپیوٹر کی زبان بنانے کا پروگرام شامل تھے۔

مندرجہ بالا حوصلہ مندانہ اور انقلابی کارگزاری جس سے ہمارا قومی تشخص عالمگیر قبولیت اور احترام حاصل کر سکتا ہے ایک ایسی بلیغ النظر اور عالمانہ قیادت کے بغیر جن میں ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر جمیل جالبی جیسے سکالر صدر نشیں جنھیں بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کے بعد نہایت جامع اور بسیط المعانی ''قومی انگریزی اردو لغت'' مرتب کرنے کا اعزاز حاصل ہوا اور ایسے علم پرور اراکین ادارہ کے بغیر جن میں زیر نظر کتاب کے مرتّب و مدوّن اسلام نشتر صاحب شامل ہوں ممکن نہیں ہو سکتی تھی۔ زیر نظر کتاب جس کے انیس ابواب ۲۶۰ صفحات پر مشتمل ہیں۔ قومی زبان کے حوالے سے مشرق و مغرب کے کم و بیش ۱۴ ممالک کا احاطہ کرتی ہے۔ ان ممالک کی لسانیاتی تشکیل و ارتقاء کا مستند مطالعاتی تجزیہ معروف اہلِ قلم کے ذاتی مشاہدات و تجربات پر مبنی ہے۔ ان میں پروفیسر آفتاب اقبال شمیم (چین) پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل (جاپان) خود

کتاب کے مدون و مرتب محمد اسلام نشتر اور ڈاکٹر خلیق انجم (بھارت) پروفیسر ڈاکٹر عبدالرؤف (نیپال) شاہد ابرار اعوان (سری لنکا) اور خورشید ندیم (انڈونیشا) کے علاوہ کرنل مسعود اختر شیخ اور ڈاکٹر انوار احمد (ترکی) پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد قریشی (مصر) ڈاکٹر جواد ہمدانی (ایران) کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ (جرمنی) پروفیسر ڈاکٹر دانوتا ستک (پولینڈ) پروفیسر ڈاکٹر محمود احمد (اسرائیل) اور پروفیسر ڈاکٹر لدمیلا ویسیلیوا (روس) شریک ہیں۔

فاضل مرتب نے کتاب میں مذکورہ اہل قلم کے مقالات و مضامین کو شریکِ اشاعت کر کے قارئین کو ایک واضح سمت مہیا کر دی ہے اور کامیابی سے ثابت کیا ہے کہ، مشرق و مغرب کی تخصیص سے قطع نظر، کوئی ملک قومی زبان کے تعین میں رابطہ کی زبان اور اُس کی اہمیت و ناگزیریت سے صرفِ نظر کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا چنانچہ پاکستان کے طول و عرض میں اردو کے رابطہ کی زبان کی حیثیت قطعی غیر متنازعہ ہے اور اسی سبب سے اُسے قومی زبان ہونے کا افتخار و اعزاز حاصل ہوا۔ میرے نزدیک جناب اسلام نشتر کی یہ کاوش مقتدرہ کی مطبوعات میں اس لیے بھی ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے کہ اس میں اُن کا اَسّی (۸۰) صفحات پر مشتمل ایک مبسوط و وقیع مقالہ بھی شامل ہے جو ایک کثیر الاکناف عالمی جائزے پر مشتمل ہے جس میں قومی زندگی میں قومی زبان کا مقام اور اس حوالے سے عالمی رویّوں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ انھوں نے جس آفاقی تناظر میں اپنے قارئین کو قیمتی مواد اور معلومات مہیا کی ہیں اس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے کیا جاسکتا ہے۔

"زبانوں کے قدیم لسانی نقشے کا بادی النظر جائزہ لیا جائے تو قدیم مصر کی قبطی زبان، قدیم یونان کی یونانی، قدیم روما کی لاطینی زبان اور برصغیر کے آریاؤں کی سنسکرت زبان کا پتہ چلتا ہے۔ دورِ جدید کی زبانیں انھی کے بطن سے پیدا ہوئیں۔ ماہرین لسانیات و بشریات کے مطابق جب تک کسی زبان کے بولنے والوں کا ذہنی، فکری اور محسوساتی عمل قائم رہتا ہے تو وہ زبان زندہ رہتی ہے۔ گویا قوموں کے تہذیبی مرتبے کا براہ راست رشتہ

زبان اور زبان کا مقام اس کی اپنی تہذیب کی اہمیت سے وابستہ ہے۔ اسی طرح زبانوں کی نشو ونما خود زبانوں ہی کے مرہونِ منت رہی ہے اور زبانوں کا عمرانی تسلسل بنی نوعِ انسان کے تسلسل کے راست متناسب قرار دیا جاتا ہے۔"

آخر میں اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک عالمگیر نظریہ کی بنیاد پر آزاد و خود مختار مملکت تو عطا فرمادی مگر پینسٹھ (۶۵) برس کی طویل مدت گزر جانے کے باوجود نسلی، لسانی اور علاقائی عصبیتوں نے ہمیں زنجریں پہنائی ہوئی ہیں جو ہماری قومی شیرازہ بندی میں رکاوٹ ہیں۔ اے رب کریم ان زنجیروں کو توڑ کر ہمیں ایک متحد و متفق قوم بنا دے۔ ہم کہیں دور نہیں بلکہ اپنے خطے کے ممالک ہی کو دیکھیں کہ چینی قوم جن کی حیاتِ آزادی ہم سے بھی دو سال کم ہے اور جہاں بے شمار بولیاں اور مقامی زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن علم و ادب اور قومی رابطہ کی چینی زبان ایک ہی ہے جو بیجنگ اور اُس کے گرد و نواح میں رائج ہے۔ نیپال ایک چھوٹا سا ملک ہے اور کثیر المذاہب سوسائٹی ہے بلکہ کثیر اللسانی بھی جہاں ستر (۷۰) زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن قومی یک جہتی اور وحدت کا ایک طاقتور عنصر نیپالی زبان ہے جسے رابطہ کی حیثیت حاصل ہے۔ اسی طرح انڈونیشیا جو آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا مسلمان ملک ہے جہاں تہذیبی تنوع بے حد و بے شمار ہے اور جو ہزاروں جزائر پر پھیلا ہوا ہے اور جہاں ڈھائی سو (۲۵۰) سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن رابطہ کی زبان ہونے کی بنا پر قومی زبان کا اعزاز صرف انڈنیشی زبان کو حاصل ہے جو پرائمری سطح سے یونیورسٹی تک تعلیم و تعلم کی زبان ہے پارلیمنٹ کی زبان ہے اور یہی دفاتر کی زبان بھی ہے البتہ جاپان ایک ایسا خوش نصیب ملک ہے جس میں قومی زبان اور اس کے نفاذ کا کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ کوئی اختلاف ہے نہ اعتراض نہ احتجاج۔ اکثریت صرف جاپانی زبان لکھتی ہے اور بولتی ہے۔

(اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۲ء)

بادِ وصال (شعری مجموعہ)

محشر زیدی

اچھی شاعری جن اوصاف سے مشروط ہے ان میں مُنجملہ دیگر، ذہنی توانائی، علمی بصیرت، زبان و بیان کا سلیقہ، تجربہ و مشاہدہ کی باریکیوں کا ادراک، تازہ کاری و حسن آفرینی کی صلاحیت، تخیل و تصور کی پیکر تراشی، جذبہ و احساس کا باطنی شعور اور فطرت شناسی کے لیے چشم بینا شامل ہیں۔ یہ احساس مجھے ''بادِ وصال'' کے مطالعہ کے دوران ہوا۔ محشر زیدی صاحب کے شعری مجموعہ کا یہ عنوان خود اُن کی ایسی غزلوں میں شامل غزل کے ایک شعر سے ماخوذ ہے جن کی ردیفوں کو لفظ و معنی سے ہم آہنگ کیے بغیر اچھا شعر کہنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

ہجر کے بادل اُڑا لیجائیگی بادِ وصال
حسن خود آئے گا رقصاں و غزلخواں صبر کر

مزید ملاحظہ فرمایئے

ساعتِ بخشش گزر جانے پہ کچھ ایسا لگا
جیسے کچھ کہنے کو باقی تھا دعا کے بعد بھی

جانِ شاعر کیا تم آؤ گے عیادت کے لیے
میں اگر بیمار ہو جاؤں شفا کے بعد بھی

میں ایک برگِ خزاں دیدہ وہ بہار تمام
مرے خدا نے مرا حال سن لیا پھر بھی

میں ایک تودۂ خاشاک تھا مگر محشر
گیا ہے کوئی مجھے دیکھتا ہوا پھر بھی

دلِ آوارہ کو تسکین جاں کہتے نہیں تھکتے
ہم اک رہزن کو میر کارواں کہتے نہیں تھکتے

ہمارے ساتھ رسوائی کا پرچم لے کے چلتا ہے
وہی ہم جس کو اپنا رازداں کہتے نہیں تھکتے

گزر جاتی ہے ساری زندگی کانٹوں کے بستر پر
ہمیں دیکھو کہ اس کو گلستاں کہتے نہیں تھکتے

اُلجھا کل اک فقیہہ سے میخوار کچھ سُنا
ہنگامہ ہو گیا سرِ بازار کچھ سنا

مدہوشِ اقتدار ہے پھر شیخِ ہفت رنگ
پھر رقص میں ہیں جبّہ و دستار کچھ سنا

زباں سے حرف نہ نکلے اگر وہ یاد آئے نہیں ہوا کا بھروسہ ہوا سے ڈرتا رہ
کسی سے خوف نہ رکھ خواہ دزد ہو کہ ولی خدا کا شکر ادا کر خدا سے ڈرتا رہ
غرورِ اہل و جاہت کو لا نہ خاطر میں مگر غریب کی آہِ رسا سے ڈرتا رہ

غور طلب نہیں بلکہ خود بخود محسوس ہونے والی بات یہ ہے کہ اشعار میں سلاست وروانی اور شاعر کی فنی گرفت کا یہ عالم ہے کہ قاری اشعار کی سحر آگیں کیفیات میں محصور ہو کر رہ جاتا ہے۔ شاعر کو کلاسیکی اور جدید اسالیب سخن پر مکمل امتزاجی عبور حاصل ہے۔ تمام کلام جہاں اظہارِ جذبات کے معتدل روّیوں سے مملو ہے وہیں احترام حسن اور عظمتِ عشق کا پہلو بھی نمایاں ہے یہی نہیں بلکہ بعض عالمگیر حقیقتوں اور انسانی نفسیات کے نرم و دلگداز پہلوؤں کو نہایت دلپذیر انداز میں اس طرح اشعار کے قالب میں ڈھالا ہے کہ شاعر کے ہنر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے اور وہ اس لیے بھی کہ کلام میں سہلِ ممتنع کا حسن دامن دل کو اپنی گرفت سے آزاد نہیں ہونے دیتا۔

دوست یوں حال پوچھنے آئے جیسے ہوں آندھیوں کے ہمسائے
ایک گلدستۂ حیا ہے وہ شخص بات کرنے سے پہلے شرمائے
اے کفِ خاک سے تصویر بنانے والے میری دنیا بھی سنور جائے اگر تو چاہے
دل سا مجذوبِ محبت بھی کوئی کیا ہوگا سر پہ تلوار ہے اور سایۂ گیسو چاہے
جیا جو موت کی آنکھوں میں ڈال کر آنکھیں ہوا کی زد پہ فروزاں رہا اُسی کا چراغ
ہمیں ہیں لفظ و بیاں کی نزاکتوں کے امیں ہمارے دم سے ہے روشن سخنوری کا چراغ

اسی غزل میں عہد موجود کی ہلاکت خیزیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

ہے ایٹموں کا اُجالا زمیں کا مستقبل نہ آدمی ہی رہے گا نہ آدمی کا چراغ

عصری شعور کی پختگی شاعر کا طرۂ امتیاز ہے کہیں کہیں روایتی مضامین کی پذیرائی ضرور ہے مگر اُسلوب کی تازہ کاری نے قدیم و جدید کی شعری روایت کے امتزاج کو حسین تر بنا دیا ہے جیسے:

سکوں کی تیسری صورت نہیں ہے بزمِ ہستی میں
خدا بن جائے یا پھر آدمی دیوانہ بن جائے

نفس کی آمد و شُد کا ہے نام جانِ عزیز
ہوا کا رقص تھا آدمی فسانہ ہوا

یہ حرف و صوت ہیں اس کے پیامبر محشر
وہی کہ جس کا تعارف بھی غائبانہ ہوا

الزامِ قتلِ شمعِ شبستاں کے سر گیا
پروانہ جلتے جلتے بھی کیا گل کتر گیا

تجھ سے پلک جھپکنے کی تقصیر کیوں ہوئی
اے دشتِ قیس! محمل لیلیٰ کدھر گیا

اُس شوخ کی طلب میں مرا ذوقِ جستجو
ہر منظرِ جمال کو چھو کر گزر گیا

اُس نے کچھ اس ادا سے چمن پر نگاہ کی
کچھ اور بھی بہار کا موسم نکھر گیا

ایک سی مسکراہٹیں ایک سا طرزِ گفتگو
آہ! یہ کیسے جانیئے کون ہے اپنا کون عدو

سیر کہاں ہوا تھا میں ساقی خوش ادا ابھی
اور خراشِ تشنگی ڈال گیا ترا سبو

میرا سکوتِ مے کشی سب کی نظر میں آگیا
ساغرِ انبساط سے آج چھلک پڑا لہو

آنکھوں میں نیند لا نہ کوئی خواب لے کے آ
اک جاگتی ہوئی شبِ مہتاب لے کے آ

ممکن نہیں ہے ایسی شبِ ہجر کاٹنی
تو عاشقوں کا دیدۂ بے خواب لے کے آ

اک چودھویں کا چاند بطِ مے کے ساتھ ہو
چل اُٹھ! نگار خانۂ مہتاب لے کے آ

آج کا انساں نہیں ہے روشنی میں خود کفیل
اب نیا سورج اُگاؤ تب اجالا ہو تو ہو

سر سلامت آپ کا ہونا ضروری ہے حضور
ہم رعیّت ہیں ہمارا بال بیکا ہو تو ہو

یوں تو خود ہنگامہ محفل کی دنیا آدمی
دل پریشاں ہو تو ہے لاکھوں میں تنہا آدمی

زندگی! میری گراں جانی نے رکھ لی تیری لاج
ورنہ تجھ کو دیکھنے کو بھی نہ ملتا آدمی

بے جمالِ آدمیت بے دلِ درد آشنا
آج بھی ہے حاکمِ امروز و فردا آدمی

محشر زیدی کے یہاں بلاشبہ غمِ روزگار کا شکوہ و شکایت ہے لیکن طلوعِ سحر پر اعتماد اور خوبصورت مستقبل کی نوید بھی ملتی ہے یہ سب اُن کے عصری شعور کا فیضان ہے اور ردِ قنوطیت ہی نہیں رجائیت کا برملا اظہار بھی جو اُن کی شاعری میں حسین ترین تلازماتِ غزل کے ساتھ نمایاں ہے۔

ایسے کچھ پیغام لائے گی بہار اگلے برس	دشت ہوجائیں گے رشکِ لالہ زار اگلے برس
اس طرح مہکے گا محنت کا پسینہ ہر طرف	جیسے مہکے نافۂ مشک تتار اگلے برس
عشق کی فرمانروائی کا زمانہ آئیگا	حسن کو ہوگا ہمارا انتظار اگلے برس

یہ آدمی کہ جسے حادثوں نے پالا ہے	اُسی سے چشم نگہدار میں اُجالا ہے
لہو کی نذر گزاریں دلاورانِ چمن	نئی بہار کا سورج نکلنے والا ہے

زباں سے کچھ نہ کہیئے رنگ دنیا دیکھتے رہیئے	دکھائے وقت جو کچھ بھی تماشا دیکھتے رہیئے
پَرے ہٹ ناخدا! ہم کو تگ ودو سے ڈراتا ہے	تو کیا پھر غرق ہونے تک کنارہ دیکھتے رہیئے
یہ تاریکی ہی بالآخر سفیر روشنی ہو گی	جبیں شب سے پھوٹے کا اُجالا دیکھتے رہیئے

حادثے ہیں درحقیقت رہگزر کے واجبات	یہ ادا ہونگے تو آئے گا سفر کرنا مجھے
تیرگی کے وار کا محشر یہی ہے اک علاج	حوصلہ رکھنا اور امیدِ سحر رکھنا مجھے

محشر زیدی کی شاعری حقیقت میں عہد حاضر کے لیے ایک پیغام بھی ہے ان کا دم اس دور میں غنیمت ہے کہ ادب بالخصوص شاعری میں فکروفن کی جو نراجیت اور معیاری شعروادب کا جو اضمحلال نظر آتا ہے اُس کے پیش نظر ضروری ہے کہ ادب اقدار کا پاسدار ہو۔ جسے مزاحمتی شاعری کہا جاتا ہے اس میں مزاحمت کو جارجیت سے پاک کیا جائے اور لب ولہجہ کو فنی خوبیوں سے آراستہ کر کے مؤثر بنایا جائے نیز ماضی کے شعروادب سے اعلیٰ اقدار کو چُن کر شاعری میں وقار و تمکنت پیدا کیا جائے "بادوصال" کا مطالعہ ہمیں دعوتِ فکر دیتا ہے۔ شاعر کے کلام میں یہ اہتمام نظر آتا ہے کہ خودی وخودداری ہی ہماری متاع ہے۔

کارِگنہ اور شوقِ نجات انساں کتنا کم اوقات
اب نکھرا ہے رنگ حیات عشق نے دیدی عقل کو مات

محشر زیدی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن انھوں نے دوسری اصنافِ سخن میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں جن میں حمد ونعت اور منقبت سرِ فہرست ہیں نعت کے دو رُوح پرور

اشعار:

خوشا اُن کے وہ اوصافِ حمیدہ　　کہا جن کے لیے حق نے قصیدہ
جمالِ مصطفٰےؐ میری بصیرت　　کلام مصطفٰےؐ میرا عقیدہ

آخر میں ان کی شاعری میں ناقدریٔ زمانہ کا جو دکھ نظر آتا ہے وہ اپنی جگہ لیکن وہ اپنی خودنگہی کو بھی سرنگوں نہیں دیکھنا چاہتے اس کے باوجود کہ اس عہد میں صرف گروہِ کم نظراں کو نوازے جانے کی روایت عام ہے۔

اب بھی مری ٹھوکر میں ہے ناقدر زمانہ　　گو دولتِ دنیا مرے داماں میں نہیں ہے
محشر اُسی کو خرقۂ اعزاز مل گیا　　جس کم نظر کو دیدۂ بینا نہیں ملا

(جنوری۔مارچ ۲۰۱۳ء)

پیرایۂ اظہار (شعری مجموعہ)

عقیل دانش

گوناں گوں خیالات اور متنوع موضوعات کا احاطہ کرنے کی فنی صلاحیت اگر کسی صنفِ سخن میں ہے تو وہ غزل ہے۔ تخلیق کا عمل بے پناہ جاں کاہی کا متقاضی ہے۔ لیکن تخلیق کو پیرایۂ اظہار عطا کرنا اور اُسے الفاظ و معانی کی ہم آہنگی کے حسن میں ڈھالنا اُس سے بھی کہیں زیادہ جگر کاوی چاہتا ہے۔ مجھے اس حقیقت کا ادراک عقیل دانش کے شعری مجموعے ''پیرایۂ اظہار'' کے مطالعہ کے دوران بار بار ہوا اور ذہن کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ موضوعات تراشنا یا نت نئے مضامین کو شعر کے پیکر میں ڈھالنا یقیناً ایک تخلیقی عمل ہے لیکن اُسلوب یا پیرایۂ اظہار کے حُسن کے بغیر یہ تخلیقی عمل اپنی افادیت کھو بیٹھتا ہے۔ چنانچہ کسی فن یا فنکار کی انفرادیت اُس کے طرز اظہار پر منحصر ہوتی ہے۔ میں اپنے اس تاثر کو تمثیلاً اس طرح بیان کروں گا کہ اردو غزل میں محبوب کے حُسن کو تشبیہ و استعارہ کا جامعہ پہنانے کے لیے شمع یا چراغ کا استعمال کلاسیکی اور جدید شاعری میں بھی ایک مستحکم روایت بن چکا ہے۔ تاہم اُسلوب و اظہار کا حسن ہی شاعر کو لب و لہجہ کی انفرادیت عطا کرتا ہے مثلاً

وہ آئے بزم میں اتنا تو ہم نے دیکھا میر — پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

(میر)

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں — اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

(داغ)

کمال حسن کا اپنے دکھا دیا تو نے — چراغ سامنے رکھ کر بجھا دیا تو نے

(جگر)

چنانچہ اُسلوب کی ندرت کو زیر نظر مجموعے میں جا بجا 'دامنِ کشِ دل' دیکھ کر عقیل دانش کو

برجستہ داد دینا پڑی۔ مثلاً

کوئی بھی لفظ نہیں باعثِ نشاطِ نظر
تمہارے نام سے پہلے تمہارے نام کے بعد

تمہارا حسن زبانِ غزل میں یکتا ہے
تمہارے سامنے کس کا چراغ جلتا ہے

خیال نو کی ضیا دی ہے شعر کے فن کو
غزل میں ڈھالا ہے ہم نے دلوں کی دھڑکن کو

کیا وہ لگتے نہیں پھولوں کی طرح
آپ نے تو اُنھیں دیکھا ہوگا

یہ کس نے دل کے دروبام کو اُجال دیا
ترے خیالِ فروزاں کی روشنی ہوگی

عقیل دانش کا ایک اور شعری روّیہ جس نے مجھے متاثر کیا وہ اُن کی عاشقانہ خودداری ہے اور حقیقتوں کا برملا اعتراف و اظہار ہی نہیں بلکہ معاصر تلخیوں کے بے باکانہ اظہار کے ساتھ ساتھ کردار کی عظمت بھی ہے جس نے اُنھیں اُسلوب کی کاٹ کا اختصاص بخشا ہے۔ آہنگ و انداز کے یہ تیور بھی ملاحظہ ہوں

سچ کہنے کو تیار سردار نہیں ہیں
ہم لوگ ابھی صاحب کردار نہیں ہیں

فرازِ دار سے ہم نے جو بات کی ہوگی
ہمیں یقیں ہے کہ منشور آگہی ہو گی

اک بوجھ ہے دل پر تو بُھلا کیوں نہیں دیتے
آئینے کو شبنم سے جلا کیوں نہیں دیتے

ہر شخص ہے سہا ہوا طوفان بلا سے
طوفاں کو مرے گھر کا پتا کیوں نہیں دیتے

ہر جسم کہاں جس پہ یہ پوشاک خوش آئے
دانش کو لہو کی یہ قبا کیوں نہیں دیتے

جب کہیں سچ کے لیے دار ورسن سجتے ہیں
میری آواز سردار ورسن آتی ہے

میں بھی سچ کہتا ہوں اس جرم میں دنیا والو
میرے ہاتھوں میں بھی اک زہر کا پیالہ دے دو

کہاں ہے گردشِ ایام دیکھ ہم ہیں وہ لوگ
کہ ٹوٹ جائیں مگر سر کو اپنے خم نہ کریں

یہ دور وہ ہے کہ حق گوئی تو کجا دانش
ولی ہیں آپ اگر مدحتِ ستم نہ کریں

''پیرایۂ اظہار'' کے شاعر کا عمرانی شعور اور گرد وپیش کے حالات کا ادراک پختہ بھی ہے اور توانا بھی۔ توصیف ہو کہ تنقید، ہر دو صورتوں میں ان کا رویہ معروضی ہے وہ ظلم و ناانصافی کے خلاف سینہ سپر رہنا جانتے ہیں۔ نئے ماحول اور جبر و قدر کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا اُن کا

منشورِ حیات ہے لیکن ماضی فراموشی عقیل دانش کے نصاب زندگی میں شامل نہیں وہ جدید وقدیم کا ایک ایسا سنگم ہیں جہاں کھڑے ہوکر آوازِ حق بلند کرنا اُن کا مسلک ہے:

رفتار وقت اہل قلم دیکھتے رہو — یہ بھی ہے اک ستم کہ ستم دیکھتے رہو
بدل کر زاویہ نظروں کا دیکھو — خزاؤں میں بھی رعنائی ہے کیسی
قافلے والوں کا نقش کفِ پا ملتا ہے — راہ کی دھول میں منزل کا پتا ملتا ہے
بدلی ہے صدی صرف مقدر نہیں بدلا — انساں کی زبوں حالی کا منظر نہیں بدلا
فاتح کے جلومیں چلے سب مصلحت اندیش — ہم وہ تھے کہ ہارا ہوا لشکر نہیں بدلا
لو! خندہ بلب سیل بلا میں بھی ہے دانش — یہ شخص عجب چیز ہے یکسر نہیں بدلا
اس دور میں اور عرض ہنر سوچو تو — کاندھے سے اُتر سکتا ہے سر سوچو تو
کیا روشنی ظلمت ہی کا اک پرتو ہے — ممکن ہے بہ انداز دگر سوچو تو
قدموں میں مہ و مہر ہیں دانش لیکن — انساں ہے ابھی خاک بسر سوچو تو

عقیل دانش کا اُس نسل سے تعلق ہے جس نے ہجرت کا عذاب بھی سہا اور یاد وطن کو بھی سینے سے لگائے رکھا۔ زمانے کی بے مہری بھی دیکھی اور منافقت کے زخم بھی کھائے لیکن ہمت نہیں ہاری اور مستقبل میں روشنی دیکھنے کی تلاش جاری رکھی ۔شعر ہی کو اظہار کا ذریعہ بنایا اور یاسیت وقنطویت کے بت رجائیت کی ضربت کاری سے پاش پاش کیے اور وسوسوں کو روشن مستقبل کی نوید سنائی۔

دلوں کا خون فراہم کرو چراغوں کو — کہ یوں اندھیرے کے آثار کم نہیں ہونگے
دانش یہ شکوۂ شب تاریک تابہ کے — وہ رات کونسی ہے کہ جس کی سحر نہیں
فغان بلبل غمِ بیگانگی سے آج بھی ہیں — خود اپنے شہر میں ہم اجنبی سے آج بھی ہیں
نظر سے دور ہوئے کتنے سال بیت گئے — تصورات کے رشتے کسی سے آج بھی ہیں
سندھ کی، راوی کی اور گنگ وجمن کی باتیں — آیئے کیجئے کچھ دیر وطن کی باتیں

ہم نے اس شہر میں اک شمع جلا رکھی ہے — ورنہ ایسے میں کہاں فکر کی فن کی باتیں
پوری دنیا وطن بنا ہے مرا — پھر بھی اپنا وطن نہیں بھولا
گلستاں مَیں نے کتنے دیکھے ہیں — پھر بھی اپنا چمن نہیں بھولا
ہم ہیں وہ لوگ کہ بے قوم و وطن کہلائے — ہم کو جینے کے لیے کوئی حوالہ دے دو

غرض ''پیرایۂ اظہار'' میں تلخ وشریں زندگی کے تجربات ومشاہدات نے مختلف اسالیب سخن میں ڈھل کر شعری معنویت کے کردار کو بہت بلند کر دیا ہے جس کا برملا ثبوت عقیل دانش کا درج ذیل شعر مہیا کرتا ہے۔

گلدستہ اُن کے ہاتھ سے میں لے تو لوں مگر — جو ہاتھ میں چھپا ہے وہ خنجر نظر میں ہے

(سالنامہ ۲۰۱۳ء)

شب تاب (شعری مجموعہ)

حسن عسکری کاظمی

حرفِ حق کہنا مرے گھر کی روایت ہی سہی　　　شعر کہنے کا قرینہ مجھے قاری نے دیا

حسن عسکری کاظمی کے مذکورہ شعر کی فکر افروز معنویت سے قطع نظر اُن کے شعری مجموعہ کے مطالعہ نے شاعر کے اوصافِ سخن کی اور بھی کئی دلپذیر جہتوں کو منکشف کیا ہے۔ ''قاری سے مکالمہ'' کے زیرِ عنوان تعارفی کلمات میں کاظمی صاحب نے اپنے تین پیش رو شعری مجموعوں ''دشتِ بے صدا''، ''خیمۂ خیال'' اور ''ریزۂ خواب'' نیز نظموں کو اپنے تخلیقی سفر کا تسلسل اور سر زمین تعبیر پر قدم رکھنے کے مترادف قرار دیا ہے مزید کہا ہے کہ غزل کے ساتھ تازہ مجموعہ میں آزاد نظمیں باطن کے خوبصورت موسموں کو متعارف کرانے کا وسیلہ قرار پائی ہیں۔ ''شب تاب'' میں شامل کم و بیش ایک درجن خوبصورت آہنگ و اُسلوب سے مزین نظموں میں ایک نظم بعنوان ''حسن خیال'' بھی میری نظر سے گزری جس کی ابتدائی چند سطریں ہی قاری کو شاعر کی باطنی کیفیات سے متعارف کراتی ہیں اور شاعر کے خیال کی تصدیق بھی کرتی ہیں ملاحظہ ہو:

میں کہیں اور بھی ہوں
کرۂ ارض پہ ہونا میرا
مرے ہونے کی دلیل
عکس جیسے نظر آئے کسی آئینے میں
میں کہیں اور بھی ہوں

تاہم شاعر کے فکر و فن کی بھرپور شناخت اُن کی غزل ہی سے ہوتی ہے جو اُسلوب کی تازہ کاری۔ لفظ و معنی کے دروبست۔ روایت و اختراع کے مظاہر کے ساتھ ساتھ تخیل و تصور کے جلال و جمال کی آئینہ دار ہے۔ یہی نہیں بلکہ افکار کے تنوع کو غزل کے آہنگ و اُسلوب

میں ڈھالنے کا تخلیقی عمل شاعر کی بصیرت و بالغ نظری کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ مثلاً

جب تک چلی ہوائے بہاراں چہار سُو — گلہائے رنگ رنگ تھے رقصاں چہار سُو
دوشِ ہوا پہ اپنا تصرف تھا خواب میں — لے کر اڑے تھے تختِ سلیماں چہار سُو

میں آئینے میں مقابل تو دیکھتا خود کو — کہ مجھ کو خود سے ہے ملنے کی آرزو کب سے
مرے دریچہ میں ٹھہرا ہوا ہے چاند حسن — وہی ہے منظر شب تاب ہو بہو کب سے

شادابیِ چمن پہ اگر اختیار ہو — ہاتھوں میں ہر شجر کے زمامِ بہار ہو
مقراض بھی ہے زرد ہواؤں کے ہاتھ میں — ایسا نہو کہ گُل کا بدن تار تار ہو

ہم شکستہ پر ہوا میں آشیاں رکھتے رہے — بھول تھی پانی پہ بنیاد مکاں رکھتے رہے
ایک تصویرِ وفا تھی یا تصور تھا ترا — یاد ہر لحظہ تجھے اے جانِ جاں رکھتے رہے

اک مرگِ باشرف کی تمنا میں ہم جیئے — تہمت کے جتنے داغ تھے دل پر وہ سب لیے
روشن رہے گی راہِ وفا جسقدر رہے — بجھنے نہ پائیں گے کبھی جلتے ہوئے دیئے

''مرگِ باشرف'' کی داد اہل ذوق ہی دے سکتے ہیں۔ چنانچہ زبان و بیاں کے ایسے محاسن ''شب تاب'' میں جا بجا ملیں گے جن کی کسی بھی فصیح الفکر شاعر سے توقع کی جاسکتی ہے۔ بحیثیت صنف سخن غزل کا فیضان بھی ہے اور غزل کہنے کے سلیقے کا ثبوت بھی۔ دیکھئے غزل کی شان میں شاعر کا خراج تحسین:

دل و نظر میں سمایا رہا جمال غزل — خیالِ یار کی صورت رہا خیال غزل
ہر ایک نکتے پہ دل جھوم جھوم اُٹھتا ہے — یہی ہے حاصل تخلیق اور مآل غزل
مشامِ جاں میں یہ جھونکا کہاں سے آیا ہے — کھلا کہ اور بھی صحرا میں ہیں غزالِ غزل

غزل اپنے مخصوص تلازمات، رمزیت و اشاریت نیز استعارہ و تشبیہ کے محاسن سے مالا مال ہے یہی اوصاف غزل میں غنائیت و جمالیات کے ضامن ہیں اور صاحب ''شب تاب'' ان کے استعمال پر قادر:

روشنی، سایہ، تکلم، خامشی، خوشبو، ہوا
ان گنت اُسلوب اک سروِ چراغاں میں رہے

چمن میں پھول کو دیکھا تو یوں لگا جیسے
گُلاب چہرہ کہ زیرِ نقاب تھا وہ بھی

چمن کا حسنِ پریشاں بہار میں ہے کہیں
کہ بوئے گل مرے قُربِ جوار میں ہے کہیں

بہ صبح و شام کے منظر لہو میں ڈوبے ہوئے
فغاں کا رنگ بھی لیل و نہار میں ہے کہیں

پیشِ نظر جمال بہاراں ہے ان دنوں
سب خار و خس چمن کے گُل تر لگے مجھے

ذرہ بھی کائنات ہے اپنے وجود میں
صحرا بھی معرفت کا کھلا در لگے مجھے

حسن عسکری کاظمی اپنی تمام فکری، فنی اور علمی صلاحیتوں کے ساتھ شعر کے پیکر میں عکس ریز نظر آتے ہیں لطیف پیرایۂ اظہار اُن کا اُسلوبِ خاص ہے۔ جہاں فارسی کے دبستان شاعری سے خوشہ چینی ان کے اشعار میں حرف وصوت کا حسن پیدا کرتی ہے وہیں اُن کے وسیع المطالعہ ہونے کا ثبوت کہیں کہیں انگریزی شاعری سے بھی کسب فیض کی صورت میں نظر آتا ہے۔ شیلے نے کہا تھا کہ:

"Our sweetest songs are those that tell us of the saddest thoughts"

کاظمی یہی بات کہتے ہیں لیکن اپنے دلکش و دلپذیر انداز میں

جو معجزے بھی فن کے جہاں میں قلم کے ہیں
دیکھا یہ سلسلے سبھی اظہارِ غم کے ہیں

اب ایک اہم بات یہ کہ ''حسیّت'' ''شب تاب'' کی شاعری کا نمایاں اختصاص ہے لیکن شاعر کی خارجی ''حِس'' کسی طرح بھی اُن کے جذبہ واحساس کی اثر پذیری سے کم نہیں جس کی نمایاں مثالیں ان کے کلام کی عصری معنویت میں نظر آتی ہیں گرد و پیش کے حالات کا عکس نہ صرف اشعار میں نمایاں ہے بلکہ اکثر و بیشتر تلخی و مزاحمت کی حدوں کو چھو رہا ہے۔ ابلاغ کے اس پُراثر اُسلوب نے نہ صرف کاظمی کی شاعری کو معاصر شعری رجحانات کا نمائندہ بنا دیا ہے بلکہ وقار و تمکنت سے اُس کا معیار بھی بلند تر کر دیا ہے۔ چند مثالیں:

حُرمت قلم کی جان سے بڑھ کر رہی عزیز
یہ کیا کہ حرفِ حق بھی زباں پر نہ لا سکے

جھکا نہ سر کبھی پیشِ یزید وقت حسن
سناں کی نوک پہ رکھا رہے گا سر اپنا

جب ہو ماحول فسردہ تو ہنسوں بھی کیسے
ہو چکے ہاتھ قلم اب میں لکھوں بھی کیسے

شہرِ بے درد میں جب خون کی ارزانی ہو
گھر سے نکلوں بھی تو کیا گھر میں رہوں بھی کیسے

ہر طرف آگ دھواں زخموں کے انبار حسن
ایسے حالات میں اشعار لکھوں بھی کیسے

ہوا ہے شورِ فغاں کُو بکُو فریب فریب
ہر ایک وعدہ ہر اک گفتگو فریب فریب

سیاہ رات کا جنگل اگر نہ ختم ہوا
طلوعِ صبح تری آرزو فریب فریب

اسی سبب سے میں تیشہ بدستِ نکلا ہوں
کہ عہد جبر کی دیوار میں ہو در اپنا

خیال و خواب کا اک کھیل ہے مری دنیا
یہاں کا عیش ہمیشہ نہ مال و زر اپنا

جسے پسند نہ آئے روش زمانے کی
نکل کے آئے ہتھیلی پہ رکھ کے سر اپنا

اور اب اسی غزل کے مقطع کے ساتھ صاحبِ ''شب تاب'' کو اُن کی گھر بار اور شرر بار شاعری پر ہدیۂ تحسین پیش کرتے ہوئے اجازت چاہتا ہوں۔

دیا ہے جذبۂ بے نام کو بھی نام حسن
جہانِ عشق میں کام آگیا ہنر اپنا

(سالنامہ ۲۰۱۳ء)

دشتِ شب (شعری مجموعہ)

امین راحت چغتائی

''دشتِ شب'' کے شاعر شعری مجموعوں کے علاوہ ایسی کتب کے بھی مصنف و مؤلف ہیں جو تنقید و تحقیق۔ فلسفہ و مذہب اور تاریخ و ثقافت کے وقیع و متنوع موضوعات پر گزشتہ ستائیس (۲۷) برسوں میں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کے تبحّر علمی اور کمال فن کے اعتراف میں اُن کی نعتیہ تصنیف ''محراب توحید'' پر سال ۲۰۰۷ء میں حکومت پاکستان کی جانب سے اول انعام پیش کیا جا چکا ہے۔ راقم الحروف کو بھی ماضی میں چغتائی صاحب کی بعض منظوم و منثور تخلیقات کا انتقادی جائزہ لینے کے مواقع میسر آئے ہیں چنانچہ اُن کے کثیر الجہت فکری پس منظر کے ساتھ زیر تبصرہ کتاب کے مطالعہ نے اُن کی علمی و فنی شخصیت کو قدیم و جدید غزل کی موضوعاتی وسعتوں سے مکمل طور پر ہم آہنگ دیکھنے کا ایک اور موقع فراہم کر دیا ہے۔

طہارتِ فکر مصنف کے اوصافِ فن کا وہ بنیادی اور نمایاں عنصر ہے جو اُن کی تمام تخلیقات بالخصوص شعری مجموعوں میں روح بن کر سرایت کر گیا ہے جسے ان کے شائستہ لب و لہجہ نے مزید جلا بخشی ہے۔ زیر تبصرہ تصنیف تمام تر غزلیات پر مشتمل ہے۔ بالعموم دیکھا گیا ہے کہ شعرائے کرام شعری مجموعوں کا آغاز تبرکاً حمدیہ اشعار سے کرتے ہیں لیکن جناب امین راحت نے ثابت کر دیا ہے کہ صنفِ غزل کا موضوعاتی تنوع اس قدر ہمہ گیر ہے کہ حمدیہ و نعتیہ مضامین بھی غزل کی پیکر تراشی میں جلال و جمال کے عناصرِ فاخرہ کا کردار ادا کر سکتے ہیں چنانچہ آغازِ کلام ایسے کسی روایتی اہتمام سے مشروط نہیں۔ بایں ہمہ 'دشتِ شب' کی پہلی ہی غزل کا مطلع اور چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

جو دشتِ شب سے گزرنے کا حوصلہ دے گا   چراغ راہگزر بھی وہی جلا دے گا

وہ دے کے ذوقِ سفر رہروانِ منزل کو　　قدم قدم پہ نئے گلستاں کھلا دے گا

وہ جس کے نام سے کرتا ہوں میں سفر آغاز　　وہی سفینہ مرا پار بھی لگا دے گا

میں کیوں کسی کے درِ ناز پر جھکوں راحت　　مجھے تو چاہیئے جو بھی مرا خدا دے گا

رمزیت واشاریت نہ صرف غزل کو معنوی وسعت عطا کرتے ہیں بلکہ حُسن ہیئت واسلوب میں شاعر کو ان اوصاف کے فنکارانہ استعمال پر کامل قدرت حاصل ہے۔ یہی نہیں بلکہ حمدیہ ودعائیہ اُسلوب برقرار رکھتے ہوئے غزل میں تعمق فکر سے کام لینے اور فلسفیانہ اندازِ نگارش کا وہ ہنر بھی جس میں شعری تازگی ولطافت بھی قائم رہے ہمارے متدیّن فکر شاعر کو خوب آتا ہے۔ مثلاً یہ شعر:

جو سیرِ گُل کو نکلتے ہیں صبحدم ان کو　　زمینِ گُل سے بھی تھوڑی سی آشنائی دے

'دشت شب' کے مطالعہ سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ اس مجموعہٗ شعری میں شعورِ ذات ایک واضح متحرک عنصر ہے جو کائنات اور خالقِ کائنات کی نسبت بین السطور فکری متوازیت کا ترجمان بھی ہے۔ لیکن یہ حقیقت کہیں بھی شعر کی تاثراتی لطافت کو مجروح نہیں ہونے دیتی جس کا مدلّل ثبوت درجِ ذیل اشعار سے ملتا ہے۔

ہو اگر یقیں کہ ملا کرے گا بس ایک نانِ جویں سہی
مجھے کاخ دار اسے کیا غرض مجھے بیٹھنے کو زمیں سہی
میں ثبوت جس کے ہنر کا ہوں وہ عیاں رہے یا نہاں رہے
مرا کام اُس کی تلاش ہے نہ ملے کہیں تو نہیں سہی
کہیں غیب سے بھی نوید ہو کہ ظہورِ نور قریب ہے
میں ہوں ظلمتوں میں گھرا ہوا مجھے روشنی کا یقیں سہی

وہ الفاظ جن میں معنویت کے بیکراں سمندر موجزن ہوں وہ جناب چغتائی کی قاموسِ فکر سے ماورا ہیں اور نہ فرہنگِ وجدان سے۔ وہ دقیق وعمیق فلسفیانہ مضامین کو کوزۂ لفظ میں بند کر

دینے پر قادر ہیں۔ ایسی ہی ایک مثال اُن کے فلسفۂ شعور ذات سے حاضر خدمت ہے اس گزارش کے ساتھ کہ درج ذیل شعر میں ''سربُریدہ لفظ و معنی'' اور ''بے صدا حرفِ دعا'' کی تراکیب لفظی شاعر کے ہم عصر عالمِ انسانیت سے شکوہ سنجی پر گہرے تدبّر و تفکر کی دعوت دیتی ہیں:

سربُریدہ لفظ و معنی، بے صدا حرفِ دعا آدمی سے منہ چھپاتی پھر رہی ہے آگہی

اس سیاق و سباق میں شاعر کے ''ذوق خود احتسابی'' کا عالم بھی دیکھیئے جس کی ترجمانی کے لیے ''سیرِ گریباں'' کی غزل افروز ترکیب لفظی کو استعمال کیا گیا ہے اور ''زمین بے طرب'' کو ''عرش ساماں'' کرنے کی آرزو بھی جو انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی جانب ایک بلیغ اشارہ ہے

زمین بے طرب کو عرش ساماں کر رہا ہوں میں ذرا ٹھہرو ابھی سیر گریباں کر رہا ہوں میں

اب ذرا یہ بھی دیکھیئے کہ حکیم الامتؒ کے اتباع میں شاعر ''دشتِ شب'' بھی اپنی ''تاب سخن'' کو بھرپور عصری معنویت کے ساتھ استعمال کرتے ہوئے گویا کہہ رہے ہیں کہ:

''شکوہ اللہ سے خاکم بدہن سے مجھ کو'' لیکن اپنے مخصوص لب و لہجہ میں:

بیوفا ہم تو وفادار ہے کون آنکھ اُٹھا، دیکھ سردار ہے کون

اور پھر اپنے خالق کے سامنے سپر انداز ہو جاتے ہیں

لوٹا رہے ہیں تیری امانت سمجھ کے ہم اب بارِ زندگی بھی اُٹھایا نہ جائے گا

راحت ہر ایک راز اگلنے کو ہے زمیں اب رازِ کائنات چھپایا نہ جائے گا

چغتائی صاحب کی غزل میں جہاں فلسفہ و حکمت حریر و پرنیاں میں ملبوس ہو کر شاعر کی لطافت فکر کا عنوان بن گئے ہیں وہیں قدیم و جدید روایاتِ غزل کا جمال آفریں امتزاج بھی اُن کی غزل کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ لفظیات تراشی کی قلمرو کے حکمران ہیں جو اُن کی السنۂ شرقیہ پر عبور کی رہین منت ہے آیئے ایسے اشعار کی بھی نظر افروز جھلک دیکھتے ہیں:

دن کے ڈھلتے یہ اہتمام ہوئے میرے آنسو چراغِ شام ہوئے
بدلتی رُت کا بھی چپکے سے اک اشارہ کیا وہ جس نے شعر میں زنداں کو استعارہ کیا
ہمیں خبر تھی اندھیرا ابھی رہگزر میں ہے سرشکِ غم کو یہی جان کر ستارہ کہا

''دشتِ شب'' میں اگر کہیں یاسیت کا شائبہ دکھائی بھی دیتا ہے تو وہ شاعری کی پُر اعتماد اور ایمان پرور رجائیت کی ضیابار فضا میں ظلمت کی پر چھائیوں کی طرح تحلیل ہو کر رہ جاتی ہے۔

حجابِ ظلمتِ شب اُٹھ رہا ہے نظر آنے کو ہے صورت سحر کی

کلاسیکی اور جدید فکر جب شانہ بہ شانہ ہو کر شعری پیکر تراشتی ہے تو چغتائی صاحب کی شاعری میں ایک احتجاجی رو آتی ہے مگر تہذیب و شائستگی کے ساتھ۔ وہ موثر انداز میں گردو پیش کے ماحول پر اپنے ردِعمل کا اظہار کرتے ہیں اور استقامتِ کردار کی بات بھی کرتے ہیں۔ مگر اکثر ہم عصروں کے غرور و تکبر کے جارحانہ انداز میں نہیں بلکہ عجز و انکسار کے لطیف و دلکش پیرایۂ اظہار میں:

میں اک تصویرِ عہدِ بے اماں ہوں میں اپنے گھر میں ہوں لیکن کہاں ہوں
تری خلقت پہ جو بیتی ہے مولا میں اُس کی چیخ ہوں اُس کی فغاں ہوں

اسی تسلسل میں فکری تنوعات کے تیور بھی ملاحظہ فرمائیے:

بیٹھے ہیں زیرِ آسماں تن پہ کوئی ردا نہیں کیسے بتائیں کیا ہیں ہم کیسے بتائیں کیا نہیں
ایک گدائے بےنوا جانے کہاں سے آ گیا لب پہ کوئی طلب نہیں کوچے سے بھی گیا نہیں
روٹھے ہوئے حروف اِدھر لفظ گریز پا اُدھر اب کے عجب سزا ملی یاد کوئی دعا نہیں
راحت اُسی کے بیکراں لطف و کرم کا معجزہ اُس کا دیا ہوا یہ سر اور کہیں جھکا نہیں

چغتائی صاحب کی کثیر الجہت شاعری میں سب سے زیادہ عصری معنویت اپنی گہری چھاپ رکھتی ہے جس کے سبب اُن کا کلام عہدِ حاضر کے اردو شعری ادب میں ایک متاعِ گراں مایہ بن گیا ہے، اُن کے شعر میں حُبِ وطن کی تڑپ نمایاں ہے۔ انسانی دردمندی اور خدا ترسی جو اُن کے کردار کی اساس ہیں لعل و جواہر کی طرح اُن کی غزل کی تابناکی میں اضافہ کرتے چلے جا رہے ہیں۔

اے وطن اپنا تو بس اتنا ہے معیارِ وفا
دوستی تیرے لیے ہے دشمنی تیرے لیے

آ بھی جا اب اے سحرائے تیرہ بختوں کی نوید
منتظر ہے کب سے آنکھوں کی نمی تیرے لیے

ہجوم یوں تو بہت تھا مگر ہمیں آئے
ہوا کے سامنے اپنا دیا جلانے کو

کسی طرف سے تو اب خیر کی خبر آئے
زمانہ کب سے ترستا ہے مسکرانے کو

ظلمتِ شب کی طوالت بھی رہے پیش نظر
اب چراغوں میں بھی اتنی روشنی باقی نہیں

بستیوں میں جا کے دیکھو تو سہی راحت کبھی
لوگ تو زندہ ہیں ان میں زندگی باقی نہیں

(جولائی۔ستمبر ۲۰۱۳ء)

آئینۂ امروز و فردا (شعری مجموعہ)

فضا اعظمی

زیر نظر شعری مجموعہ نصف درجن مشاہیر ادب کے کلماتِ تحسین سے مزیّن ہے جن کے اسمائے گرامی اور ارشادات کی تلخیص ذیل میں درج ہے۔

۱۔ **پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتحپوری**

''فضا اعظمی طبعاً نظم کے نہیں غزل کے شاعر ہیں''

۲۔ **پروفیسر سحر انصاری**

''فضا اعظمی کسی ایک رخ یا نظریے کے شاعر نہیں ہیں۔ رومان سماجی حقائق۔ سیاست اور مقامی و عالمی تہذیب کے مختلف زاویے ان کے دائرہ فکر کا حصہ ہیں۔''

۳ **ڈاکٹر پیرزادہ قاسم**

''وہ ایک سنگم پر کھڑے ہیں ایک جاتی ہوئی تہذیب کا ایک بجھتے ہوئے چراغوں کا''

۴۔ **سید مظہر جمیل۔**

''فضا اعظمی اپنے رنگِ سخن، طرز ادا اور فکری مزاج کی وجہ سے عصری شعری منظر نامے میں اپنی ایک جدا شناخت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری عصر حاضر کے تہذیبی و انسانی مسائل سے براہِ راست تعلق رکھتی ہے۔''

۵۔ **عطاء الحق قاسمی**

''میں فضا اعظمی کی شاعری کا بڑا قائل ہوں خاص طور سے اُن کی یک موضوعی طویل نظموں کی بڑی قدر کرتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی نظموں میں مجھے ایک دردمند پاکستانی اور زندہ ضمیر انسان کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔''

۶۔ مبین مرزا (تقریظ نگار)

''ان کی شاعری اپنے موضوع اور فکر دونوں ہی اعتبار سے مقصدی شاعری کے ذیل میں آتی ہے۔۔۔یعنی غزل اور نظم دونوں اصناف میں ان کا تخلیقی جوہر الگ الگ رخ سے ظہور کرتا ہے''

بیشک فضا اعظمی صاحب غزل اور نظم دونوں ہی کے شاعر ہیں چنانچہ اُن کے فکر وفن کی ان تمام جہتوں کی جن کی اوپر نشاں دہی کی گئی ہے '' آئینۂ امروز وفردا'' کے مطالعہ سے تصدیق ہوتی ہے میرے نزدیک اُن کا یک اعزاز یہ بھی ہے کہ انھیں دنیائے شعر کے نابغۂ اعظم مرزا بیدل کا ہم وطن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اُن کی نظم وغزل کی شاعری کے مطالعہ کے دوران ایسے مقامات بھی آئے جہاں شعر کو مکرّر پڑھے بغیر آگے بڑھنا ممکن نہ تھا۔ مثلاً زیرِ نظر مجموعہ کا پہلا شعر:

جی چاہتا ہے کوئی نیا خواب دیکھیے   صحرائے بے گیاہ میں سُرخاب دیکھیے
آپ کا اعتنا الاِرم الاِرم   آپ کی بے رخی الحذر الحذر

یہ تاثر کہ فضا بیک وقت غزل کے شاعر بھی ہیں اور نظم کے بھی۔ درج ذیل اشعار اس کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ آپ چاہیں تو انھیں نظم سے تعبیر کریں یا غزل مسلسل ٹھہرائیں ان پر دونوں کا اطلاق ہوتا ہے یعنی '' فضا صاحب کا اندازِ رقم یوں بھی ہے اور یوں بھی'' ملاحظہ ہو

تم ہو بہاروں کی شہزادی تم پہ نچھاور پھول کی وادی
ذات میں خود جو اوجِ فلک ہو اُس کو ثریا سے کیا لینا
تم ہو شبنم تم ہو قلزم تم ہو بادل تم ہو ساگر
تم ساون کا پہلا قطرہ تم کو دریا سے کیا لینا
سرمستی کا سرچشمہ ہو ، خود پیمانہ خود میخانہ
تم کو ساقی سے کیا مطلب تم کو صہبا سے کیا لینا

آج بھی تم ہو کل بھی تم تھیں تم ہو کتاب عشق کا مضموں
روحِ غزل ہو جانِ فضا ہو تم کو دنیا سے کیا لینا

آیئے اب نظم وغزل کے مزاج وآہنگ کے امتزاج کا جمال بھی دیکھتے ہیں اور جلال بھی:

اک نوکِ قلم اک خونِ جگر تحریر کے دو رُخ ہوتے ہیں
اک ظلمت شب اک نورِ سحر تصویر کے دو رُخ ہوتے ہیں
مشترکہ تمدن کی جنت ، تہذیبی تصادم کا دو رُخ
خوں ریز زمین گلرنگ فضا کشمیر کے دو رُخ ہوتے ہیں

خوبصورت غزل کہنے کا سلیقہ دیکھنا ہو تو یہ اشعار دیکھیئے جو کلاسیکی روایت کے غماز بھی ہیں اور تخلیقی روح عصر کے بھی۔

مری صبح شوق گزر گئی کسی شعلہ رُو کی جناب میں — مری شام درد بسر ہوئی کسی آرزو کے سراب میں
مجھے سیرِ گل سے ملے گا کیا نہ دماغ ہے مزاج ہے — میں اسیر گردشِ وقت ہوں مری زندگی ہے عذاب میں
تجھے جس پہ ناز ہے اے فضا تجھے جس پہ اتنا غرور ہے — تو تمام درد بھی ڈال دے اُسی آگہی کے حساب میں

آپ دوسرا شعر مکرّر پڑھیئے تو آپ کو مجھ سے متفق ہونا پڑے گا کہ فضا کے یہاں کلاسیکی روایت اور تخلیق روح عصر شانہ بہ شانہ نظر آتے ہیں جس کا ثبوت غالب کے درج ذیل شعر سے مل جائے گا۔

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو — مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

عصری شعور فضا کی شاعری کی توانا ترین خصوصیت ہے جس کا اظہار مختلف اسالیب اور دلپذیر لہجوں میں ملتا ہے وہ چاہے نظم ہو کہ غزل البتہ موضوعی نظم زیادہ پُر اثر ذریعۂ اظہار ہے۔
غزل کے چند اشعار

یہ طرزِ تکلم تری عادت تو نہیں تھی — اس میں کہیں غیروں کی شرارت تو نہیں تھی

منصف کو نتائج سے خبردار کیا تھا
اس میں کہیں توہین عدالت تو نہیں تھی
قدموں سے الجھتے ہیں گھروں کے درودیوار
صحرا میں کوئی ایسی قباحت تو نہیں تھی
اپنی قیمت آپ پر خود ہی عیاں ہو جائیگی
آپ یوں ہی گھومتے رہیئے خریداروں کے بیچ
رقص کرتا ہے کہیں ساز ازل کی تان پر
عشق سادہ پھول بن جاتا ہے انگاروں کے بیچ
حسرتِ وصل کجا ذوق تماشا بھی نہیں
دین تو دین ہے اب خواہش دنیا بھی نہیں
روحِ احساسِ گریزاں کی خبر ہے کس کو
زلفِ ماضی بھی نہیں عارضِ فردا بھی نہیں

جناب عطاء الحق قاسمی جو پاکستان کے معروف صحافت کار اور مقبول کالم نگار ہیں انھوں نے ''آئینہ امروز وفردا'' کے شاعر کو ''دلی مبارکباد'' پیش کی ہے مگر نہ معلوم مجھے یہ گمان کیوں ہے کہ فضا صاحب کے درجہ ذیل اشعار اُن کی نظر سے نہیں گزرے۔

اصل کچھ ہے واہمہ کچھ اور ہے
ہے خبر کچھ واقعہ کچھ اور ہے
یا الٰہی نامہ بر کو کیا ہوا
پڑھ رہا ہے کچھ لکھا کچھ اور ہے
وائے مجبوری صحافت کار کی
لکھ رہا ہے کچھ سنا کچھ اور ہے

زیر تبصرہ شعری مجموعہ میں ۲۳ غزلیں ۶۳ نظمیں۔ ۶ قطعات اور ۲۱ متفرق اشعار شامل ہیں غزلوں پر اس طائرانہ پرواز خیال کے بعد کچھ نظموں پر توجہ دینا بھی ضروری ہے۔ نظم بعنوان ''یہ واقعہ کچھ نیا نہیں ہے'' شاعر کے تاریخی شعور کا شاہکار ہے۔ عراق پر امریکہ کے حملہ سے متاثر ہو کر کہی گئی یہ نظم تو تصنیف ادب میں ارفع مقام رکھتی ہے۔ بیشتر نظمیں اپنے اُسلوب و آہنگ کے اعتبار سے قاری کا دل موہ لیتی ہیں۔ اعظم گڑھ میں اپنی آبائی قیام گاہ سے شاعر کے بے دخلی کے کرب کا اندازہ ''یاد ماضی'' کے عنوان سے درج ذیل قطعہ سے کیا جا سکتا ہے۔

ٹوٹا ہوا دل، زخم جگر بیچ رہے ہیں
ورثے میں جو پایا تھا وہ گھر بیچ رہے ہیں
تم آکے ذرا آخری دیدار تو کر لو
ہم شیش محل، چاند نگر بیچ رہے ہیں

میں عادتاً اظہار خیال سے پہلے کسی بھی تصنیف یا تالیف کا مجملاً نہیں بلکہ اکملاً مطالعہ

ضروری سمجھتا ہوں چنانچہ اس عمل سے گزرنے کے بعد محاسن کلام کے ساتھ معائب سخن یا کچھ واضح تسامحات بھی نظر سے گزرے جن کا ذکر نہ کرنا انتقادی معروضیت یا دانشورانہ دیانت کے منافی ہوگا۔ میں نے زیر تبصرہ شعری مجموعہ کے مطالعہ کے دوران محسوس کیا کہ صرف ونحو سے عدم آگہی یا ردیف وقوافی کے فنی تقاضوں سے بے خبری اور اوزان شعری میں خلل ڈالنے والے عوامل سے بے توجہی برتنا فضا اعظمی جیسے شاعر کی نسبت میرے تصور سے بھی ماورا تھا مگر افسوس کہ یہ سب کچھ دیکھنا پڑا۔ البتہ ان کی طرف توجہ دلانے میں اخلاصِ نیت صرف یہ چاہتا ہے کہ اس مجموعہ کی اشاعت مزید سے قبل شاعر نظر ثانی فرمالیں جو نہایت ضروری ہے۔ مثلاً

۱۔ مجموعہ کی پہلی ہی غزل جس کی ردیف 'دیکھیئے' اور قوافی ''خواب اور سُرخاب'' وغیرہ ہیں اُس کے تیسرے شعر کا مصرعہ اوّل ہے ''تصویر شب میں صورتِ خورشید دیکھیئے'' اگر یہ غزل کا تیسرا مطلع ہے تو قافیہ غلط ہے۔ اگر نہیں تو مصرعہ اول میں بغیر قافیہ ردیف کا استعمال غلط ہے بلکہ اساتذہ تو جزو ردیف کے استعمال کو بھی معیوب سمجھتے رہے ہیں۔

۲۔ صفحہ نمبر ۴۴ پر تیسرے شعر کا مصرعۂ ثانی ہے ''تو پھر کیوں 'قضیۂ' من اور تُو' ہے قضیۂ من اور تو'' فارسی ترکیب ہے جس میں غیر فارسی حرفِ عطف ''اور'' کا استعمال غلط ہے۔

۳۔ صفحہ ۵۶ پر غزل کے تیسرے شعر میں وہی فنی نقص ہے جس کی طرف نمبر ا میں اشارہ کیا گیا ہے انیس (۱۹) اشعار پر مشتمل اس غزل کے پانچ شعروں میں یہی نقص موجود ہے۔

۴۔ صفحہ ۶۶ پر ''صبح سے پہلے شام کے بعد'' ردیف والی غزل میں قوافی کا اہتمام سرے سے نظر ہی نہیں آتا۔

۵۔ صفحہ ۶۸ پر غزل کے مطلع ہی میں قوافی کا سقم ہے یعنی 'قطرے اور الحاں' اور آخری شعر کا تو قافیہ بھی مختلف ہے اور ردیف بھی۔

۶۔ صفحہ ۸۴ پر نظم 'دل یہ کہتا ہے' کا پانچواں شعر ہے 'دل یہ کہتا ہے کہ اے کاش میں دریا ہوتا۔ پاپ کو دھونے کا اور پاکی کا 'ذریعہ' ہوتا۔ مصرعہ ثانی میں قافیہ 'ذریعہ' نہیں بلکہ 'ذریا' پڑھا جاتا ہے۔ یہ سنگین نقص ہے اسی غزل کے ۱۵ ویں شعر کا قافیہ ''گارا'' شاعر کے معیار فن میں لسانی غرابت کا مظہر ہے جب کہ آخری شعر میں ''بنایا'' اور 'انسان' کو ہم قافیہ گردانا گیا ہے۔

۷۔ صفحہ نمبر ۹۱ پر نظم بعنوان 'پندارِ برتری' میں جو الفاظ برحق/ صادق 'میرا ادب/ زانوئے ادب۔ قوم/ رسُوم کو ہم قافیہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے جو فنی بے خبری کا مظہر ہے۔

۹۔ صفحہ نمبر ۹۷ پر دوسرے شعر کا مصرعہ اول ''حرفت و سائنس کی معراج ہے مغرب کا مقام'' خارج از بحر ہے۔

۱۰۔ صفحہ نمبر ۹۹ بعنوان ''شاعری'' میں پرواز خیال/ معراج خیال کو ہم قافیہ نظم کیا گیا ہے۔ جو غلط ہے

۱۱۔ صفحہ ۱۴۲ پر نظم ''سرشار غزل'' تیسرے شعر کے مصرعۂ ثانی میں ''صرف نظر'' کا استعمال غلط ہے۔

۱۲۔ ''متفرقات'' کے زیر عنوان، شعر ''اس کا گیتا سے تعلق ہے نہ انجیل سے ہے۔ 'معاملہ' اس کا فقط حضرتِ قابیل سے ہے'' مصرعہ ثانی میں لفظ 'معاملہ' 'مالمہ' پڑھا جاتا ہے جو شاعر کے شایانِ شان نہیں۔

(جولائی۔ ستمبر ۲۰۱۳ء)

فکرِ فیض

ڈاکٹر نثار ترابی

ڈاکٹر نثار ترابی تحسین و تہنیت کے مستحق ہیں کہ انھوں نے دنیا بھر میں 'فیض صدی' کی تقریباتِ جشن کے موقع پر اہل علم و ادب مبصرین و نقاد حضرات اور مورخین و مداحین فیض کو ''فکر فیض'' کے عنوان سے ایک ایسا جمیل و جلیل ارمغان پیش کیا ہے کہ جو نہ صرف فیض مرحوم سے ان کی عقیدت و ارادت کا مظہر ہے بلکہ ایک ایسا منفرد و نادر صحیفہ بھی ہے جو اپنے دامن میں مشاہیرِ ادب کی ایک بڑی تعداد کے معتبر و مستند تجزیاتی و تنقیدی مضامین اور نظریاتی و ارادت مندانہ تحریروں پر مشتمل ہے۔ یہ ایک بڑا اور اہم کام تھا جو انھوں نے انجام دیا وہ فیض مرحوم کے ایک شعر سے ماخوذ خود نگاشتہ تقریظ بعنوان ''ذکرِ یار چلے'' میں رقمطراز ہیں۔

(الف) ''عالمی سطح پر فیض (۱۹۸۴ء تا ۱۹۱۱ء) کے حوالے سے دنیا بھر میں صدی تقریبات کا انقعاد اور اشاعتی کتب کے وسیلے سے فیض صاحب کو خراج عقیدت پیش کرنے اور اُنھیں یاد کرنے کے سلسلے میں تاریخ ادب میں یقیناً یادگار رہیں گے۔''

(ب) ''۔۔۔اقبال کے بعد فیض ہی دورِ جدید کے دوسرے بڑے شاعر ہیں۔ انھوں نے نظم اور غزل کو ایک نیا اُسلوب اور ڈھنگ دیا۔ غزل کے لیے نئی روایت قائم کی۔ انھوں نے اپنی شاعری کو بیسویں صدی کے نصف آخر تک انسانوں کے جذبوں کا ترجمان بنایا اور تیسری دنیا کے پس ماندہ لوگوں کے احساسات اور دکھوں کو اپنی شاعری میں سمویا ہے۔''

(ج) ''حب الوطنی کے گیت گائے ہیں اور غزل کے کلاسیکی لب و لہجہ کو نئی آب و تاب بخشی ہے۔''

فاضل مرتب ومدوّن نے جن مشاہیر ادب کی نگارشات سے کتاب کو تاریخی اہمیت دی ہے اُن میں جناب افتخار عارف کو فیض مرحوم سے قرابت اور ایک طویل رفاقت کا شرف حاصل رہا ہے لہٰذا آئیے دیکھتے ہیں کہ افتخار عارف صاحب کے مشاہدت و تجربات کیا ہیں:

''فیض عالم انسانیت کے شاعر تھے۔ ان کی شاعری دوامی، آفاقی، انسانی قدروں کی ترجمان تھی مگر ظاہر ہے کہ کوئی بھی تخلیق کار مقامی ہوئے بغیر آفاقی نہیں ہوسکتا۔ وہ اپنی زمین سے اور اپنے لوگوں سے جُڑے ہوئے تھے۔''

افتخار عارف صاحب نے، منجملہ دیگر، فیض صاحب کی اُس تقریر سے بھی اقتباس پیش کیا ہے جو فیض مرحوم نے ماسکو میں بین الاقوامی لینن امن انعام کی پرشکوہ تقریب کے موقع پر اردو زبان میں کی۔ ملاحظہ فرمایئے۔

''مجھے یقین ہے کہ انسانیت جس نے اپنے دشمنوں سے آج تک کبھی ہار نہیں کھائی اب بھی فتح یاب ہو کر رہے گی اور آخر کار جنگ و نفرت اور ظلم و کدورت کے بجائے ہماری باہمی زندگی کی بِنا وہی ٹھہرے گی جس کی تلقین اب سے بہت پہلے فارسی شاعر حافظؔ نے کی تھی:

''خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی　　　مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است''

''فکر فیض'' میں جو دیگر اہل قلم کی تحریریں شامل ہیں اُن سے مزید دو ایک اقتباسات ضروری ہیں تاکہ فاضل مرتب کے پُر معنی انتخاب کی تفہیم ہوسکے۔ معروف شاعر اور نقاد جناب سحر انصاری فرماتے ہیں:

''نقش فریادی'' کی ترکیب اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ فیض کو غالب سے کس قدر گہرا ربط ہے۔ غالب کے دیوان کے پہلے شعر کے پہلے دو لفظوں کو گویا فیض نے اپنے عہد کے انسان کی سماجی اور داخلی کشمکش اور جبر کا استعارہ بنا دیا ہے۔''

مسلم شمیم صاحب ترقی پسند تحریک کے معتبر محقق و مورخ ہیں ان کی رائے سے ایک حوالہ:

''فیض احمد فیض ترقی پسند فکر اور ترقی پسند ادبی جمالیات کے سب سے بڑے ترجمان اور

ترقی پسند نظریات و روایات کے آغاز سفر سے تادم حیات معتبر ترین حوالہ رہے''

درج بالا مشاہیر کی آراء اور دیگر پُر مغز مقالات و مضامین کی تدوین و ترتیب کہ اعلیٰ ادبی خدمت ہے جس پر میں ترابی صاحب کو مکرّر ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں اور سہ ماہی 'الاقرباء' کے شمارہ جنوری۔ مارچ ۲۰۱۰ء کے اداریہ بعنوان ''فیض میزان عصر میں'' کے حوالے سے یہ اعادہ بھی کرنا چاہتا ہوں کہ میری نظر میں فیض مرحوم کے فکر و فن پر جن نابغۂ روزگار شخصیات کے اثرات مرتب ہوئے ہیں ان میں حافظ و غالب کے علاوہ حضرت علامہ اقبال نمایاں ترین ہیں بلکہ اہل نقد و نظر نے انھیں بجا طور پر غالب و اقبال کی شعری روایت کا تسلسل ہی نہیں امین بھی قرار دیا ہے۔ ان کی مشہور نظم ''ہم بھی دیکھیں گے'' اُن کی بلاغت فکر کا شاہکار ہے۔ قرآن حکیم کی ''سورۃ القاعدہ'' کی حکیمانہ شعری تفسیر فیض کی دینی بصیرت کی بھی غماز ہے ان کی زندگی میں کہیں بھی اخلاقی اقدار اور دینی صداقتوں سے انحراف کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ بے شک فیض مارکسی فلسفے سے متاثر تھے لیکن کارل مارکس کو تو علامہ اقبال نے بھی یہ کہہ کر زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے کہ ''نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب'' اور اس طرح جہاں اسلامی نظام حیات سے غیر متصادم معاشی و معاشرتی فلسفوں اور نظریات کی افادیت کو تسلیم کیا ہے وہیں پیغمبرانہ بعثت کی استنادی حیثیت کی طرف بھی بلیغ اشارہ کر دیا ہے۔

(جولائی۔ ستمبر ۲۰۱۳ء)

غالب کے غیر مدون فارسی مکتوبات

پرتو روہیلہ

پرتو روہیلہ کہ بحیثیت ایک بلیغ الفکر شاعر کسی تعارف کے محتاج نہیں پہلے ہی ایک درجن سے متجاوز شعری مجموعوں اور متعلقہ ادبی تخلیقات کی اشاعت کا افتخار حاصل کر چکے ہیں جن میں آٹھ دواوین شاعری ہیں اور دیگر میں دوہے اور پشتو ٹپے (اردو ترجمہ) جو ایک زمانے میں اُن کی شاخت سمجھے جاتے تھے۔ نیز اُن کی شخصیت اور شاعری پر مشاہیر ادب کے نقد نظر پر مشتمل مضامین، ایک سفر نامہ اور فارسی شاعری کے موضوع پر ایک اہم تالیف ''کلیاتِ عطا'' شامل ہے تاہم گذشتہ پندرہ برسوں میں ایک وقیع المثال کارنامہ جو مشیت ایزدی نے اُن کے ہاتھوں انجام دلایا ہے وہ اتنا افضل واکمل ہے کہ ہمارے یقین کے مطابق اُن کی شہرتِ دوام کا ضامن بن سکتا ہے۔

انھوں نے غالب کے فارسی اور اردو خطوط ونثر پر گذشتہ صدی کی آخری دہائی میں کام کا آغاز کیا اور ''نامہ ہائے فارسی غالب'' کے عنوان سے حضرتِ پرتو کے اردو تراجم پر مشتمل اُن کی پہلی کتاب ۱۹۹۹ء میں منظرِ عام پر آئی جو علمی وادبی حلقوں میں مقبولیت کی سند قرار پائی بعد ازاں یکے بعد دیگرے ۲۰۱۲ء تک ''مآثر غالب'' باغِ دودر'' ۔''متفرقاتِ غالب'' ''آہنگ پنجم'' ''کلیاتِ مکتوبات فارسی غالب'' ۔غالب کے منتخب فارسی مکتوبات'' اور'' غالب اور غمگین کے فارسی مکتوبات'' کے علاوہ غالب کے مشکل اردو اشعار کی شرح ''مشکلات غالب'' اور'' بارے غالب کا کچھ بیان ہو جائے'' اپنا اپنا نقشِ دوام ثبت کر چکی ہیں اور اب جسے ''حرف آخر'' کہیئے وہ زیر نظر'' غالب کے غیر مدون فارسی مکتوبات'' ہیں۔ان ذخیرۂ ہائے علمی کی طباعت واشاعت کا اہتمام جن اداروں کی جانب سے کیا گیا اُن میں ادارۂ یادگار غالب کراچی۔ بزمِ علم وفن اسلام آباد، نیشنل بک فانڈیشن اسلام آباد۔ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی (انڈیا) اور مقتدرہ قومی زبان پاکستان شریک ہیں۔

برصغیر پاک وہند کے معروف اہلِ علم ودانش حضرات نے ان جواہر پاروں پر تقاریظ تحریر فرمائیں جن کے سبب یہ کتب بہ اعتبار استناد مسلم الثبوت قرار پائیں حضرتِ پرتو کی تازہ ترین کاوش پر محترم ڈاکٹر جمیل جالبی کا تبصرہ اپنی جامعیت اور معنویت کے اعتبار سے منفرد حیثیت کا حامل ہے:

''فارسی مکاتیب کے اس دل کش وسحر انگیز اردو ترجمے نے ادب عالیہ کا وہ بند دروازہ کھول دیا ہے جو اردو والوں پر بالخصوص مقفل پڑا تھا اور اس کام کی بدولت غالب کے ساتھ پرتو روہیلہ بھی ہمیشہ زندہ رہنے والوں کی صف میں داخل ہو گئے ہیں''

زیر تبصرہ تالیف کے مطالعہ نے راقم الحروف پر بھی مزید کچھ جہتوں کا انکشاف کیا ہے جس کے نتیجہ میں پرتو روہیلہ کی اردو اور فارسی زبانوں پر تہذیبی وعمرانی گرفت کا قائل ہونا پڑا ہے کیونکہ ترجمہ کا کام اسی لیے جوئے شیر لانے کے مترادف ٹھہرایا جاتا ہے کہ جب تک مترجم کو متعلقہ دونوں زبانوں پر نہ صرف بہ اعتبار لفظ ومعنی بلکہ دونوں زبانوں کے ثقافتی مزاج وآہنگ پر عبور حاصل نہ ہو ترجمہ کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ پرتو صاحب کی اس سے قبل اسی سلسلہ کی ایک کاوش پر مَیں غالباً اس کلیہ کی تصدیق میں جوش مرحوم کی ایک رباعی کا حوالہ دے چکا ہوں۔ اعادہ کے لیے معذرت:

لیلائے سخن کو آنکھ بھر کر دیکھو　　قاموس و لغات سے گزر کر دیکھو
الفاظ کے سر پر نہیں اُڑتے معنیٰ　　الفاظ کے سینوں میں اتر کر دیکھ

اس اعتبار سے دیگر کتب ہائے ماسبق کی طرح زیر نظر کتاب میں بھی یہ اہتمام نہایت خوش آئند ہے کہ اصل فارسی متن کو بھی شریک اشاعت کیا گیا ہے نیز اردو قارئین کے لیے رواں، سلیس اور مزاجاً فارسی زبان سے ہم آہنگ شستہ وشگفتہ لہجہ اختیار کیا گیا ہے جو اس عہد ناشناس میں بہت ہی کم لوگوں کا علمی ولسانی اختصاص ہو سکتا ہے۔ جس میں فاضل مترجم نمایاں نظر آتے ہیں۔ قیاس چاہتا ہے کہ غالب جیسے گنجفہ باز لفظ ومعنی کی روح آسودہ ہوئی ہوگی:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

مثلاً ملاحظہ ہو غمگین کے نام اولین خط کا جملۂ آغاز:

''قبلۂ حاجات، پہلے تو سید امانت علی کے، خدا ان کو سلامت رکھے، دیدار ہی نے اوّل دل کو شادمانی سے مالامال کر دیا اور دوسرے نظر کو بھی روشنی عطا کی''

انہی مکتوب الیہ سے دوسرے خط کے آغاز میں ''غالب خستہ'' اس طرح مخاطب ہوتے ہیں:

''ستائیسویں محرم جمعہ کے دن شام کے وقت اپنے غم خانے میں اکیلا بیٹھا تھا اور میرے علاوہ اس محفل میں کوئی دوسرا موجود نہ تھا کہ یکا یک معرفت کی بجلی چمکی اور جمعہ نامی قاصد دروازے سے داخل ہوا اور ایک مکتوب کہ جس کو صحیفۂ (مرقعۂ) وحدت کہنا بجا ہوگا میرے حوالے کیا''

قابل توجہ امر یہ ہے کہ غالب نے اپنے جن ممدوحین یا مکاتیب الیہ کی نسبت جو آداب والقاب استعمال کیے ہیں ان کے معنوی پس منظر میں باہمی مراسم کی مودت یا ارادت کا عکس جھلکتا ہے جسے فاضل مترجم نے کمال مہارت کے ساتھ اردو کے قالب میں بجنسہٖ منتقل کر دیا ہے۔ ذیل میں مختلف شخصیات کی نسبت اندازِ تخاطب ملاحظہ ہو!

(۱) مکتوب بنام غلام مصطفیٰ خاں شیفتہ

''خداوند نعمت کے قربان جاؤں، جاں پروری کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ عطیہ لانے والے نے پوچھنے پر کچھ اور بھی دیا یعنی آپ کی صحت اور مزاج مبارک کی عافیت کا مژدہ سنایا۔۔۔''

(۲) مکتوب بنام ہرگوپال تفتہ

''مہربانا، رافت نشانا، متاعِ کارخانۂ خیال کی فہرست یعنی اُس عدیم المثال (تفتہ) کا کلیات پہنچا اور اس کے پہنچنے سے روح کو طمانیت ہوئی۔ بہت دنوں سے تمہارا منتظر تھا لیکن چونکہ تمہارے مسکن و مقام کا پتہ معلوم نہ تھا، خط نہ لکھ سکا۔۔۔''

یہ تھا اپنے ارادت مندوں سے مخاطب ہونے کا اُسلوبِ غالب! اب دیکھئے کہ اپنے معاصر

اور صاحب اقتدار و دول سے مرزا کا طرزِ نگارش کیا ہے۔

(۱) مکتوب بنام سر سید احمد خان:

''سید عالی جناب، خدا آپ کو سلامت رکھے جناب کے فرمانِ الفت آثار کے پہنچنے سے مجھے خوشی ہوئی۔ لیکن جس کام کی تکمیل کا حکم دیا گیا ہے اُس سے رنجیدہ (ہوا) کسی (شاعر) کے ایک دو شعر لے کر اُس کلام پر اپنی طرف سے دو چار اشعار کا اضافہ کر دینا (بھلا) کون سا اصول سخن وری اور انداز معنی پروری ہے۔ خاص طور پر یہ دو اشعار کہ جن میں سوائے عربی کے بھاری بھرکم الفاظ کے کوئی نازک خیالی موجود نہیں اور مزید یہ کہ ایسی بحر میں کہے گئے ہیں کہ ایرانیوں میں سے بھی کسی نے اس بحر میں غزل نہیں کہی۔ اس میں دو اشعار بڑھا کر چاہے اُس کو مسدس کا نام دیں تا ترجیع بند کے نام سے پکاریں۔ خصوصاً یہ اس لائق ہیں کہ بھکاری ان کو یاد کر لیں اور دروازے دروازے پُرسوز لے میں گاتے پھریں اور خاتم المرسلینؐ کا کوئی عاشق یہ اشعار سن کر بے خود ہو جائے اور کوئی اپنا گریبان پھاڑ ڈالے۔ نہیں نہیں ہرگز نہیں۔۔۔''

(۲) وزیر الدولہ وزیر محمد خاں والی ٹونک کے نام مکتوب

''حمد و درود کے بعد نواب قدسی الالقاب عظیم الشان، رفیع المکان والی نعمت، آیۂ رحمت، قبلۂ دنیا و دین، حضرت امیر المومنین، دام اقبالہ، و زاد افضالہ، کی درگاہِ وافر السرور کے بار پانے والوں کی پیش گاہ میں عرض ہے کہ عریضہ نگار اگرچہ بظاہر قربت کی نظرگاہ کے دور افتادگاں میں سے ہے لیکن حقیقتاً آپ کی ہمیشہ قائم رہنے والی اقبال مندی کے دامن سے وابستہ ہے۔۔۔''

اس تناظر میں محترمی ڈاکٹر معین الدین عقیل کے درج ذیل کلماتِ تقریظ سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے اور فاضل مترجم کے اس پر کارِ خیر کو اردو زبان میں مرزا اسد اللہ غالب کے کرشمات لفظ و معنی سے محظوظ و مستفید ہونے والے قارئین پر عظیم احسان تصور کرتے ہوئے اجازت چاہتا

ہوں۔ جزاک اللہ!

”ترجمہ روہیلہ صاحب کے لیے اب کوئی مسئلہ نہیں۔ غالب کی لفظیات اور اسالیب ان کے لیے اب کوئی اجنبیت نہیں رکھتے غالب کے خطوط کی اتنی بڑی تعداد کو اردو میں منتقل کرتے ہوئے جو روانی اور فطری سلاست اب اُن کے تراجم میں نظر آرہی ہے وہ ایک زمانے کی ان کی مشق کا ثمر ہے۔۔۔“

(اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۳ء)

عکسِ جمال (شعری مجموعہ)

مضطر اکبر آبادی

ایک طویل مدت سے مجلسی تعارف کے باوجود مجھے بزرگ شاعر حضرت مضطر اکبر آبادی کا کلام بالاستعیاب مطالعہ کرنے کا موقع زیر نظر مجموعہ سے قبل نہ مل سکا تھا حالانکہ اس سے پہلے بھی ان کا ایک اور مجموعہ ''روپ دھنک'' ۱۹۹۸ء میں شائع ہو چکا ہے بہر حال تازہ مطالعہ کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ''ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں''

جس کو سن کر ڈوبنے لگتی ہے نبض کائنات　　　وہ کہیں میری ہی مضطر داستان غم نہ ہو

شعر کہنے کا سلیقہ۔ اعلیٰ فنی شعور۔ زبان و بیان پر قدرت۔ قدیم و جدید شعری افکار کا امتزاج واتصال۔ اُسلوب کی لطافت۔ نفاست اور پاکیزگی سلاست و برجستگی کا وہ عالم کہ تمام مجموعۂ کلام کو پڑھ جایئے ایک لفظ بھی ایسا کہ جسے بوجھل۔ ادق یا نامانوس کہا جاسکے ملنا مشکل ہے بلکہ اضافتیں بھی خال خال ہی مل سکیں گی۔ بعض معاصر نقاد غالباً یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ کلاسیکی فکروفن دقیانوسیت ہے کاش اُنھیں معلوم ہو کہ ان اقدار سے رشتہ منقطع کر کے شاعری ایک سر بُریدہ جسم بن کر رہ جاتی ہے۔ ''عکسِ جمال'' کے شاعر نے ثابت کیا ہے کہ کلاسیکی رجحانِ فکر کوئی ساکت و جامد شعری عمل (Phenomenon) نہیں بلکہ ایک متحرک (Dynamic) قوت ہے جو ہر عہد کے فکر و فلسفہ اور عوامل و عناصر کے تنوعات کو جذب کر لینے اور مستقبل کا ورثہ بنا دینے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔

مضطر اکبر آبادی کا ایک سو تیس غزلیات پر مشتمل زیر تبصرہ کلام جس میں حُب وطن پر مبنی ایک شاہکار نظم بھی شامل ہے کچھ ایسی جہات نو سے بھی اپنے قارئین کو متعارف کرتا ہے جو روایت و تسلسل کو ارتقائی عمل سے مزید مستحکم بناتی ہیں۔ اُن کی پہلی غزل کا مطلع حمد یہ ہے جو مکمل حمد کا 'نعم البدل' ہے جس کا اہتمام شعرا روایت کے طور پر عموماً کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو

سحر کا گھونگٹ اُٹھا کے پھر آفتاب دیکھوں　　　میں تیرے چہرہ کی سب سے پہلے کتاب دیکھوں

وہ کلاسیکی مزاج و آہنگ کو برقرار رکھتے ہوئے تازہ کاری سے لطیف و نازک پیرائے میں حیات و کائنات کے فلسفوں سے اپنے اشعار کو جلال و جمال اور وقار و تمکنت سے ہم آغوش کر دیتے ہیں اور اس طرح صنف غزل کو موضوعاتی تنوع کا شاہکار بنا کر پیش کرتے ہیں۔ مثلاً

بنیاد کا ہو عجز کہ دیوار کا غرور
دونوں ہی زخم خوردۂ پست و بلند ہیں

کوئی جو دیدۂ عبرت نگاہ سے دیکھے
بلندیاں بھی نگوں سر ہیں پستیوں کی طرح

اُڑان پر تھا بہت ناز جن پرندوں کو
بکھر گئے ہیں فضا میں وہ دھجیوں کی طرح

رات بھر چراغوں کا خون ہے کہ جلتا ہے
کانپتا ہوا سورج تب کہیں نکلتا ہے

مضطر زمیں نے کوئی خیانت کبھی نہ کی
بویا تھا میں نے جو وہی لوٹا دیا مجھے

آئے گا لازمی بربنائے سفر سامنے نقطۂ انتہائے سفر
مانتا ہوں کہ ہے ابتدائے سفر جانتا ہوں کہ منزل ابھی دور ہے
اہل کچھ لوگ ہیں تاج و اورنگ کے کچھ سزاوار ہیں بارشِ سنگ کے
فیصلے ہو رہے ہیں عجب رنگ کے تیری دنیا کا کیسا یہ دستور ہے۔

قطرے کا دل جو چیر کے دیکھا تو یہ کُھلا
قطرہ بھی وسعتوں میں سمندر سے کم نہیں

صرف اُجالے ہی کا ساتھی تھا اندھیرے کا نہیں
میرا سایہ بڑا سفاک و ستمگر نکلا

اپنی تمام شاعری میں صاحبِ ''عکس جمال'' اپنے خیال کی بوقلمونی پر مکمل قدرت رکھتے ہیں اور تطہیر موضوعات کے عمل سے گزار کر انھوں نے کلاسیکی روایت کی پاکیزہ پیکر تراشی کا ورثہ نسلِ نو کو منتقل کیا ہے۔ اُن کے کلام میں 'رقیب' کا تصور دور دور تک کہیں نہیں ملتا۔ اُن کا محبوب نہ ظالم و جابر ہے نہ قاتل و سفاک وہ محبوب کا ایک نہایت پاکیزہ اور لطیف و جمیل تصور پیش کرتے ہیں۔ اُسلوب میں انفرادیت اور تازہ کاری جمالیات کا مرقع ہے۔ شائستہ لب و لہجہ مضطر صاحب کا اختصاص ہی نہیں بلکہ شناخت ہے! مجاز و حقیقت کا پرتو ایک ہی حقیقت ابدی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ یہی اُن کا تصوف بھی ہے اور یہی تغزل بھی۔

مرے ذہن پر ہیں گراں بہت یہ تسلسلِ مہ و سال بھی
تو کہاں ہے اے مرے ناخدا مجھے اس بھنور سے نکال بھی
مری عاجزی کے ہنر سے ہے مرے ذوق وشوقِ نظر سے ہے
ترا اعتبارِ جلال بھی تری بارگاہِ جمال بھی
سرِ شام ذہن میں خوشبوؤں کے اُتر رہے ہیں وہ قافلے
کہ بہار بن کے مہک اُٹھی ہے فضائے دشتِ خیال بھی

وہ نہ جانے کون تھا مجھ سے جو رہا ہم سخن بڑی دیر تک
وہی تیرے لہجے کی تھی مہک وہی تیرا طرزِ کلام تھا
ہر گام پہ رستوں میں یہ بکھری ہوئی خوشبو
احساس دلاتی ہے تری ہم سفری کا
کاش اِس آنکھ میں ایسا کوئی آنسو آئے
ٹپکے دامن پہ تو اس سے تری خوشبو آئے
تتلیوں نے ترے ملبوس کے رنگ اوڑھ لیے
تیرے چہرے سے چمک مانگنے جگنو آئے
پلٹ پلٹ کے بچھڑنے کے بعد دیکھا ہے
قدم قدم پہ کسی نے ٹھہر ٹھہر کے مجھے
پسِ ترکِ تعلق بھی یہ عالم ہے تعلق کا
ہمیں وہ یاد آتے ہیں انھیں ہم یاد آتے ہیں
بس میں تھا اور مہک تھی کسی کے خیال کی
جز اس کے اور کچھ مرا زادِ سفر نہ تھا
مجھ سے ہُوا الجھ کے مرا کیا بگاڑتی
سورج تھا میں چراغِ سرِ رہگزر نہ تھا
اک وہ صورت جو ہے پاکیزہ خیالوں جیسی
سر سے ہے تا بہ قدم زہرہ جمالوں جیسی
کنجِ لب کھُلتے ہی ہوتی ہے نئی صبح طلوع
اُس کی باتیں ہیں اندھیروں میں اجالوں جیسی
وارد ہوا ہے یوں کوئی دل کی حدود میں
خوشبو کی طرح پھیل گیا ہے وجود میں

شاعر کا دل رفتگاں کی یاد سے معمور ہے اُسے ماضی کی بعض قدروں کی پامالی پر دکھ ہے۔ مضطر اکبر آبادی کی شاعری میں یادِ ماضی (Nostalgia) ایک تڑپ بن کر ابھرتی ہے یہاں بھی اُنکا پُرسوز اُسلوب ان کی دل کی خلش کا ترجمان بن جاتا ہے

جاہ و حشم رہا نہ مکین و مکاں رہے
جن کی کبھی تھی دھوم وہ لوگ اب کہاں رہے

پاسِ ادب ہے اور نہ رشتوں کا احترام　　انسانیت کے سارے تقاضے بدل گئے

ہوتی تھی جن سے عظمتِ کردار کی پرکھ　　اے گردشِ زمانہ وہ معیار کیا ہوئے

آئینے بھی حیرتوں میں غرق ہو کر رہ گئے　　صورتوں میں سیرتوں کا عکس اجاگر دیکھ کر

کیا کہوں خود سے مجھے کتنی پریشانی ہے　　خندہ زن مجھ پہ مری بے سروسامانی ہے

بے لباسی کی روش عام ہوئی ہے جب سے　　پیرہن سربگیر بیاں ہیں وہ عریانی ہے

بزرگ نسل سے تعلق کی بنا پر حضرتِ مضطر کے دل و دماغ پر اساتذۂ قدیم کے موضوعات فکروفن کی چھاپ یقیناً خاصی گہری ہے لیکن اُنھوں نے اپنے اُسلوب کی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے اشعار مین مضامین کے توارد کی مثالوں سے اردو شاعری کی تاریخ بھری پڑی ہے لیکن جن لوگوں نے اُسلوب کی ندرت سے اپنا سکّہ جمایا وہی سرخرو بھی رہے مضطر انھیں لوگوں میں شامل ہیں۔ثبوت کے طور پر صرف دو ایک مثالیں:

آسماں بارِ امانت نہ توانست کشید　　قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند

(حافظ)

سب پہ جس بوجھ نے گرانی کی　　میں اُسے ناتواں اُٹھا لایا

(میر)

گراں سمجھ کے جسے سب نے کہہ دیا کہ نہیں　　وہ بارِ دوش پہ میں نے اٹھا لیا کہ نہیں

(سودا)

وہ مضمون جس نے آغاز سفر حافظ کے فارسی شعر سے کیا اُسے میرؔ نے اپنے اُسلوب میں ڈھالا پھر سوداؔ کے جلالی انداز سے گزرا اور مضطر تک پہنچتے پہنچتے شاعر نے اُسے طویل مسافت سے نڈھال نہیں ہونے دیا بلکہ اُسلوب کی تازہ کاری سے مزید سفر کے قابل بنا دیا۔اُسلوب حقیقتاً ہر شاعر کے اندازِ فکر کا غماز ہوتا ہے ملاحظہ ہو:

جس بوجھ کا کوئی متحمل نہ ہوسکا　　وہ بوجھ ہم ازل سے اُٹھائے ہوئے تو ہیں

مضطر

مزید دیکھیئے۔جگر مرحوم فرماتے ہیں

کس کا خیال کونسی منزل نظر میں ہے　　صدیاں گزر گئیں کہ زمانہ سفر میں ہے

شاعرِ ''عکسِ جمال'' کا ارشاد ہے

ہے کاروانِ وقت مسلسل رواں دواں   صدیوں سے بوجھ اُٹھائے ہوئے ماہ وسال کا

بعض غزلیں جنھیں عرفِ عام میں 'غزل مسلسل' کہا جاتا ہے زیرِ نظر شعری مجموعہ کی زینت ہیں اور اس طرح کہ شاعر کے تجربہ ومہارت نے اُنھیں یک موضوعی تسلسل کے باوجود اپنے حُسنِ اسلوب کے باعث تاثراتی تنوع سے ہم کنار کر دیا ہے۔ مشقِ سخن اور فنِ شعر پر ہمہ پہلو گرفت کا شاہکار ایک 'یک قافیہ' غزل بھی میری نظر سے گزری جو یک قافیہ ہونے کے باوجود شعری تلازمات سے مرصع ہے اندازہ فرمائیے۔

مسافروں کو ہی خود راہ کا شعور نہیں   وگرنہ کوئی بھی منزل کہیں سے دور نہیں
یہ انکشاف ہوا ہے عروجِ آدم سے   کہ آسماں بھی ہماری زمیں سے دور نہیں
جو ڈھونڈیئے تو وہ نزدیک تر ہے شہ رگ سے   نہ ڈھونڈیئے تو نشاں اس کا دور دور نہیں

کلام کا مطالعہ قاری کو نوع بہ نوع کے تاثرات عطا کرتا ہے جن میں سب سے نمایاں تاثر شعر کے تخیّل وتصور کی توانائی اور آفاقیت ہے جسے تغزل کے سانچے میں ڈھالنے کے فن پر شاعر کو قدرت حاصل ہے۔

کنارِ دریا پہنچ کے مضطر یہ سوچتا ہوں   میں دل کو دیکھوں کہ موج کا اضطراب دیکھوں
وہ جو اک چیز توجہ کی کمی ہوتی ہے   نہیں ہوتی کبھی محسوس کبھی ہوتی ہے
ہے خموشی بھی سخن، شرط سلیقہ ہے فقط   راکھ کے ڈھیر میں بھی آگ دبی ہوتی ہے
رات بھر جاگنے والوں کو بھی نیند آنے لگی   اب تو آجاؤ چراغوں کو بھی نیند آنے لگی
ایک اک کر کے سبھی سونے لگے آخر کار   جگنوؤں چاند ستاروں کو بھی نیند آنے لگی
دیکھتے دیکھتے ہونے لگیں بوجھل پلکیں   ناگہاں جاگتی آنکھوں کو بھی نیند آنے لگی
دل میں لو دیتے ہوئے زخم بھی کجلانے لگے   ان بھڑکتے ہوئے شعلوں کو بھی نیند آنے لگی
جو ملی تھی بھیک میں روشنی اسے درمیاں سے ہٹا دیا   جو مرے ضمیر پہ بوجھ تھا وہ چراغ میں نے بجھا دیا

رہا مضطر اپنا شام سے یہی ایک مشغلہ تا سحر
ہوا گل چراغ کوئی اگر تو نیا چراغ جلا دیا

دیئے تھے زخم تو بے انتہا دیئے ہوتے
یہ پھول دل میں بکثرت، کھلا دیئے ہوتے

جو تم سے روشنیاں مستعار لیتے ہیں
تمہارے سامنے روشن وہ کیا دیئے ہوتے

اب اس سے بہتر تشبیہ واستعارہ کا فنکارانہ استعمال اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہی حسنِ تخلیق بھی ہے اور تخلیق حسن بھی۔ رعنائی خیال اور حُسن تخیل ''عکسِ جمال'' کی دو نظر نواز تصوریں ہیں لیکن خارجی موضوعات جنھیں عصری معنویت سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے شاعر کی برجستہ و برمحل گرفت سے باہر نہیں مثلاً

جو رات آئی ہے سر پر تو صبح بھی ہوگی
اندھیرا روشنیوں کی دلیلِ محکم ہے

نو بہ نو تازہ بہ تازہ زخم کھاتے جایئے
زخم کھاتے جایئے اور مسکراتے جایئے

جا بجا مضطر فصیلِ شب میں رخنے ڈال کر
روشنی ظلمت کے چہرے پر سجاتے جایئے

یونہی نہیں ہم اجالوں کی سلطنت کے سفیر
کشید ہم نے اندھیروں سے روشنی کی ہے

رکھتا ہو کوئی دیدۂ بینا تو پھر اُسے
منظر کئی نظر، پس منظر بھی آئیں گے

مضطر قریب تر ہے وہ دن احتساب کا
جب خود ستم کی زد میں ستمگر بھی آئیں گے

حرفِ حق کہنے کا انجام ہو کچھ بھی لیکن
کم سے کم سر سے تو اک بوجھ اُتر جائے گا

میں نے کیا تھا وقت سے امن کے باب میں سوال
اُس نے سوال کا جواب خون اُچھال کر دیا

فکر و فن کے انتقادی جائزے کے بعد آخر میں شاعر کی شخصیت کا عکسِ جمال و جلال بھی بین السطور دیکھ لیا جائے تو حق بجانب ہوگا۔

حادثے بھی دم بخود ہیں استقامت پر مری
ریزہ ریزہ ہو گیا ہوں پھر بھی میں بکھرا نہیں

کام کوئی کیوں کروں اپنی طبیعت کے خلاف
ہاتھ اُس سے کیوں ملاؤں جس سے دل ملتا نہیں

کبھی آفتاب کی ضو بنا تو کبھی چراغ کی لو بنا
کہیں احتاجِ سحر تھا میں تو کہیں ضرورت شام بھی

میرے خدا وہ جرأت رندانہ دے مجھے
کم ہمتی کا پھر کوئی طعنہ نہ دے مجھے

(اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۳ء)

حصہ دوئم

تقاریظ

خاکسار تحریک اور علامہ مشرقی

ثناء اللہ اختر

پیش لفظ

خاکسار تحریک اور اس کے بانی علاّمہ عنایت اللہ خان المشرقی کے بارے میں اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ بے شمار کتابوں کے مرتبین اور مولفین نے تفصیلاً اور اجمالاً اپنے اپنے انداز میں تحریک میں رونما ہونے والے ہر مدوجزر پر اور بانی تحریک کی شخصیت، فکرو فلسفہ، دینی و سیاسی تصورات اور دو دہائیوں سے بھی کم مدت پر محیط انقلاب آفرین سرگرمیوں نیز ایک مخصوص نصب العین کے حصول کی خواہش پر مرتکز سرفروشانہ جدو جہد پر کہیں ناقدانہ اور کہیں ارادتمندانہ جائزہ لیا ہے۔ اس طرح بیک وقت ان معروضی و غیر معروضی نقطہ ہائے نظر اور تجزیاتی مطالعوں کے توسط سے تاریخ کو جو مواد مہیا کر دیا گیا ہے اس کے پیش نظر تحریک اور اس کے موسس کے بارے میں اصولاً اور واقعتاً کسی بھی قسم کا ابہام باقی نہیں رہنا چاہیے لیکن بدقسمتی سے جنوبی ایشیا نے بیسویں صدی کے نصف اول میں حالات و واقعات کی جس گھما گھمی میں خصوصاً سیاست و مذہب کے شعبوں میں جن قدآور شخصیات کو منصۂ شہود پر ابھارا اُن میں بالخصوص علامہ مشرقی کی ذات گرامی کو متنازعہ بھی گردانا گیا۔ اوران کے افکار و نظریات کے تحت شب و روز کے ہنگاموں کے گرد ابہام و تشکیک کے ایسے تانے بانے بھی بن دیئے گئے جن کے نتیجہ میں تاریخ کا مطالعہ کرنیوالوں کو حقائق اخذ کرنے میں آج بھی دشواری کا سامنا ہے۔

چنانچہ اس سیاق و سباق میں زیر نظر کتاب کے مولف ثناء اللہ اختر صاحب نے وقت کے فراہم کردہ جس چیلنج کو قبول کیا ہے۔ وہ جرأت مندانہ سہی لیکن نقد و نظر کی میزان میں تل کر حقیقت

پسندانہ قرار دیئے جانے کا مستحق اس وقت قرار پائے گا جب اس پر تاریخ مہر تصدیق ثبت کر دے گی۔ اس ضمن میں فاضل مولف کے علمی ادراک اور تجزیاتی شعور کا ثبوت نہایت برملا انداز میں ان متعین و برمحل حوالوں سے ملتا ہے جن میں کم و بیش ان تمام مطبوعہ مطالعوں کا احاطہ کیا گیا ہے جن میں نمایاں کتب مثلاً صفدر سلیمی کی ''خاکسار تحریک کی سولہ سالہ جدوجہد'' ڈاکٹر شان محمد کی'' خاکسار تحریک ہندوستان میں ڈاکٹر عظمت اللہ بھٹی کی ''المشرقی'' (دو جلدوں میں) پروفیسر محمد اسلم کی ''علامہ مشرقی کی سیاسی سوانح حیات'' اور خود مولف کے والد گرامی خاکسار شیر زمان کی جو مشرقی مرحوم کے قریب ترین رفقاء اور تحریک کے صف اول کے جانثاروں میں شامل تھے تین جلدوں پر مشتمل ''خاکسار تحرک کی جدوجہد'' شامل ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مولف نے اپنی ضخیم و مبسوط تحقیق کو خود جو سند اعتبار عطا کی ہے اسے علامہ مرحوم کے مقالات و خطبات اور بیانات کے علاوہ ان کی پُر مغز و پُر معنی تصانیف ''تذکرہ'' و ''اشارات'' کے عمیق مطالعہ سے تقویت ملتی ہے جو زیر نظر کتاب کی جملہ تفاصیل و جزئیات کو محققانہ پس منظر فراہم کرتا ہے۔ دیکھا جائے تو مختلف نقطہ ہائے نظر کے تحت تخلیق پانے والے وسیع لٹریچر نے اختر صاحب کے کام کو مزید دشوار تر اس لیے بھی بنا دیا کہ منہدم عمارت کے ملبہ سے شکست و ریخت سے بچ جانے والی صحیح و سالم اشیاء کو ڈھونڈ نکالنا اور بھی دشوار ہوتا ہے۔ یہ عمل اس گرد کی تہوں کو نوک قلم سے کھرچ ڈالنے کے مترادف ہے جو تاریخ کے آئینہ پر جم جانے کے سبب بمشکل نظر آنے والے ہر عکس کو مسخ کر کے رکھ دیتی ہے۔ چنانچہ مولف کے زیر نظر مطالعہ میں جو جانکاہی کارفرما نظر آتی ہے اس نے بڑی حد تک کتاب کے مندرجات کو وقیع و معتبر بنا دیا ہے اور پورے نظام تحریر میں ایک منطقی ربط اور واقعاتی تسلسل کو جو کلیدی حیثیت دی گئی ہے وہ نہ صرف قاری کو متاثر کرتی ہے بلکہ یہ احساس بھی دلاتی ہے کہ وہ ابہام جو تحریک اور خود بانی تحریک کے بارے میں پیدا ہو گیا تھا وہ بتدریج ختم ہوتا جا رہا ہے۔

دراصل مشرقی مرحوم کی کثیر الجہت شخصیت کا ادراک تحلیل نفسی اور ان کے فکر و نظر کے

خارجی عوامل سے ایک مخصوص ومنفرد انداز میں متاثر ہونے اور ان عوامل کے متاثر کرنے کی صلاحیت کا تجزیاتی عمل کسی بھی سوانح نگار کے لیے ایک انتہائی غیر معمولی فرض منصبی کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھے جنھیں مشرق ومغرب کے علوم سے بہرہ ور، زندگی کی گوناں گوں جہتوں کے بحر ذخار کے شناور اور ایک منفرد المقام دیدہ ور ہونے کا شرف حاصل تھا۔ وہ مسلمانان برصغیر کو دین اسلام کی خود تشریحی جن تاویلات کی طرف راغب کرنا چاہتے تھے وہ انھیں اپنے پیشرو سر سید احمد خان مرحوم سے مماثل بناتی ہیں۔ ہر دور کو اپنے معاصر علمائے کرام سے ستیزہ کار رہنا پڑا لیکن مشرقی مرحوم نے آغاز کار سر سید سے مختلف انداز میں کیا یعنی انھوں نے اپنی فکر و کا محور ومنبع اپنے فہم کے مطابق قرآن حکیم کی تعلیمات کو قرار دیتے ہوئے ایک خالص اصلاحی وفلاحی تحریک کو ماورائے سیاست منظم کیا اور جب اپنی مقناطیسی شخصیت۔ اخلاص، محبت اور بے لوثی سے اسے بام عروج پر پہنچا دیا تو حریفان سیاست خود ہی ان کے مقابل آ گئے۔ چنانچہ تحریک میں ''باب سیات'' کا قیام ناگزیر ہو گیا تو علامہ بھی اپنے لاکھوں جانثاران تحریک کو ساتھ لے کر اس وادی پر خار میں آبلہ پائی کے باوصف اتر آئے۔ ان کو ۱۹۳۰ء میں قصہ خوانی بازار پشاور میں پٹھانوں کے قتل عام نے جھنجوڑ کر رکھ دیا اور یہیں سے ان کی زندگی مین جو موڑ آیا اس کا آغاز شدید ترین حکومت مخالفِ جذبات سے ہوا۔ بعد ازاں جب تحریک میں عسکریت کا عنصر غالب آتا دکھائی دیا تو مرکزی اور بعض صوبائی حکومتوں نے بھی تحفظ امن عامہ کو بہانہ بنا کر تحریک اور بانی تحریک کو ریاستی سفا کی کا نشانہ بنایا۔ دوسری طرف برصغیر گزشتہ صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں ایک نہایت ہیجان خیز اور زلزلہ آگیں دور سے گزر رہا تھا جس میں سیاسی جماعتیں اور تحریکیں اپنے اہداف کا کم وبیش تعین کر چکی تھیں اور بیش از بیش عوامی تائید وحمایت کے لیے دیوانہ وار سر گرداں تھیں۔ سیاسی زعما، اس تائید وحمایت کو فیصلہ کن قوت کے طور پر استعمال کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دینے کی متعین پالیسی پر اپنے شب وروز وقف کر چکے تھے علامہ اقبال کے ۱۹۳۰ء کے خطبۂ الہ آباد کے بعد مستقبل میں مسلم لیگ کی جدوجہد کا منظر بڑی حد تک ترتیب پا

چکا تھا۔ اس تناظر میں خاکسار تحریک جس کا آغاز فلاحی، دینی اور اصلاح معاشرہ کے غیر سیاسی مقاصد سے مشروط تھا۔ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۳۹ء تک سیاسی آندھیوں، زلزلوں اور طوفانوں کے گرداب بلاخیز میں اس طرح محصور ہوگئی کہ عملی سیاست کے خارزار کا انتخاب کر لینا خود مشرقی مرحوم کی ذکی الحس اور جذباتیت سے مغلوب شخصیت کے لیے ناگزیر ہوگیا۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردی   بازمی گوئی کے دامن ترمکن ہشیار باز

چنانچہ سیاسی جماعتوں سے تعلقات اور نشیب و فراز تحریک کے ''باب سیاست'' کا مستقل عنوان بن گئے ۱۹۴۵ء میں علامہ نے ''ہندوستان کی آزادی کا آئین پیش کیا جسے بشمول مسلم لیگ مختلف نقطہ ہائے نظر رکھنے والے حلقوں نے ہدف تنقید بنایا۔ صوبہ سرحد جس نے علامہ کے ذہن پر اولین نقش ثبت کیے ان کے لیے آزمائشوں کا مرکز بن گیا جہاں سرخپوش تحریک خاکسار تحریک کے حریفانہ مقابل آگئی۔ پنجاب میں سر سکندر کی حکومت نے رہی سہی کسر پوری کر دی اور خاکساروں کے خون کی ارزانی نے کوچہ و بازار کو لہو رنگ کر کے رکھ دیا۔ یوپی کانگریس نے تحریک کی ''عسکریت'' سے خوفزدہ ہو کر اسے پاش پاش کر دینے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا جس کی سفاکانہ مثال بلند شہر کا سانحہ تھا۔ حضرت قائد اعظم محمد علی جناح نے ایسے مرحلوں پر حالات کو روبہ اعتدال کرنے کی مدبرانہ مساعی کیں لیکن تاریخ اس عہد میں جس انداز سے جھٹکے لے رہی تھی اس نے تیزی سے ایک جوار بھاٹا کر پرورش کیا۔ جس کا نقطہ عروج وہ لمحہ بنا جب رفیق صابر نامی ایک شخص نے حضرت قائد اعظمؒ پر قاتلانہ حملہ کا بزدلانہ ارتکاب کیا تاہم اس کے خاکسار تحریک سے تعلق یا عدم تعلق سے قطع نظر اور اس ضمن میں عدالتی فیصلے کے باوصف خود برصغیر کے مسلمانوں کے درمیان ایک شدید تناؤ اور کھچاؤ کی مخاصمت پرور فضا قائم ہوگئی۔ دوسری طرف کانگریس سے وابستہ و غیر وابستہ متعصب ہندو ذہن نے خاکسار تحریک کی عسکری ہیئت ظاہری کو جواز بنا کر بربریت نہاد تنظیموں کو مسلمانوں کے درپئے آزار کر دیا حالانکہ لا اللہ الا اللہ کی اساس پر علامہ کے فلسفہ میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، پارسی اور اچھوت قوموں کے سیاسی تحریک میں شانہ بشانہ لانے کا ادعا ملتا ہے یعنی۔

''بیلچہ خدمت کے لیئے اپنے پاس رکھیں۔ خاکی لباس پہنیں، بیلچہ عجز وانکسار پیدا کرتا ہے۔ اسے اٹھا کر سیدھی قطاروں میں کھڑے ہونے سے قوم کے اندر نئی حرکت پیدا ہوگی۔ منظم ہونے کا پر اثر ہتھیار میسر ہوگا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی آپس کی الجھنوں کا حل بیلچہ کی حرکت اور خدمت خلق کی تحریک ہے۔''

لیکن حالات کے تند و تیز بہاؤ نے تحریک کو اس کی نظریاتی استقامت کے باوجود متزلزل کیئے رکھا اور قائد تحریک کو اپنے اس سفر کے دوران جن سنگ ہائے میل سے گزرنا پڑا ان میں سب سے زیادہ جاں گسل مرحلہ وہ تھا۔ جب ۱۹۳۰ء میں علامہ نے تحریک کی بساط لپیٹ دینے کا اعلان کیا۔ اس اعلان کے ردعمل کا اندازہ ضیغم نامی ایک خاکسار کے نہایت جارحانہ بلکہ گستاخانہ طرز تحریر پر مبنی اس خط سے لگایا جا سکتا ہے جو اس نے قائد تحریک کو لکھا تاہم اس خط کا نظر انداز نہیں کیا گیا اور خود تحریک کے اپنے جریدے میں شائع کر کے اعلیٰ قیادت نے جس تدبر کا مظاہرہ کیا اس کے نتیجہ میں تحریک کی صفوں میں بغاوت پر عقیدت غالب آگئی اور یہی وہ بے مثال عقیدت تھی جس نے بدترین مظالم کے باوجود خاکساروں کو نہ صرف منظم رکھا بلکہ تحریک میں مخلصانہ قیادت کے جو نئے افق طلوع ہوئے ان میں نواب بہادر یار جنگ جیسی ضیا بار شخصیت کا علامہ کا دست بازو بن جانا خود علامہ کی قائدانہ صلاحیتوں کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔

ایسی مثال غالباً شاذ ہی میسر آ سکے کہ ایک انقلاب آفرین تحریک لاکھوں انسانوں کے رگ و پے میں برقی رو کی طرح سرایت کر جائے اور یہ سب کچھ دولت و ثروت کی کرشمہ کاری کے بغیر محض اس لیے ممکن ہو جائے کہ تحریک سے وابستہ ہر فرد اپنے مصارف کی خود کفالت کرنے اور چندہ یا جماعت کے لیے زراندوزی کے کسی بھی ذریعہ کو اختیار نہ کرنے کا حلفاً پابند ہو۔ تاہم ۱۹۴۷ء میں تحریک کو منتشر کرنے کا اعلان جو حتمی ثابت ہوا بذات خود ایک عظیم سانحہ تھا۔ دہلی کیمپ میں خاکساروں کو مطلوبہ تعداد کے نہ پہنچ پانے کی وجہ ملک میں امن و امان کی بدترین صورت حال کے تناظر میں اظہر من الشمس تھی۔ ۱۷ مارچ ۱۹۴۷ء کا یہ اعلان نہ صرف خاکساروں کے دل و

دماغ پر بجلی بن کر گرا بلکہ اس اعلان نے برصغیر کے سیاسی و غیر سیاسی حلقوں کو مبہوت کر کے رکھ دیا کیونکہ یہ ایک ایسا زلزلہ تھا جس نے اس عمارت کو زمین بوس کر کے رکھ دیا جس کی ایک ایک اینٹ کو خون پسینے سے تقویت بہم پہنچا کر چنا گیا تھا۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو مستقبل میں سیسہ پلائی ہوئی یہ تنظیم قیام پاکستان کے بعد استحکام پاکستان میں اپنے بنیادی مقاصد کے حوالے سے کیا کردار ادا کرتی یہ مورخین کے لیے ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گیا۔ یہ وہ صورت حال تھی کہ اہل الرائے علامہ کے مہیا کئے ہوئے جواز سے مطمئن بھی تھے اور مضطرب بھی۔ چنانچہ یہی ایک مرحلہ ہے جہاں زیر نظر کتاب کے فاضل مولف نے اپنی تحقیق کی حدود کو وسیع سے وسیع تر کیا ہے بلکہ دیگر اہم مراحل کا پوری جگر کاوی سے جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ جزئیات نگاری کا بھی پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ اختر صاحب نے مستند حوالوں سے تاریخ کے ایک نہایت و پیچیدہ دور میں مسلسل متحرک و فعال رہنے والی تنظیم کی نظریاتی اساس اور اس کی حیات انقلاب پرور کے شب و روز سے قارئین کو جو مواد مہیا کیا ہے وہ اس کتاب کی اشاعت کے ساتھ ہی عظیم تاریخی ورثہ بن جائے گا۔ انھوں نے قائد تحریک کے خدوخال کو بھی جس بصیرت افروز انداز میں نمایاں کیا ہے اسے دیکھ کر یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر صاحب زادہ آفتاب احمد خان نے ۱۹۳۵ء میں مشرقی مرحوم کو نوبل انعام دینے کی جو سفارش کی تھی وہ واقعی اس کے مستحق تھے۔

میں اس بھرپور تحقیقی کاوش پر جناب ثناء اللہ اختر کو ہدیۂ تبرک پیش کرتا ہوں۔

(مطبوعہ ستمبر ۲۰۰۳ء)

مؤدت ۔۔۔ تہذیب نفس کا مرقع

انجم خلیق

پیش لفظ

انجم خلیق اسلام آباد کے ادبی افق پر ابھرنے والا ایسا نام ہے جسے اہل علم و دانش نے سندِ اعتبار عطا کی ہے۔ ۲۰۰۴ء میں ان کا پہلا شعری مجموعہ ''سمندر میں اترتا ہوں'' منصۂ شہود پر آتے ہی ہمہ گیر پذیرائی سے سرفراز ہوا۔ بحرِ سخن کی غواصی میں اگیسے گہر تابداران کے ہاتھ لگے کہ ان کے فکر و فن کا منظر نامہ اور بھی درخشاں ہوگیا۔ ان کے اس شعری مجموعے کے مطالعے کے بعد خود میری رائے یہ ہے کہ ''زمینِ شعر'' پر انجم خلیق کے پہلے قدم کی گونج سماعتوں میں شہد گھول رہی ہے۔ ان میں جادۂ شعر پر سنگِ میل بن جانے کی صلاحیت برملا نظر آ رہی ہے۔

چنانچہ اب جب کہ انجم خلیق کا حمد و نعت اور سلام و منقبت پر مشتمل دوسرا شعری مجموعہ ''مؤدت'' میرے پیشِ نظر ہے تو میرے حافظے میں ان کا درج ذیل شعر گردش کر رہا ہے:

کچھ نعت کے اشعار بھی دیوان میں رکھنا
پرسش ہے بہت سخت وہاں فردِ عمل کی

زیرِ نظر مجموعہ اسی مبارک سوچ کا معنوی تسلسل بھی ہے اور اس حقیقت کی تصدیق بھی کہ انجم خلیق کو ربِ کائنات نے ''فیضانِ نظر'' اور ''مکتب کی کرامت'' کی نعمتِ دوگانہ سے بہرہ مند فرمایا ہے، یعنی حبِ رسولؐ اور حبِ اہلِ بیت کا ورثۂ تفاخر جو والدین سے انہیں منتقل ہوا، بالخصوص ادب و شعر کی میراث جو ان کے والدِ گرامی جناب خلیق قریشی مرحوم و مغفور کا عطیہ ہے۔ مجھے مرحوم سے قربت و رفاقت کا شرف حاصل رہا ہے۔ وہ نہ صرف روزنامہ ''عوام'' لائلپور کے مدیرِ شہیر کی حیثیت سے اپنے عہدِ صحافت کی آبرو سمجھے جاتے تھے بلکہ ایک ذہین و زیرک اور طباع شاعر تھے جن کی اردو اور فارسی شاعری میں بدیہہ گوئی اور قادر الکلامی ضرب المثل بن چکی ہے۔

وہ جہاں بیٹھتے اپنی بذلہ سنجی اور خوش مزاجی کے سبب رونقِ محفل بن جاتے۔ وہ اپنے خاندانی نام 'غلامِ رسول' کو حُبِ رسول کا انعام سمجھتے تھے۔ خوش قسمتی سے انہیں قریشی نسب ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا۔ چنانچہ قدسی مشہدی کا یہ نعتیہ شعر ان کی حیاتِ مستعار کا استعارہ بن گیا ہے۔

چشمِ رحمت بکشا، سوئے من انداز نظر　　اے قریشی لقب و ہاشمی و مطلبی

انجم خلیق کو 'مکتب کی کرامت' کے حوالے سے بھی علم وخبر سے مملو ذہانت اور ذوقِ شعری سے مرصع فکروفن میسر آئے ہیں جس کی گواہی ان کا دوسرا مجموعہ بھی دے رہا ہے، جو ان کی تہذیب نفس کا ایک مرقع ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

خداوند از تو یک فرصتِ اظہار می خواہم　　حروفِ معتبر لب ہائے گوہر بار می خواہم

اللہ نے ان کی دعا کو مستجاب فرمایا اور وہ کہہ اٹھے:

اسباب خود ہی خواہشِ تعمیر کو ملے　　الفاظ غیب سے مری تحریر کو ملے
یہ کس بابِ کرم پر التجا کی آرزو جاگی　　کہ اس کے ساتھ ہی دامن کشادہ کرلیا میں نے

حمد ونعت کو انجم نے جس خضوع وخشوع اور تکریم وتعظیم کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا اس کا عکس درج ذیل اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے

باوصفِ ہمہ خامی و کوتاہی توفیق　　ہر دم تری رحمت کا طلب گار رہوں یارب
جس وقت مشیت نے لکھا نامِ محمدؐ　　اس وقت خداوند تھا یا نامِ محمدؐ
دریاؤں میں ساحل کی طرح باعثِ تسکین　　صحراؤں میں گھنگھور گھٹا نامِ محمدؐ

منقبت میں ان کے فکروفن کے جواہر ارادت وعقیدت کے سانچوں میں ڈھل کر اور بھی نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ مختلف اصنافِ سخن کے حوالے سے ان کا شعور پختہ وتوانا نظر آتا ہے۔ انجم کے کلام کو اساتذہ کے مطالعے سے بھی بالخصوص اسلوب ومعانی کی ثروت میسر آئی ہے، وہ انیس سے خاص طور پر متاثر نظر آتے ہیں۔

جنھوں نے ریت کے ذروں کو کردیا خورشید　　　ستارے ڈھونڈتے پھرتے ہیں ان جبینوں کو

ان کے اشعار میں سلاست وروانی کے ساتھ جو برجستگی ہے، وہ انیس ہی کا فیضان ہے بلکہ ان کے اکثر لفظوں اور تراکیب کے تلمیحی پس منظر نے ان کی منقبت نگاری کو دقیع تر بنا دیا ہے۔ ان کی نظمیں 'پرتوِ بوتراب' اور 'کربلا تا شام' خاص طور پر اس تاثر کی تائید کرتی ہیں۔

شگفتِ گل ہے نہ چڑیوں کے چہچہے نہ اذاں　　　زمین کب سے اجالے کے انتظار میں ہے

کربلا تو نے نسلِ آدم کو　　　حریت کا شعور بخشا ہے

اک تجلی تھی بے مقام جسے　　　اپنے دامن کا طور بخشا ہے

اور کربلا پر ایک لازوال شعر:

کربلا ایک سانحہ ہی نہیں　　　کربلا ایک روشنی بھی ہے

دیکھئے کہ "مودّت" کا شاعر اپنے ممدوحین کو زبان و بیان کے کس سلیقے سے خراجِ تحسین پیش کرتا ہے:

کچھ لوگ وہ ہیں جن پہ مشیت کو ناز ہے　　　خِلقت پہ جن کی خالقِ خلقت کو ناز ہے

صِناعِ حسن و خیر کا شہکار ہیں یہ لوگ　　　دونوں جہاں کے مالک و مختار ہیں یہ لوگ

جنت کو حکم دیں تو زمینوں میں آبسے　　　سجدے میں ہوں تو عرش جبینوں میں آبسے

جتنی ملی ہیں نعمتیں ان سے جہان کو　　　اتنے نجوم مل نہ سکے آسماں کو

غالب نے اپنی تمام تر قادرالکلامی کے باوجود اعترافِ عجز کرلیا تھا کہ:

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم　　　کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

ایسا ہی اعترافِ عجز انجم خلیق نے بھی ایک خوبصورت تضمین کا سہارا لے کر کیا ہے:

خرد عاجز شود انجم چہ گویم من چساں گویم　　　"نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا"

انجم خلیق کے دونوں مجموعوں بالخصوص زیرِ نظر مجموعہ میں لسانی شکوہ اور لفظی اختراعات قاری

کو متاثر کرتی ہیں اور یہ فیضان ہے بقول غالب 'فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ' کا کہ جس نے 'مؤدت' کے شاعر کا لب ولہجہ دل پذیر و دل آویز بنا دیا ہے۔ مثلاً حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں کہی گئی منقبت سے ایک خوبصورت اردو شعر:

ہزار ہوش تصدق بریں خمار کہ ہست — چشیدہ ام نمی دانم چہ شے ز جامِ علیؑ
بڑے نصیب سے ملتا ہے منقبت کا شعور — بطورِ خاص ہوا مجھ پہ فیضِ عامِ علیؑ

مزید کچھ اشعارِ منقبت

وہ نفسِ احمدؐ و دستِ خدا و کعبہ نژاد — وہ بے بدل وہ یگانہ وہ لا جواب علیؑ
حنین و بدر واحد ہوں کہ خندق و خیبر — ہر ایک باب تہور کا انتساب علیؑ
زمیں کو کر گیا صدر شکِ کہکشاں انجم — وہ ظلِ نور رسالتؐ وہ بوتراب علیؑ

ایک اور جگہ حضرت عباسؓ سے معنون منقبت میں کہتے ہیں:

یہ کون ہے علیؑ آثار جس کی آمد پر — علم بھی شاد ہے مسرور ذوالفقار بھی ہے

چنانچہ حضرت عباس علمدارؑ کی نسبت 'علیؑ آثار' ترکیب وضع کر کے انجم نے شعر کی معنویت ہی میں اضافہ نہیں کیا بلکہ حضرت علیؑ کی نسبت "کعبہ نژاد" جیسی ترکیب کا حسن بھی پیدا کیا ہے۔ ایسی متعدد مثالیں زیرِ نظر مجموعے میں موجود ہیں۔ نیز ایسے استعاروں کے استعمال کے ذریعہ جن کے معنوی پس منظر میں تلمیحات کارفرما ہیں 'مؤدت' کے شعری اور فنی محاسن میں قابل قدر اضافہ کیا گیا ہے جیسے:

ہے اسی چادر سے قائم سارے پردوں کا بھرم — بے ردا کب تھا وہ سر جو بے ردا رکھا گیا
کربلا میں جب چراغِ کربلا روشن ہوا — اِس طرف قبلہ، اُدھر قبلہ نما روشن ہوا
مٹ نہیں پاتا کسی طوفانِ گردوباد سے — سینۂ صحرا پہ کیسا نقشِ پا روشن ہوا

مجھے یقین ہے کہ انجم خلیق کی شعری مساعی کو پذیرائی حاصل ہوتی رہے گی کہ وہ حال ہی نہیں، مستقبل کے ادبی افق کو بھی جلوہ بار کر دینے کی صلاحیت سے پوری طرح بہرہ مند ہیں۔

(مورخہ ۱۵ جنوری ۲۰۱۱ء)

کرچیاں (شعری مجموعہ)

رئیسہ اشفاق زیدی

تاثرات

محترمہ رئیسہ اشفاق زیدی کا شعری مجموعہ ''کرچیاں'' مطالعہ کیا تو محسوس ہوا کہ شعر و ادب سے متعلق نظریاتی اور فلسفیانہ بحثوں سے قطع نظر اگر کسی بھی فنکار کے لیے کسی چیز کو بنیادی ضرورت قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ صرف اور صرف صداقتِ احساس ہے اور یہی وہ قدر گراں سرمایہ ہے جو محترمہ کی شاعرانہ فکر کا مکمّل احاطہ کیے ہوئے ہے دوسری چیز جو اُن کے پیرایۂ اظہار کا حُسن بن گئی ہے وہ ان کی سادگی و سلاست ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ کسی بھی واقعہ یا کیفیت کو جس طرح محسوس کرتی ہیں بالکل اُسی طرح وہ اُس کے اظہار پر قادر بھی ہیں لگتا ہے کہ وہ ہر ایسی شعوری کاوش سے بے نیاز و ماوراہیں جو ان کی تخلیقات کو تصنع کی ملمع کاری سے آلودہ کر دے چنانچہ ان کے کلام کا پہلا اور آخری تاثر میرے ذہن پر کچھ اس انداز سے مرتّب ہوا کہ میرے حافظہ میں مولانا حالی کے وہ چند شعر اچانک تازہ ہو گئے جو کم و بیش پچاس برس پہلے میرے زیرِ مطالعہ رہے تھے اور اُس فلسفہ فکر کو جسے مولانا نے دنیائے شعر میں متعارف کرایا وہ بعد کے آنے والے ادوار میں سب سے زیادہ معتبر قرار پایا وہ چند شعر یہ ہیں

اے شعر دلپذیر نہ ہو تُو تو غم نہیں ۔۔۔ پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دلگداز تُو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام ۔۔۔ پر سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تُو
جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں ۔۔۔ تحسین روزگار سے ہے بے نیاز تُو
اے شعر راہِ راست پہ تُو جب کہ پڑ لیا ۔۔۔ پھر راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تُو

چنانچہ ان اشعار کی معنوی صداقت کا ثبوت زیرِ نظر مجموعہ کے ایک ایک شعر سے ملتا ہے جس کی شاعرہ کو قدرت نے ایک حسّاس دل اور راست فکر رکھنے والا دماغ عطا کیا ہے وہ اپنے گرد و پیش کے

ماحول سے اثرات قبول کرنے کی نہ صرف بھرپور صلاحیت رکھتی ہیں بلکہ شکوہ وشکایت اور احسان شناسی وتشکر کے برملا اظہار کا حوصلہ بھی رکھتی ہیں ان کی نظمیں خاص طور پر اُن کے قریب ترین ماحول کی عکّاس ہیں اور انسانی رشتوں کے تقدّس کا احساس اس قدر شدید و برملا ہے کہ قاری اُن کی سچائی اور کھرے پن کا دل سے معترف ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے انھیں کسی بھی قسم کی ضائع بدائع یا اپنے کلام میں کوئی بھی صنعت گری اُجاگر کرنے کا شوق نہیں ہے بلکہ ان کا قلم غیر شعوری طور پر ہر سچے جذبہ اور معصوم احساس کو سادہ و برجستہ لفظوں کا جامہ پہناتا چلا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ شاعرہ کو فن کے تقاضوں اور لوازمات کا احساس نہیں بلکہ وہ شعری معائب ومحاسن کا پورا پورا ادراک رکھتے ہوئے خود کو اُن کے تابع کرنے کے بجائے انہیں اپنے جذبہ واحساس کی صداقتوں کے تابع فرمان بنانے کا ہنر جانتی ہیں ان کی شاعری کا یہ وصف غزل میں خاص طور پر نمایاں نظر آتا ہے وہ قدیم وجدید کے کسی فلسفہ کی اسیر نہیں اور اپنی فکر کو اُلجھا دینے والے نظریوں کی زنجیروں میں جکڑنے کے بجائے اپنے محسوسات کو بے تکلف مگر باسلیقہ انداز میں شعر کے قالب میں ڈھال دیتی ہیں مثلاً ان کے یہ شعر:

صبح اُمید شب غم میں دکھائی دی ہے
دُھندلکوں میں بھی مجھے راہ سُجھائی دی ہے

کوئی آتا ہے کچھ آہٹ سی سنائی دی ہے
دل مضطر ذرا آہستہ دھڑکنا شاید

اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ''کرچیاں'' کی شاعرہ برملا اظہار کی جرأت اور کھری بات کہنے کا سلیقہ مندانہ حوصلہ رکھتی ہیں اور وہ بھی ایک ایسے انداز میں کہ ان کے قلم سے نکلنے والا لفظ لفظ ان کے اُسلوب کو پُر تاثیر بنا دیتا ہے۔

تجھ کو دیکھا، تجھے پوجا، تجھے چاہا میں نے
اپنے اس جرم کا اقرار مجھے آج بھی ہے

ہم ان تمام کے احساں اُٹھائیں گے کب تک
غمِ حیات غمِ روز گار اور غم دل

اُن کے یہاں نہ رجائیت پر زور ہے نہ یاسیت سے گریز بلکہ حالات واقعات اُن کے ذہن کو جس طرح اپنے حیطۂ اثر میں لاتے ہیں وہ اُسی طرح پوری سچائی کے ساتھ انہیں شعر کے قالب میں ڈھال دیتی ہیں ان کے یہاں روایتی عاشق کا کوئی کردار نظر آتا ہے نہ روایتی محبوب کا بلکہ زندگی کے نشیب وفراز اور حقائق کے تلخ وشیریں تجربات جس طرح ان کے ذہن کو متاثر کرتے ہیں

ان کی شاعری بجنسہٖ اس کی ترجمان نظر آتی ہے تاہم انہیں محبت جیسے پاکیزہ جذبہ کا جو والہانہ احساس ہے اُس کو قائم و برقرار رکھنے کے لیے اُن کے یہاں کسی بھی منافقت کا کوئی تصور نہیں اور وہ اپنے کرادر کے اس عظیم پہلو کو کسی بھی قیمت پر قربان کرنے کے لیے تیار نہیں البتہ ان کے بازو سچی محبتوں کے استقبال کے لیے ہمیشہ کشادہ رہتے ہیں۔

بہت جگہ ہے ترے واسطے مرے ہمدم — دماغ و روح میں بس جا، دل و نظر میں سما
متاعِ عظمتِ انسانیت کو رول دیا — غضب کیا اسے سود و زیاں میں تول دیا

محترمہ رئیسہ اشفاق زیدی نے نظم و غزل کے علاوہ حمد و نعت کو بھی اپنی فکر کا موضوع بنایا ہے اور زیرِ نظر مجموعہ میں ان کی خوبصورت فکر اور والہانہ جذبوں کی آئینہ دار عقیدتیں پیکرِ شعر میں ڈھلتی نظر آتی ہیں اور یہاں بھی سلاست و برجستگی ان کے کلام کی واضح خصوصیت بن کر سامنے آتی ہے بلکہ قطعات میں جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے وہ زبان و کلام پر ان کی بڑھتی ہوئی گرفت کو ظاہر کرتا ہے دو قطعات ملاحظہ ہوں

بربطِ زیست کے تھرا گئے یکبارگی تار — اور پھر ہاتھ سے مضراب نوا چھوٹ گئی
ساز خاموش ہوا تھم گئی آوازِ سرود — یک بیکِ نغمہ و آہنگ کی لے ٹوٹ گئی

نسیمِ صبح پیام بہار لائی ہے — یہ فصلِ گُل تمہیں اے دوستو مبارک ہو
پسِ قفس بھی چمن کی بہار دیکھیں گے — یہ رنگ و بُو تمہیں اے ہمدمو مبارک ہو

محترمہ کا ایک مجموعہ کلام اس سے پہلے بھی ''کسک'' کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے اور اب ''کرچیاں'' میں دونوں ہی ناموں کی داد دونگا کہ یہ الفاظ ان کے ہر دو مجموعہ ہائے کلام کے حقیقی ترجمان نظر آتے ہیں ورنہ اس دور میں تو شعری مجموعوں کے ایسے ایسے عجیب و غریب نام رکھنے کی رِیت پڑگئی ہے کہ

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے — ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے

(مطبوعہ ۲۰۰۱ء)

عقیدتوں کا سفر

نعیم فاطمہ علوی

تاثرات

''عقیدتوں کا سفر'' حج بیت اللہ کی روداد بھی ہے اور باطنی کیفیات کا مرقع بھی جسے نعیم فاطمہ علوی نے اپنے دلنشیں طرز نگارش سے دل و دماغ کی نو بہ نو جہتوں کا ترجمان بنا دیا ہے۔ وہ ایک حساس اور صاحب بصیرت افسانہ نگار ہیں اور اُن کی شناخت کے اجزائے ترکیبی میں اُن کے قلم کی سحر آفریں سلاست و روانی اور معاشرہ کی برملا و پس پردہ حقیقتوں کا ادراک شامل ہے۔ وہ گل پاشی اور نشتر زنی ہر دو عوامل پر قادر ہیں اور خفتہ و بیدار اندیشوں اور وسوسوں کو زبان عطا کرنے کا ہُنر جانتی ہیں یہی وجہ ہے کہ مجھے اُن کا زیرِ نظر سفر نامۂ حج جرأت مندانہ اعترافات اور حقیقت پسندانہ انکشافات کے سبب اچھا لگا۔ مجھے یقین ہے کہ قارئین ان کی جرأت کو جسارت اور تنقید کو تنقیص پر محمول نہیں کریں گے اور بین السطور اُن کے معصوم جذبوں اور والہانہ عقیدتوں کی حرارت کو محسوس کریں گے۔

یہ سفر نامہ اس اعتبار سے منفرد ہی نہیں معتبر بھی ہے کہ وہ سوالات جو اکثر دلوں میں مستقل چھبن بن کر مدفون ہیں مصنفہ نے اُنھیں نہ صرف دلیل کی کسوٹی پر پرکھا ہے بلکہ ثابت کیا ہے کہ ہمارا دین ضعیف الاعتقادی کا متحمل نہیں ہو سکتا مصنفہ نے روایات کی تشہیر کے بجائے تطہیر کے عمل پر اپنی توجہ مرکوز کی ہے اور عقیدت کے نام پر دینِ متین کے مسلمات میں تحریف کے رُجحان کو مسمار کیا ہے ہوسکتا ہے کہ بعض مُلائیت گزیدہ چتونوں پر بل پڑیں لیکن اسلام سے متصادم توہمات کو پوری اخلاقی قوت سے بے نقاب کر دینا زیرِ نظر تصنیف کا نمایاں وصف ہے یہی نہیں بلکہ مناسک حج کی ادائیگی کے دوران انفرادی اور اجتماعی کردار کے پسندیدہ و ناپسندیدہ مظاہر زیر بحث لا کر نعیم فاطمہ علوی نے دینی خدمت کا فریضہ بھی انجام دیا ہے۔ اُن کی تحریر سادہ رواں اور

دلپذیر ہے وہ تاریخ کا شعور بھی رکھتی ہیں اور عصری تقاضوں کا ادراک بھی۔ چنانچہ انہوں نے ''لااکراہَ فی الدِّین'' کے قرآنی تصور سے انحراف کرنے والے انتہا پسندانہ اور متشدد رویوں کو اپنے مخصوص سہل وسادہ انداز میں ہدف تنقید بنایا ہے وہ کہتی ہیں:

''میرا خیال ہے کہ سب سے بڑا جہاد اپنے نفس کی اصلاح کرنا ہے اور سب سے بڑی تبلیغ بھی ہمارا مومنانہ کردار ہے۔ ایک مومن اپنے کردار سے تبلیغ کرتا ہے اور یہ تبلیغ کا سب سے اہم درجہ ہے۔ یہ خاموش تبلیغ ہی ہمارے معاشرے کو غیر حقیقی اسلام کے آہنی شکنجوں سے چھٹکارا دِلا سکتی ہے''۔

اسی نقطۂ نظر کو دین ہی کے حوالے سے مزید واضح کرتے ہوئے وہ اللہ کے اُس پیغام کی طرف رجوع کرتی ہیں جس میں ہر مسلمان کے لیے ایک امتحان یا آزمائش کا مرحلہ پوشیدہ ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اللہ کی عطا کردہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانا لازم ہے۔

''اللہ نے ہر انسان کو انفرادی زندگی، انفرادی سوچ اور انفرادی شخصیت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور ہم تو خوش قسمت ہیں کہ ہمارے پاس اللہ کا پیغام بھی ہے سمجھ، سوچ اور پیغام پر عمل درآمد ہی ہمارا امتحان ہے۔''

قاری کو جگہ جگہ تحریر کا والہانہ پن اور عقیدت وارادت کا گداز اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور اُن پاکیزہ جذبات کی ایک مچلتی ہوئی تصویر نگاہوں میں ڈھل جاتی ہے جو سفرِ حج پر مصنفہ کا بیش بہا زادِراہ ہیں۔ اس تاثر کو مزید مہمیز لگانے کا کام اُن کا افسانوی رنگِ تحریر انجام دیتا ہے دیکھئے یہ ایک مثال جو محبت وعقیدت سے سرشار دِل کی آواز محسوس ہوتی ہے۔

''تخیل کو پر لگے اور وہ اُڑنے لگا۔۔۔ یہی جگہ تھی جہاں ہمارے نبیؐ خطبہ دیا کرتے تھے۔ نماز ادا کرتے۔ ازواجِ مطہرات کے ساتھ رہتے۔۔۔ کیا یہ وہی زمین کا ٹکڑا ہے۔ جہاں ہمارے نبیؐ چلتے پھرتے ہونگے۔ اُٹھتے بیٹھتے ہوں گے۔ کھاتے پیتے ہوں گے۔ عبادات کرتے ہوں گے۔۔۔ تخیل کی اُڑان کو جہاں تک لے جائیں۔ صدیوں کے فاصلے

لمحوں میں طے ہو جاتے ہیں۔''

سفرنامے کا ایک دوسرا رُخ جو اہم بھی ہے اور ایک ناقابل تردید حقیقت بھی وہ مصنفہ کا دورانِ سفر اور مقاماتِ مقدسہ کے قیام کے دوران وہ تجزیاتی مطالعہ ہے جس کو انہوں نے سادہ لیکن نہایت پُرکشش اسلوب میں ڈھالا ہے۔ کہیں کہیں تو تحریر کا یہ تیکھا پن قاری سے بے ساختہ خراجِ تحسین وصول کرتا ہے۔ مصنفہ کا ایک دلچسپ مشاہدہ اس قول پر مہر تصدیق ثبت کر گیا ہے کہ ''ضرورت ایجاد کی ماں ہے'' ملاحظہ ہو:

''میرے سامنے ایک چائے کی دوکان تھی جہاں خاصہ رش تھا ایک شخص نے تین کپ چائے لی۔ چائے خاصی گرم تھی۔ تین کپ اُٹھانے مشکل تھے لہٰذا اُس نے ایک چپل اُتاری چپل کی اُلٹی طرف کو ٹرے بنایا۔ کپ اُس پر رکھے اور چلنے لگا۔ میں چپل کے فوائد سے آگاہ تو تھی مگر اس فائدے نے معلومات میں اچھا خاصا اضافہ کر دیا''۔

تاریخِ عالم نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ حج سے بڑا اجتماع چشمِ فلک نے روئے زمین پر آج تک کہیں نہیں دیکھا۔ لاکھوں فرزندانِ توحید ''لبیک اللھم لبیک'' کہتے ہوئے ہر سال پروانہ وار حجازِ مقدس پہنچتے ہیں اور دنوں نہیں بلکہ ہفتوں پر محیط مناسکِ حج کی ادائیگی اور روضۂ رسولؐ پر حاضری کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ ہر چند اطرافِ عالم سے آئے ہوئے مسلمان مرد و زن مختلف زبانیں بھی بولتے ہیں اور نوع بنوع معاشرتی عادات و خصائل کے رشتوں میں بندھے ہوتے ہیں لیکن یہاں پہنچ کر اسلام کی عالم گیر اخوت اور مساوات کی جیتی جاگتی تصویر بن جاتے ہیں اتنے بڑے اجتماع کے لئے قیام و طعام سے لے کر نقل و حرکت تک کے جملہ انتظامات کرنا بڑی سے بڑی کسی بھی مملکت کے لئے ایک چیلنج سے کم نہیں سعودی حکومت نہایت خوش اسلوبی سے ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتی ہے اور ہر سال حجاجِ کرام کے لیئے انتظامات میں مزید بہتری اور اضافی سہولتوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ بایں ہمہ انسانوں کے اس انبوہِ کثیر میں بعض نہیں بلکہ اکثر و بیشتر کو کہیں کہیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے بلکہ بعض مشکلات تو زائرین کی اپنی پیدا کردہ

ہوتی ہیں جن میں ان کے ذاتی رویوں اور سماجی پس منظر کا دخل ہوتا ہے چنانچہ مصنفہ کی زیرِ نظر تصنیف میں درج ذیل اقتباسات سے صورتِ حال نہایت دلچسپ پیرائے میں سامنے آتی ہے۔

(۱) ''ہر وقت باتھ روم کے باہر قطاریں۔عورتوں کے چہروں پر کرب اور بے چینی کے اثرات۔بعض تو منتیں کرنے پر آجاتیں ہیں کہ ہمیں باری دے دو۔اب کس کس کے ساتھ تعاون کیا جائے۔سب اپنی اپنی حالت سے مجبور ہوتے تھے۔بعض بزرگ خواتین کو میں نے روتے دیکھا کیوں کہ اس عمر میں ویسے بھی جسم کا پریشر روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بعض تو بیچاری قطار میں کھڑے کھڑے ہی فارغ ہو جاتیں''۔

(۲) ''کچھ لوگ ہماری طرح شیطان کے بالکل قریب چلے جاتے اور پھر اپنی ٹنڈ پر ہاتھ رکھے۔چہرے پر کرب کے آثار کے ساتھ نظر آتے کئی لوگوں کو میں نے گنجے سروں پر ہاتھ رکھے بھاگتے ہوئے دیکھا''۔

نعیم فاطمہ علوی مستحق ہیں کہ جہاں اُن کی اور اُن کے شریک حیات ڈاکٹر ایوب علوی کے سراپا عجز وانکسار، والہانہ ارادت وعقیدت اور مناسک حج کے دوران انسانی ہمدردی کے بے لوث روّیوں کو مثال بنا کر سامنے رکھا جائے وہاں اُن کے اخلاقی جرأت پر مبنی عازمینِ حج کے انفرادی واجتماعی طرزِ عمل کے تجزیوں کو بھی خراجِ تحسین پیش کیا جائے کہ خود احتسابی اور دین کے صحیح اُصولوں پر عمل پیرا ہو کر ہی ہم فلاحِ دارین کے مستحق ہو سکتے ہیں۔دینی احکامات سے روگردانی۔توہمات اور من پسند تاویلات پر انحصار ہماری نجات کے ہرگز ہرگز ضامن نہیں ہو سکتے۔آخر میں کتاب کے ایک قابل توجہ اقتباس کے ساتھ میں اجازت چاہوں گا۔

''مسجد قباء میں دو نفل نماز پڑھ لو تو عمرے کا ثواب۔مسجدِ قبلتین میں دو نفل پڑھ لو تو پورے حج کا ثواب۔کہیں ہزار نمازوں کا ثواب اور کہیں ہزاروں نمازوں کا ثواب۔اسی لئے انسان ثواب کی گنتی کر کے حج قبول ہو جانے کی خود سے ہی سند لے لیتا ہے۔''

(مطبوعہ ستمبر ۲۰۰۷ء)

مژگاں

پروفیسر اقبال گلِ

پیش لفظ

پروفیسر اقبال گل پردۂ غیب سے نمودار ہوئے اور فضا میں تجلّی بار قہقہے بکھیر کر حجاب فرما گئے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ ان سے میرا تعارف گنتی کے مہینوں پر مشتمل تھا یا اَن گنت برسوں پر۔ اپنے عہد کے معروف غالب پرست و غالب شناس کالی داس گپتا رضا پر میرے دیرینہ رفیق اور ہم قلم محمود اختر سعید صاحب کا ایک مضمون سہ ماہی 'الاقرباء' کے شمارہ جولائی۔ستمبر ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا اور وہ کہیں پروفیسر اقبال گل کی نظر پڑ گیا جس نے انہیں بے تاب کر دیا کہ ان کا مولد و منشاء بھی گپتا رضا کی طرح مکند پور ضلع جالندھر (بھارت) کا وہ قریہ تھا جو ان کے بچپن، نوجوانی اور گپتا رضا کی جوانی کی یادوں کا امین تھا۔ چنانچہ ان سے محمود اختر سعید مرحوم ہی کے توسط سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے ''رضا مکند پوری'' کے زیرِ عنوان ایک مضمون عنایت فرمایا جو ان کی نثر نگاری کا ایک نادر نمونہ تھا اور مکند پور کے ساتھ رضا سے بھی والہانہ تعلق کا بے محابا اظہار۔ اس کے گواہ یہ تین جملے ہیں کہ ''تقریباً دو ہزار کی آبادی پر مشتمل اس گاؤں کو قدرت نے اپنی رہائش گاہ کے لیے منتخب کر لیا تھا۔ سنتے ہیں پریاں وہاں عبادت کے لیئے آیا کرتی تھیں۔ یہ تھا مکند پور، رضا اور میرا مولد'' مکند پور کے حوالے سے اقبال گل کا یہ شعر ان کی شیفتگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

احساں بہت ہیں مجھ پہ وطن کی ہواؤں کے ۔۔۔ آتے ہیں آسمان سے تحفے دعاؤں کے

یہ مضمون سہ ماہی 'الاقرباء' کے سالنامہ (جنوری۔مارچ ۲۰۱۰ء) میں شائع ہوا۔۔اور پھر الاقرباء کی سالانہ تقریب میں پروفیسر موصوف نے 'دبستانِ الاقرباء' کے نام سے اپنا یادگار مضمون

پڑھا اور افتتاحی کلمات ہی میں مضمون کی روح کو سمو دیا:

''تحریر کی شائستگی جس کا ساری مہذب دنیا تقاضا کرتی ہے، تحقیق کا استجاب جو محقق کی کارکردگی کا ضامن ہوتا ہے، کلاسیکی ادبی رجحانات کے روشن راستے، تخلیق کی حیرت انگیز خوشبو اور شادابی جو دلوں کو گرماتی بھی ہے اور آسودہ بھی کرتی ہے۔۔ یہ سب 'الاقرباءؑ' کے دبستانِ ادب کے نصاب میں شامل ہیں۔''

پروفیسر صاحب نظم و نثر دونوں میں ایک شگفتہ اور مسحور کن اسلوبِ نگارش پر قادر تھے۔ استعارہ و تشبیہ کا پُرشکوہ انداز ان کا اختصاص تھا۔ درویش مزاجی، بے نیازی اور جدت طرازی ان کی شخصیت، مزاج اور فکر و فن کے جوہر کہے جا سکتے ہیں۔ ''مژگاں'' ان کا پہلا اور آخری مجموعۂ کلام ہے جس کی تدوین و ترتیب کا آغاز انہوں نے خود اپنی تموّج خیز حیاتِ مستعار کے آخری دنوں میں کر دیا تھا اور جس کی تکمیل کا سہرا اُن کے محبّ مقربّ و مخلص مفتی لطف اللہ صاحب وفاقی سیکرٹری (ر) حکومتِ پاکستان کے سر ہے۔ وہ خوش نصیب تھے کہ مفتی صاحب جیسے صاحبانِ دانش و اہلِ علم و ادب ان کے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔ اقبال گل کا یہ شعر غالباً ان کے اسی احساسِ تفاخر کا ترجمان ہے۔

پھولوں نے مجھ پہ اپنے خزانے لٹائے ہیں　　　　میرے لیے بہار نے آنسو بہائے ہیں

میرے لیے ان کے کلام کا مطالعہ اک سحر آگیں تجربہ ثابت ہوا ہے۔ کلام گو مختصر لیکن مقدار کے مقابلے میں اقدار کی ارفع مثال ہے۔ نظم کی صنف پر ان کی فکری و فنی گرفت قابلِ تحسین ہے۔ وہ محبت کی نفسیات کو لطیف و جمیل الفاظ کا جامہ پہنانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ جبکہ غزل کا حُسن بھی ان کی نظم کی جمالیات سے مرصع نظر آتا ہے۔ کاش اقبال گل اپنی زندگی میں ایک خوش آہنگ رومانی شاعر کی حیثیت سے وہ شہرت حاصل کر سکتے جو اختر شیرانی کے حصہ میں آئی۔ لیکن 'مژگاں' کے منظرِ عام پر آنے کے ساتھ مجھے یقین ہے کہ نہ اس عہد کا ناقد اور نہ مستقبل کا مورخ اُن سے صرفِ نظر کرنے کا متحمل ہو سکے گا۔ جوش، شیرانی اور گل کے درج ذیل رومانی اشعار کا نعم البدل

شاید ورڈز ورتھ، شیلے، کیٹس اور بائرن کی انگریزی رومانی شاعری میں بھی خال خال ہی مل سکے۔

جوش۔ اے نسیمِ صبح کے جھونکو یہ تم نے کیا کیا میرے مست خواب کی زلفیں پریشاں ہو گئیں

اختر شیرانی۔ خوابِ نوشیں میں ہے وہ جانِ بہار نور و نکہت کی داستانِ خموش

اقبال رگل۔ مری نظر نے کسے محوِ خواب دیکھا تھا سفید جسم سمیٹے، سیاہ بال کھُلے

اقبال رگل کی رومان پرور فکر نے جس جمالیاتی، حسیاتی اور جذباتی شاعری کو جنم دیا ہے وہ ان کے سلیقہ مندانہ فن میں ڈھل کر اور حرف و صوت کے اُسلوب و آہنگ سے آراستہ ہو کر اُن کے لیے سرمایۂ افتخار بن گئی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

خوشبوئے خلدِ ناز تھا جھونکا نسیم کا یا تذکرہ تھا تیرے لبوں کی شمیم کا

نیاز و ناز کے مسکن گداز بانہوں میں حیا کی جنتیں آباد ہیں نگاہوں میں

اُس کے ملبوس کی کرنوں کو ستاروں کا سلام اس کی خاموش نگاہوں کو بہاروں کا سلام

اور اب رنگِ تغزل بھی دیکھئے جو نظم کی سرمدی لے سے ہم آغوش ہے:

میں تجھ سے بے پناہ محبت کے باوجود تجھ کو بنامِ دیدۂ تر بھول جاؤں گا

تا اس کو تیری آخری ٹھوکر نصیب ہو رستے میں رکھ کے کاسۂ سر بھول جاؤں گا

اب چاندنی راتوں کی ضرورت نہیں مجھکو اک غیرتِ مہتاب ہے مہماں مرے گھر میں

بکھر گئی ہے تصور کی رہگزاروں میں شمیمِ زلف کہیں، نکہتِ نقاب کہیں

مناسب ہوگا کہ میں پروفیسر اقبال رگل کی شاعری کے اپنے اس تجزیئے کے ساتھ شاعر کی خود اپنی شاعری کے بارے میں رائے بھی پیش کرتا چلوں:

''میری شاعری میرے جذبات اور احساسِ غم کی عکاس ہے۔ اس میں کرب کی لہریں ہیں۔ جدائی کا درد ہے۔ غربت کی ہُوک ہے۔ خاموش آہیں ہیں۔ اخلاص اور سپردگی ہے۔ مروت اور دوستی ہے۔ بتوں کی بے وفائی کے شکوے بھی ہیں''۔

(مطبوعہ: اپریل ۲۰۱۲ء)

التحقیق

زبیر احمد گلزاری

حرف آغاز

مبارک ہیں وہ لوگ جو اپنی نسبی شناخت کے امین ہیں اور اس ورثہ کو نسلاً بعد نسلاً حقائق کی مستند صحت کے ساتھ منتقل کرنے کا عزم صمیم رکھتے ہیں۔ بجا کہ بنی نوع انسان ایک نا قابل تقسیم واحدہ ہے لیکن بے حساب قرنوں اور بے شمار صدیوں کے سفر میں انسانی معاشرہ کے ارتقائی عمل نے خاندانوں، قبیلوں اور برادریوں کی شکل میں ذیلی شناخت کے در بھی وا کر دیئے ہیں۔ البتہ اقوام کے جدید سیاسی و عمرانی تصور نے قوم کے اجزائے ترکیبی میں جغرافیہ کو بھی شامل کر دیا ہے۔ ملت واحد کا اسلامی تصور جغرافیائی حدود و قیود سے ماورا ہے اور یہی تصور وطنیت بھی ہے۔ اس دین مبین کی رو سے صرف تقویٰ، اعزاز و تفاخر کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔

زیر نظر تصنیف کے مرتب و مدون اور تقریظ نگار جناب زبیر احمد گلزاری سے میرا تعارف ان کے برادر بزرگ جناب مقصود احمد گلزاری کا رہین منت ہے۔ جنہوں نے مجھے میجر رفیع الدین باور کی تالیف ''برن سے بنوں تک'' عنایت فرمائی چنانچہ برن کا لفظ ہی مجھے چونکا دینے کے لیے کافی تھا کہ یہ ہندوستان کے درالحکومت دہلی سے صرف پچاس یا ساٹھ میل کی مسافت پر واقع ہے اور موجودہ بلند شہر کا تاریخی نام ہے جو اضلاع میرٹھ اور علی گڑھ کے درمیان ایک ضلع ہے۔ جس میں سادات کی ایک مشہور بستی ''گلاؤٹھی'' میرا مولد و منشاء ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں دہلی سے میرٹھ بلند شہر اور علی گڑھ تک یہ تمام علاقہ میدان کارزار بنا رہا۔ اس سلسلہ میں انگریزوں کے خلاف قصبہ گلاؤٹھی میں ہونے والی زبردست مزاحمت پر تازہ تحقیق و شواہد پر مبنی میری ایک کتاب ۱۹۹۸ء میں شائع ہوئی۔ جس میں ضمناً قصبہ گلاؤٹھی اور اس کے مضافات میں آباد

''جھوجھ برادری'' کا بھی ذکر شامل تھا۔ جو زیر نظر کتاب التحقیق'' کے مدون زبیر احمد گلزاری کا موضوع بھی ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''سیٹھ گھٹاولی اور مالا گڑھ کے علاوہ متعدد دیہات اور مواضعات ایسے بھی تھے جو گلاوٹھی کے ڈاک خانے پولیس سٹیشن اور ریلوے اسٹیشن سے وابستہ تھے ان میں اکثر کی معاشرتی خصوصیت یہ تھی کہ یہاں ایک ہی برادری کے لوگ کثرت سے آباد تھے۔ جنہیں ''جھوجھ برادری'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ یہ لوگ نہایت محنتی، جفاکش ذہین اور ترقی پسند رجحانات کے حامل تھے۔ان حضرات میں سے بیشتر نے مختلف شعبوں میں نمایاں حیثیت حاصل کی جب کہ جھوجھ برادری تعلیم سے دلی وابستگی کے سبب تیزی سے ترقی کرتی رہی۔''

گذشتہ برسوں میں علمی وادبی تحقیق سے متعدد مقالات و کتب میری نظر سے گزرے ہیں اس میں شک نہیں کہ بامعنی اور نتیجہ خیز ریسرچ انتہائی کاوش اور جانکاہی کے بغیر ممکن نہیں لیکن میں حیران ہوں کہ گلزاری صاحب بہ اعتبار پیشہ انجینئر ہونے اور بنیادی مواد انتہائی ناکافی ہونے کے باوجود صرف مبہم سے چند اشارات وقرائن نیز سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی غیر مصداقہ روایات کی بنیاد پر وہ نتائج حاصل کر لینے میں کامیاب ہوگئے ہیں جو مربوط بھی ہیں معتبر بھی اور منطقی استدلال کے باعث ناقابل تردید بھی۔ فاضل محقق نے اپنے کٹھن کام کی ابتداء بارہ صفحات پر مشتمل اس رسالہ سے کی جو خاندان کے ایک بزرگ جناب مجیب اللہ خان صاحب نے ۱۹۲۰ء میں تحریر کیا۔ ۱۹۳۰ء میں ان کے انتقال کے بعد مرحوم کے فرزند علیم الدین خاں صاحب نے اس مخطوطہ کو ''التحقیق'' کا نام دیا اور شائع کرانے کا ارادہ کیا۔لیکن یہ رسالہ حتمی ریسرچ پر مبنی نہیں تھا رسالہ کے مصنف نے جن معلومات تک رسائی حاصل کی ان کا انکشاف درج ذیل جملوں سے ہوتا ہے۔

''ایک قوم جنجوعہ ہے جس سرزمین ہند پر پندرہ سولہ صدی تک جنجوعہ راجپوت کے ممتاز لقب سے موسوم رہی تھی۔۔۔۔آج وہی قوم جھوجھے کے غیر معروف لقب سے موسوم ہو کر کمشنری میرٹھ کی دوسری راجپوت اقوام کی نظروں میں ایک جملہ معترضہ بنی ہوئی ہے۔''

میں، زبیر احمد گلزاری صاحب کی اس کاوش کو خراج تحسین پیش کرنا چاہتا ہوں جس کے نتیجہ میں انہوں نے اپنے فاضل بزرگ جناب نجیب اللہ خاں کی تحقیقی بنیاد پر رکھی گئی ''خشت اول'' کو ایک عظیم الشان عمارت میں تبدیل کر دیا ہے اور اپنی اخلاص کیشی اور مثالی کاوش سے اپنی برادری کے تشخص اور شناخت پر جو مہر تصدیق ثبت کر دی ہے اس کا اعتراف برادری کے ہر فرد پر لازم ہے۔ انہوں نے اپنی مفصل اضافی تحقیق کو جن اطراف میں وسعت دی ہے اس کا ثبوت ان نکات سے فراہم ہوتا ہے۔ جو انہوں نے میرے نام اپنے ایک مکتوب مورخہ ۲۱ دسمبر ۲۰۱۲ میں بیان کئے ہیں۔

☆ یو۔ پی (انڈیا) میں اس قبیلہ کی تاریخ پر کوئی کام نہ ہونا۔

☆ جھوجھہ قبیلہ کا یو۔ پی (انڈیا) سے Out of Box جائے بغیر اس کی تاریخ کا پتہ نہ چلنا۔

☆ پاکستان میں اس قبیلہ کا مستند حوالہ یعنی بندوبست ۱۸۷۱ء میں دیپالپور ضلع اوکاڑہ میں اندراج ہونا کہ یہ ایک عربی النسل قبیلہ ہے۔

☆ دیپالپور میں شہدائے قبیلہ کے تقریباً ایک ہزار سال پرانے مزار کا موجود ہونا۔

☆ جھوجھہ قبیلہ کا ''شہید بہرائچ'' سالار مسعود غازیؒ کے ساتھ غزنی سے آمد کا پایہ ثبوت تک پہنچنا اور اس قبیلہ سے محقق کا افغانستان میں ذاتی رابطہ ہونے پر مزید شواہد حاصل کرنا۔

☆ ملا نجیب اللہ خان کے رسالہ ''التحقیق'' میں مذکورہ اس روایت کا پایہ ثبوت تک پہنچنا کہ اس قبیلہ کے بزرگ غزنی سے یہاں آئے اور افغانستان میں عربی النسل جاجی کہلائے وغیرہ

مجھے یقین ہے کہ اس تحقیق کے منظر عام پر آجانے کے بعد ''جھوجھہ برادری کے جنجوعہ راجپوت'' ہونے پر کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہے گا۔

بہترین دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ

(مطبوعہ ۲۰۱۳ء)

یہی ہے کہ سب سے پہلے اُس کا اسلوب ایسا ہو کہ قاری کا ذہن مصنف کے ذہن وفکر کا ہم سفر بنتا جائے اور اُس میں کوئی الجھن پیدا نہ ہو۔ سید منصور عاقل کی نثر میں یہ وصف بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔

سید منصور عاقل کی اس کتاب میں ۹۷ تصانیف پر نقد وتبصرہ شامل ہے۔ یہ کوئی کم اہم کام نہیں ۔ ان تبصروں کو جب مجموعی صورت میں زیر مطالعہ لایا جاتا ہے تو منصور عاقل صاحب کی تحریر اور ان کی ذوقِ علم و ادب کی کئی جہات اُجاگر ہوتی ہیں۔ ان کتابوں میں تقریباً تمام علمی، ادبی اور تاریخی موضوعات شامل ہیں۔ اور منصور عاقل نے ہر موضوع کے ساتھ بھرپور انصاف کیا ہے چوں کہ خود اُن کی زندگی اپنے عہد کے ممتاز ادیبوں، ادبی تحریکوں اور ادبی نظریوں کے ماحول میں بسر ہوئی ہے اس لیے بعض تبصروں میں ذاتی حوالوں سے بھی دلچسپ حقائق بیان ہوئے ہیں۔



مصنف کی دیگر مطبوعہ کتب و تحقیقی مقالات

۱۔ 'خامہ خونچکاں اپنا' (راولپنڈی ڈویژن کے شعراء کا رزمیہ کلام) ۱۹۶۶ء

۲۔ 'مبارک نامہ' (راولپنڈی ڈویژن میں فارسی گو شعراء کا انتخاب کلام) ۱۹۷۲ء

۳۔ 'حرف بہ حرف' (تنقیدی و تحقیقی مضامین) ۱۹۸۱ء

۴۔ 'برگ سبز' (ادبی تحقیق و سوانح) ۱۹۹۲ء

۵۔ 'گہوارۂ سخن' (شعری مجموعہ) ۱۹۹۳ء

۶۔ 'حرفِ محرمانہ' (شخصیت فکر و فن) ۱۹۹۴ء

۷۔ 'گلاؤٹھی' (دوآبۂ گنگ و جمن میں واقع بستی کے اہلیان کا ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں مزاحمتی کردار۔ تحقیق) ۱۹۹۸ء

۸۔ 'دبستانِ قابل' (سوانح۔ انتخابِ کلام۔ تنقید) ۲۰۰۰ء

۹۔ 'حرفِ معتبر' (اکیسویں صدی میں ادبی اداریہ نویسی کی نئی جہت) ۲۰۱۳ء

مقالات (اردو)

۱۰۔ شہاب دہلوی۔ شخصیت اور فن (تحقیق و تنقید)

۱۱۔ 'قومی تعمیرِ نو میں اخبارات کا کردار'

۱۲۔ 'قومیت اور بین الاقوامیت'

۱۳۔ 'پاکستان میں ثقافتی یک جہتی کے مسائل'

۱۴۔ 'برصغیر میں مغل عہد کے دوران ثقافتی ترقی'

مقالات (انگریزی)

۱۴۔ Role of Public Relations in a Democratic State

۱۵۔ Archival Management in Pakistan

۱۶۔ Literature and Journalism- A comparative Study

۱۷۔ Constitutional Evolution in Pakistan

۱۸۔ Democracy and Electroral System in Pakistan

۱۹۔ Sir Syed as Leader of Yesterday and Today

۲۰۔ Allama Shibli Nomani